انتخابِ مخزن

ماہوار رسالہ 'مخزن' لاہور مرتبہ شیخ عبدالقادر بی۔ اے
کی پہلی ۹ جلدوں (۱۹۰۱ء–۱۹۰۵ء) کا انتخاب۔

مخزن ۱۹۰۱ء میں جاری ہوا اور چھ چھ ماہ کے چھ چھ
شماروں کی ایک ایک جلد ہوتی تھی۔ اس طرح سال میں دو جلدیں
بن جاتی تھیں۔ پہلی ۹ جلدیں ۱۹۰۱ء سے شروع ہو کر
۱۹۰۵ء تک کے شماروں پر مشتمل ہیں۔
یہ انتخاب ادارے کی جانب سے مرتب ہوا اور پہلی مرتبہ
مخزن پریس ہی میں ۱۹۰۸ء میں باہتمام شیخ محمد اکرام
چھپا تھا۔

اس مجموعہ میں علامہ اقبال کا کلام جو مخزن ۱۹۰۱ء
تا ۱۹۰۵ء میں شامل ہے۔ ۱۹۰۵ء میں علامہ اقبال
لندن چلے گئے تھے۔ اس طرح یہ ان کی شاعری کے دورِ اول کا
کلام ہے۔ بعد میں یہ کلام ان کے مجموعوں میں ترمیم و تغیر کے
ساتھ شامل کیا گیا تھا۔ چونکہ یہ مجموعہ ادارہ مخزن کی جانب
سے شائع کیا گیا تھا اس لئے یہ کلام مخزن کے شماروں کے عین مطابق ہے۔
یہ مجموعہ اگرچہ بعد میں شاملِ نصاب ہو کر چھپتا رہا لیکن وہ اغلاط
سے پُر ہے۔ اس ایڈیشن [illegible]

انتخاب مخزن
یعنی
رسالہ مخزن کی پہلی نو جلدوں میں سے
چیدہ چیدہ مضامین کا انتخاب
باہتمام شیخ محمد اکرام مخزن پریس لاہور میں چھپکر شائع ہوا
۱۹۰۸ء
1908

فہرستِ مضامین

نثر	صفحہ	
نظم		

بناوٹ اور سادگی

بناوٹ بھی اِک فن ہے جو جانتا ہو
تری سادگی کچھ ہمیں جانتے ہیں

مندرجہ عنوان شعر کی خوبی یوں تو ظاہر ہے - مگر لطافت خاص اس میں یہ ہے کہ اس کا اطلاق محدود نہیں - سادگی سے مراد لیجئے سچ - اور بناوٹ کو فرض کیجئے دروغ - سچ سچ ہے خواہ اُسے لاکھ پردوں میں چھپائیں جس رنگ میں جلوہ گر ہو پہچاننے والے پہچان جائینگے - ایسے ظاہر بین زمانہ میں جیسا کہ ہمیں نصیب ہوا ہے - یہ اصول خطرناک تو ضرور ہے - مگر پھر سچا اصول ہے - گو ایک دفعہ تو سچی بات کہتے ہی انگلیاں اُٹھ جاتی ہیں اور آجکل دروغ کو فروغ ہے - مگر تابہ کے . گلٹ کے گہنے چند دن تو چاندی سونے کے زیوروں کو مات کر دیتے ہیں - مگر جب عارضی چمک اُڑی - اور نیچے پیتل تانبا نظر آیا - پھر اُن سے ذلیل اور بدنما چیز قیاس میں نہیں آسکتی - اور اس بدنمائی کے آثار ابھی ظاہر ہونے کو ہوتے ہیں - کہ وہی حسین جنہوں نے بڑے چاؤ سے ایسے

زیوروں کو باعث زینت ٹھہرایا تھا انہیں نہ صرف نظروں سے گرا دیتے ہیں بلکہ اُتار کے پھینک دیتے ہیں۔ اور آخر سونا سونا ہی ہے جتنا پُرانا ہوتا جائے جتنا اُسے گھِسو۔ جتنا اُسے پتھر پر رگڑو۔ اپنے جوہر اصلی دکھاتا ہے اور کبھی کسی نازکبدن کے کانوں سے اترے بھی تو صرّاف کی صندوقچی میں قدر و منزلت سے بند کر کے رکھا جاتا ہے۔ گھر میں عزّت پاتا ہے تو بازار میں بھی اُس کی توقیر ہے۔ اور بازار سے گراں ملتا ہے تو گھروں میں بھی منزلت ہوتی ہے۔ جو نسبت کھوٹے کو کھرے سے ہے وہی تناسب بناوٹ اور سادگی میں ہے۔ تسپر بھی ایک عالم بناوٹ پر مٹا ہوا نظر آتا ہے کیونکہ بہت تھوڑی آنکھیں ہیں جنکو وہ بینائی عطا ہوئی ہے جو بناوٹ کے پردوں کو ہٹا کر ہر چیز کے حسن و قبح کو اُس کی عُریانی میں دیکھ سکے +

جو لوگ سادگی کے نظاروں سے آشنا ہیں۔ وہ بناوٹ کی طرف آنکھ اُٹھاکر دیکھنا بھی گوارا نہیں کرتے۔ مگر بناوٹ کے شیدائی بھی کیا کریں اِس دنیا میں رہکر دنیا سے الگ رہنا یہ بھی تو ہر کسی کا کام نہیں اور وہ اپنے اپنے طور پر ایک اولیٰ نمونہ اُس بڑی مثال کا دکھا رہے ہیں جو دنیا نے اُن کے لیئے قایم کی ہے پرانے شعرا اور مصنفین کی تحقیق متفق اللفظ ہو کر گواہی دے رہی ہے کہ دنیا جس کے حُسن زاہد فریب کے لاکھوں بلکہ کروڑوں بندگانِ خدا مبتلا ہیں۔ اصل میں ایک زالِ پیر ہے۔ جو صرف خط و خال کی آرائش سے لوگوں کے دِلوں کو لبھا کر دامِ تزویر میں لا رہی ہے۔ اور اگر اس کے چہرے سے وہ پوڈر اور سرخی جو اُس کی زینت ہے دھو ڈالی جائے اور اُس کے مصنوعی کالے اور لمبے بال اکھاڑ پھینکے جائیں۔ اور اُس کے بناوٹی سفید دانتوں کی لڑی جو کسی متنفس کے روبرو نہیں اُتارتی۔ نکال باہر کی جاوے۔

اور اس کی اصلی شکل کسی کو دکھا دیجا دے تو پھر اس کے شیدائی اس سے قطع تعلق کر لینا تو کیا کسی حسین کے حسن پر اعتبار نہ کریں۔ اور سب سے کنارہ کش ہو کر اپنے گوشۂ عافیت میں بیٹھ جائیں۔ پس جب یہ دنیا بذاتِ خود ایک بڑا دامِ تزویر ہے جو اس عالم پر پھیلا ہوا ہے۔ تو وہ لوگ جو اس بڑے دام کے نیچے چھوٹی چھوٹی جالیاں لگاتے ہیں۔ معذور ہیں اور جو بیچارے نادانستہ ان چھوٹے پھندوں میں پھنستے ہیں وہ معذور تر۔ اس میں کوئی کلام نہیں کہ بناوٹ کا پھندا زبردست پھندا ہے جسے دیکھو اس کا شکار ہے۔ عشاق ہیں تو زلفوں کے پیچ وخم کے پھیر میں۔ شعرا ہیں تو کلام میں تلازم کی تلاش میں۔ واعظ ہیں۔ تو نازو کرشمہ بر سرِ منبر کے انداز سوچ رہے ہیں۔ مضمون نگار ہیں تو انہیں قافیہ بندی کی دھن لگی ہوئی ہے کوئی نہیں سوچتا کہ جس کی زلف پُر پیچ کے دیوانے ہیں وہ اس قابل بھی ہے کہ اُسے چاہیں۔ کوئی نہیں دیکھتا کہ جس کلام کو تلازم کے نمک مرچ سے لطیف بنا رہے ہیں وہ کسی ذاتی صفت سے بھی متصف ہے یا نہیں۔ کوئی نہیں غور کرتا۔ کہ وعظ میں نکات بھی دلپسند ہیں یا محض انداز ہی کی فکر ہے۔ اور کوئی نہیں پرواہ کرتا کہ قافیہ بندی کی دھن میں کہیں اصل مضمون ہی خراب نہ ہو جائے +

اُردو علم ادب کو آج تک اس بناوٹ کے شوق نے نہایت نقصان پہنچایا ہے اس میں شک نہیں کہ اُردو زبان ابھی ایک نوعمر زبان ہے۔ اور مقدار کے اعتبار سے اس کے ادب کا ذخیرہ کچھ تھوڑا نہیں۔ سینکڑوں دیوان اشعار آبدار سے پُر ہیں۔ مثنویاں ہیں۔ واسوختین ہیں۔ مرثیے ہیں۔ تہنیتیں ہیں۔ ہجو ہے۔ قصائد مدح ذم سے پر ہیں تصنیفیں ہیں۔ افسانے ہیں۔ رقعات ہیں۔ اور حال میں کتب تاریخ و سیر و فلسفہ اُردو میں موجود ہو گئی ہیں۔ اخبارات ہیں۔ رسالے ہیں۔ اردو لکھنے اور بولنے

والوں میں لکچرار ہیں۔ واعظ ہیں۔ لطیفہ گو ہیں۔ بذلہ سنج ہیں۔ رلانے والے ہیں۔ ہنسانے والے ہیں۔ غرض جو آثار کسی لٹریچر کی ترقی کے ہوتے ہیں سب کے سب موجود ہیں۔ مگر صرف ذخیرہ کی کمیت پر نظر ڈالنے اور کیفیت کا لحاظ نہ کرنے سے صحیح اندازہ نہیں ہو سکتا۔ کہ ذخیرہ کس پایہ کا ہے۔ اور کیفیت کا جو حال ہے وہ ناگفتہ بہ ہے۔ پہلے نظم کو ہی دیکھئے۔ کہ از سر تا پا بناوٹ ہے۔ اکثر حصّوں کی نسبت تو خود مصنّفین اظہار کرتے ہیں کہ ان میں فلاں صنعت ملحوظ رکھی گئی ہے۔ نہ صرف ہماری نظم کی ظاہری صورت میں بناوٹ میں کام لیا گیا ہے۔ بلکہ خیالات بھی اکثر تصنّع سے پُر ہیں۔ جن پیچیدہ جذبات دلی کے ظاہر کرنے کے لئے یہ بلکہ بعض طبیعتوں میں قدرت نے ودیعت کیا تھا۔ انکو ہمارے شعراء اکثر دل میں ہی چھپائے چلے گئے ہیں۔ اور لیلیٰ کی صورت پر طعنے دینے اور مجنوں کے ساتھ وحشت میں مقابلہ کرنے۔ فرہاد کو کم ہمّت ٹھہرانے۔ اور شیریں کی بیوفائی کی تشہیر میں اپنی ہمّتیں صرف کر گئے ہیں۔ اس سے بڑھکر تصنّع کا اور کیا ثبوت ہو سکتا ہے کہ اکثر شعراء کو اس عظیم الشان اور وسیع ملک ہندوستان میں کوئی دو سچے عاشق و معشوق اہل ملک میں سے ایسے تلاش کرنے کا خیال نہیں ہُوا۔ جنکی باہمی محبت کے قصّوں سے وہ اپنی نظم میں کام لیں اور اس کثیر الوقوع معاملے میں بھی کتب فارسی کے دست نگر رہے ہیں۔ جو جو شوق اکثر شعراء نے نظم میں ظاہر کئے ہیں۔ اُن میں بہت سے اُن کے اصلی شوق نہیں۔ صرف تقلیدی طور پر اُنکے مضامین باندھتے آتے ہیں۔ مثال کے طور پر دیکھئے کہ مہندی کو اس زمانہ میں وہ مقبولیت نہیں رہی جو آج سے چالیس پچاس سال پہلے تھی۔ اُسوقت حُسن کی آرائش کے لوازم میں حنا بہت ضروری تھی۔ اب شادی بیاہ۔ دن وہار میں تو رسماً استعمال ہوتی ہے مگر نئے فیشن میں پسندیدہ چیز نہیں رہی۔ نہ حسین اِسے باعث زینت سمجھتے ہیں اور نہ دیکھنے والے اس کے رنگ کو کچھ بہت خوش ہو کر دیکھتے ہیں۔ اس پر یہ حال ہے۔ کہ آجکل جو اشعار

کے مجموعے چھپتے ہیں۔ جن میں نوجوان شعراپڑانے رنگ میں طبع آزمائیاں کرتے ہیں۔ اُنکو اٹھا کر دیکھئے۔ شاذ کوئی حنا کی تعریفوں سے خالی ہو۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ ایسی مصنوعی شاعری سے کیا حاصل ہے۔ اگر یہی طبیعتیں جو تقلید کے بندوں میں جکڑی رہیں۔ اپنے بل پر اُڑتیں۔ تو دنیا انکی بلند پروازیاں دیکھکر حیران ہوتی۔ مگر ابتدا میں ہی کچھ ایسی بنیاد پڑی کہ بناوٹ کے سلسلہ سے رہائی نہیں ہوئی۔ نثر میں بھی آج سے بیس پچیس برس پہلے تک یہی رنگ ہے۔ عبارتیں مقفٰے۔ الفاظ زیادہ خیالات کم خطوط میں القاب لنبے اور مطالب مختصر۔ ضرورت سے زیادہ مبالغہ ضرورت سے زیادہ لجاجت۔ رقعات کے رنگ کو تو پہلے مرزا اسداللہ خان غالب نے پلٹا۔ اور اردو نثر کی سادگی میں وہ پرکاری دکھائی کہ آج تک کسی سے اُسکا جواب نہیں ہوسکا۔ اگر خدا کو یہ منظور ہوتا کہ مرزا غالب بجائے انیسویں صدی کی ابتدا کے اس کے وسط میں پیدا ہوتے اور اسوقت زندہ ہوتے تو نئے زمانہ کی ہوا سے اُن کی طبیعت وہ جلوہ دکھاتی۔ کہ اردو نظم مطالب اور معانی کی بلندی کے اعتبار سے ہر زبان کی عمدہ نظم سے مقابلہ کا دعوےٰ کرسکتی۔ اور نثر میں وہ جادو ہوتا جسے طبیعتیں آج کل ڈھونڈھتی ہیں اور نہیں پاتیں۔ تاہم جس زمانہ میں مرزا غالب ہوئے اس کے اعتبار سے جو کچھ وہ نثر کی تجدید میں کر گئے نہائت حیرت خیز ہے اس کے بعد سر سید احمد خان مرحوم نے اردو نثر میں انگلستان کے سلیس سے سلیس لکھنے والوں کا نقشہ دکھایا اور اس نے سب سے پہلے یہ دکھایا۔ کہ کلام بغیر رنگینی کی کوشش کے مؤثر اور پُرزور ہوسکتا ہے۔ اور زبان اردو باوجود اپنی نوعمری کے ایسے ایسے دقیق مطالب کے ادا کرنے کی متحمل ہو جو کئی اور زبانیں باوجود پیرانہ سالی کی مشق کے نہیں ادا کرسکتیں۔ سر سید احمد مرحوم کا یہ شوق رفتہ رفتہ انکے احباب تک پہنچا اور اب بہت سے اصحاب سادہ مگر پرمطلب مضامین لکھنے والے ملک میں پیدا

مہیا کرنے میں مفید ہو سکتے ہیں ؎

دیر است کہ آوازۂ منصور کہن شد — تو بار دگر تازہ کنی دار و رسن را

اسوقت جو ماہوار رسالے ملک میں شایع ہو رہے ہیں۔ اُن میں ہم دلگداز، معارف افسر۔ اور اودھ ریویو کو نہایت غنیمت سمجھتے ہیں۔ اور اُن کے مفید کام میں اُنکے ساتھ شریک ہو کر اُن کا ہاتھ بٹانا چاہتے ہیں۔ کیونکہ ہندوستان جیسے بڑے ملک کے لئے چند ماہوار رسالے ہرگز کافی نہیں اُردو اخبارات کی تعداد کے ساتھ رسالوں کی تعداد کو کوئی نسبت ہی نہیں اور نہایت خوشی کا مقام ہو اگر وہ صرف جو بعض غیر مفید اخبارات پر جو اچھے اہتمام سے شایع نہیں ہوتے۔ ہو رہا ہے۔ عمدہ رسالوں کی طرف منتقل کر دیا جائے۔ ہم نے یہ کوشش کی ہے۔ کہ موجودہ علمی رسالوں کی تعداد میں ایک رسالہ زیادہ کرتے ہوئے اپنا رنگ جہانتک ممکن ہو سب سے جدا رکھیں +

حُسنِ قدرت۔ حُسن ہر جگہ موجود ہے۔ ہاں چشم بینا چاہئے۔ بہار کے گلہائے رنگا رنگ میں اُس کا جلوہ ہے۔ درختوں کی شاخوں اور سبزہائے نو دمیدہ میں اُسکی نیرنگیاں ہیں۔ سمندر کی تھاہ میں اور زمین کے مرکز میں یہ جاگزیں ہیں اور وہاں سے آبدار موتی اور لعل و جواہر کا رُوپ لیکر نکلتا ہے۔ ان چھوٹی چھوٹی چیزوں پر کیا حصر ہے خود بحر و بر۔ کوہ و راغ۔ ابر و باد۔ مہ و خورشید نورِ حُسن سے منور ہیں۔ ستاروں کو دیکھئے سُورج کو نکلتے ہوئے دیکھئے۔ ڈوبتے ہوئے دیکھئے۔ ایک سے ایک دلکش نظارہ ہے سارا جہان حُسن کا سمندر ہے۔ اور جو اس کے وجود سے آشنا ہیں وہ ہر حال میں اور ہر آن اپنے تئیں حُسن سے محصور سمجھتے ہیں۔ کسی نے کیا خوب کہا ہے۔ ؎

دل اگر دانا بود در ہر سخن اسرار ہست
چشم گر بینا بود یوسف بہر بازار ہست

طوفانِ نوحؑ

بعض الفاظ میں کچھ ایسا چلتا جادو ہوتا ہے کہ زبان سے نکلتے ہی دلوں کو مسخر کر لیتا ہے اور نظروں کے سامنے زمانہائے گذشتہ کا مرقع لا حاضر کرتا ہے جو الفاظ زیب عنوان ہیں ایک تاریخی واقعہ کی یاد دلا دلا کر بدن پر رونگٹے کھڑے کر رہے ہیں آہ۔ تاریخی واقعہ بھی کیسا عبرتناک اور جگر خراش جس کے بالین پر حسرت و یاس کی گھنگھور گھٹائیں تلی کھڑی ہیں اور جن کے سایہ میں زمانہ ماضی کھڑا ہُوا ڈاڑھیں مار مار کر فاتحہ خوانی کر رہا ہے آؤ! قوت متخیلہ کی مقراض سے صدیوں کے گریبان کو چاک کریں اور دیکھیں کہ اس واقعہ کی ابتدا کیونکر ہوئی اور انجام کیا ہوا

ایک جلیل القدر روحانی ڈاکٹر اپنی قوم کو امراض مہلکہ اور مزمنہ میں گرفتار پاتا ہے اور انکی ردی حالت دیکھ دیکھ کر کُڑھ رہا ہے وخفیہ امراض کے لئے نسخوں پر نسخے تجویز کر رہا ہے مگر قوم آہ! بدنصیب قوم بادہ فنا میں سرشار جام بقا پینے سے انکار کر رہی ہے۔ تازیانہ قہر خدا کا خوف دلاتا ہے اور نہیں مانتی۔ عذاب آخرت کا فوٹو کھینچ کھینچ کر دکھا رہا ہے اور مطلق پرواہ نہیں کرتی۔ خوشامد کرتا ہے اور قوم ہنس ہنس کر ٹال دیتی ہے لعنت۔ ملامت سے کام لیتا ہے اور قوم کان میں تیل ڈالے بیٹھی ہے۔ خَتَمَ اللّٰہُ عَلٰی قُلُوْبِھِمْ وَعَلٰی سَمْعِھِمْ وَعَلٰی اَبْصَارِھِمْ غِشَاوَۃٌ وَّلَھُمْ عَذَابٌ عَظِیْمٌ آخر علاج کرتا کرتا مایوس ہو جاتا ہے اور درگاہ قاضی الحاجات میں اس طرح مناجات کرتا ہے اور بار الہا ہماری قوم کی حالت سقیم ہے اے معبود حقیقی گواہ رہو کہ میں نے تبلیغ احکام میں کوئی دقیقہ اُٹھا نہیں رکھا۔ اب اس قوم کی شقاوت اور ضلالت دیکھی نہیں

جاتی اے قہار۔ اپنا قہر اس قوم پر نازل کر تاکہ یہ بھی اپنے کئے کا مزا چکھے ٭

دعا قبول ہوئی پانی چڑھتا چلا آتا ہے۔ دریا پھیل پھیل کر جھیلوں سے جا ملے جھیلیں اُبل اُبل کر سمندر سے ہمکنار ہو گئیں۔ سمندر نے بھی ہاتھ پاؤں نکالنے شروع کر دیئے۔ سر سبز میدانوں کو تاخت تاراج کرتا اس قوم سیاہ کار کا تعاقب کئے چلا جا رہا ہے ان بدبختوں نے زمین پہ کوئی جائے امن نہ پائی تو پہاڑوں کی راہ اختیار کی جہاں درندے ان سے پہلے ہی سہمے ہوئے کھڑے ہیں اور کچھ ایسے حواس باختہ ہیں کہ اُن کی طرف نظر اُٹھا کر نہیں دیکھتے۔ پانی ہے کہ برابر اُٹھا چلا آرہا ہے انسان حیوان سب اپنی اپنی جانوں کو بچانے کے لئے اوپر چڑھتے چلے جا رہے ہیں اب موقعہ بہت نازک آپہنچا اجل سروں پر منڈلا رہی ہے چپہ چپہ جگہ پر انسانوں اور حیوانوں میں کشت و خون ہو رہا ہے اب تمام مکانات درخت ٹیلے اور پہاڑیاں غرق ہو چکے۔ صرف بلند پہاڑوں کی خال خال چوٹیاں سطح آب سے کسی قدر بلند نظر آتی ہیں بجلی چمک رہی ہے بادل برابر گرج رہا ہے مینہ ہے کہ موسلا دھار برسے چلا جاتا ہے سمندر اچھل اچھل کر نانماں خرابوں کا شکار کئے جا رہا ہے لو غضب ہو گیا اب تو اُن سر بفلک چوٹیوں پر بھی پانی پھر گیا کہاں ہیں ایلپس کی بلند چوٹیاں کہاں ہیں کوہ انڈیز اور کوہ ہمالیہ کے عالیشان پہاڑ جو نہایت نخوت سے اپنے سروں کو بلند کئے کھڑے تھے ٭

اب پانی کا چڑھنا بند ہو گیا سمندر احکام ایزدی کی تعمیل کر چکا جس طرف نظر اُٹھا کر دیکھو ایک بحر ناپیدا کنار ہے کہ سائیں سائیں کر رہا ہے۔ موالید ثلاثہ میں سے کوئی اس عظیم الشان بربادی پر آنسو بہانے والا نہ رہا سمندر کی لہریں تمام دنیا کا چکر لگا رہی ہیں اور کوئی سدِ راہ نہیں پاتیں ان خوفناک سینوں کو دیکھ دیکھ کر ہمارے بدن کے رونگٹے کھڑے ہوئے جاتے ہیں۔

چھوٹے چھوٹے بچوں اور ننھے ننھے شیر خواروں کی لاشیں پانی پر بہتی چلی جا رہی ہیں جنکی بھولی بھولی صورتیں دیکھ دیکھ کر کلیجہ منہ کو آجاتا ہے آہ! یہ ننھا سا بچہ جس پر معصومیت کھڑی رو رہی ہے کن کن نازوں کا پلا ہوا ہوگا ان جھنڈوالے بالوں کو جو سطح سمند پر پریشان ہو رہے ہیں کس پیار سے اس کی ماں سلجھاتی ہوگی۔ یہ حسرت و یاس کی تصویر منہ میں انگوٹھا لئے خویش و اقارب سے دور دنیا اور مافیہا سے بیخبر جان شیریں موت کے حوالے کئے موجوں کے گہوارے میں جھولتا چلا جا رہا ہے اے خدائے بزرگ و برتر کہاں ہے تیرا رحم۔ کیا تیرا قہر تیرے رحم پر غالب ہے نہیں نہیں ہرگز نہیں پھر تیرے رحم کو ہم کہاں تلاش کریں؟

وہ دیکھو وہ کشتی جس کا ناخدا نظر نہیں آتا جس کو ملائکہ مقربین کھے رہے ہیں اور جس پر رحمت ایزدی اپنا سایہ ڈالے ہوئے ہے موجوں کی تاریکی چیرتی پھاڑتی کس شان و شوکت کے ساتھ اس بحر مواج پر سوار موجوں کے گھونگھٹ میں اڑی چلی آرہی ہے اس سے زیادہ قیمتی مال کسی جہاز میں آجتک نہیں لادا گیا اور نہ آئندہ لادا جائیگا۔ دین حق کے رہنما آئندہ نسلوں کے باوا آدم اس پر سوار ہیں اس خوفناک وحشت کے سین کو طے کرتی کشتی فراٹے بھرتی چلی جا رہی ہے کہ یکایک پیندے سے رگڑ کی آواز پیدا ہوئی اس آواز کو سنتے ہی کشتی کا دروازہ کھلتا ہے اور اس میں سے یکے بعد دیگرے اس کشتی کے راکب باہر آ کر سر عجز خاک نیاز پر رکھ کر اس ذات پاک کا شکر بجا لاتے ہیں جس نے اپنی رحمت کاملہ سے ان کو اس طوفان عظیم سے نجات دی +

سید شریف حسین

پابندیٔ وقت اور وضعداری

ایک صاحب جو پرانی وضعداری کے شیدائی تھے۔ یہ سمجھ کر کہ اِسے انگریزی تعلیم کا زہر کم چڑھا ہے مجھ کو الگ لیجا کر نہایت خلوص نیت سے نصیحت کرنے لگے۔ گو انہوں نے اثنائے تقریر میں مجھے بولنے نہیں دیا مگر معلوم ہوتا تھا کہ ہر فقرہ میں انہوں نے اپنی ساری عمر کا تجربہ کوٹ کوٹ کر بھر دیا ہے اور مجھ سے اپنے معاملہ فہمی کی داد چاہتے ہیں۔ پہلے دو چار کلمات شفقت آمیز اس خاکسار کی نسبت خاص تھے۔ اور باقی عام نصیحت تھی۔ جو میں نقل کرتا ہوں :-

بزرگ"...... خدا نہ کرے کہ ہماری حالت بدلے۔ ورنہ دیسی بھائی تو یکے بعد دیگرے انگریزوں کی ہی رسموں کے شیدائی بنتے جاتے ہیں۔ اور تو اور اب جہاں دیکھو پابندی وقت کا گیت گا یا جاتا ہے۔ اسمیں شک نہیں کہ وقت عزیز چیز ہے۔ مگر موقعہ بے موقعہ وقت ہی وقت پکارنا بالکل خلاف وضعداری ہے یہ تو محض بزرگوں کی دعا ہے کہ نرالی رسمیں رواج نہیں پاتیں۔ ورنہ میں دعوے سے کہہ سکتا ہوں کہ اس بے انتہا پابندی وقت سے ہمارے ملک کا ستیاناس ہو جاتا اچھا انگریز جو دیسیوں کی قدر نہیں کرتے اس کی وجہ بھی معلوم ہے؟ اس کا سبب یہ ہے کہ اوّل ہر کس و ناکس ولائت چلا جاتا ہے۔ دوسرے جو وہاں جاتے ہیں سب وہاں کی رسمیں اختیار کر لیتے ہیں۔ انگریز اس بات کو ہرگز پسند نہیں کرتے۔ اگر اُن کو یہ منظور ہوتا تو وہ یہاں آکر ہماری رسمیں کیوں نہ اختیار کر لیتے؟ بھلا کسی لاٹ صاحب کو بھی سُنا ہے کہ اُس نے شعر کہے ہوں یا کبوتر بازی کی ہو یا اور

کوئی امیرانہ سامان رکھا ہو؟ ہرگز نہیں - ان کے ہاں دربار کا دستور ہی نہیں اور
گو یہ شاہی شان وشوکت پر جان و دل سے فدا ہیں - مگر چونکہ ہمارے بزرگوں
کی وقعت ان کے دل میں بہت موجود ہے اسواسطے یہ انکی چیزوں کو نہیں
چھیڑتے - اگر ہمارے ہاں سے بھی صرف رئیس لوگ ولائت جائیں اور وہاں
نوابی ٹھاٹھ سے رہیں اور بادشاہ سلامت کی خدمت میں کبھی نہ کبھی سلام
کو حاضر ہوں تو قسم ہے کہ کوئی نہ کوئی صوبہ دے ہی دے مگر جو لوگ انگلستان
جاتے ہیں سب وہاں کی تعلیم کو وہاں کا بادشاہ تصور کر کے اس سے ربط
بڑھاتے ہیں اور پابندی وقت اور محنت وغیرہ کے خیالات سے آبا کی
وضعداری پر دھبا لگاتے ہیں - اب بھی ہندوستان میں سینکڑوں
مثالیں ایسی ہر روز دیکھنے میں آتی ہیں جن سے پابندی وقت کے
نقصان صریح ظاہر ہوتے ہیں - میری رائے میں اب بھی کچھ نہیں گیا
اگر ہم لوگ سنبھل جائیں + چند روز ہوئے کہ میں ایک دعوت میں گیا
میں مقررہ وقت سے کوئی آدھ گھنٹہ بعد پہنچا - مگر یہ بھی اس خیال سے
کہ صاحب خانہ میرے خاص شفیق تھے کچھ انتظام میں مدد دوں - میں نے
جاکر دیکھا کہ صاحب خانہ تو الگ کھانا پکوا رہے ہیں - معزز مہمان تو ابھی
آئے نہ تھے - البتہ چند معمولی اہل محلہ بیٹھے تھے - ایک طرف کو ایک سفید
پوش علیحدہ بیٹھے نظر آئے - پوچھا کون صاحب ہیں - میرے دوست نے
مسکرا کر جواب دیا ایک نئے زمانے کے پڑھے ہوئے بی - اے پاس
کردہ ہیں - اور بیچارے پابندی وقت کے گرفتار پورے آدھ گھنٹہ سے
آئے ہوئے ہیں - مجھ کو یہ دیکھ کر بہت ہی رنج ہوا کہ گو یہ نوجوان نہایت اعلیٰ
خاندان سے تھے اور تعظیم کے مستحق تھے - مگر وہاں اس کس مپرسی میں

صرف اپنے ہاں کی مجالس کے دستور نہ جاننے کے سبب بیٹھے ہوئے تھے۔ بلکہ پرلی طرف تو یہ گفتگو ہو رہی تھی کہ کیوں میاں یہ تعلیم پاکر بھو کے بھی ہوگئے ہیں کہ ایسی سویرے سویرے گھر سے نکل پڑے۔ اس دعوت میں صاحبِ خانہ نہایت تمیز والا آدمی تھا اور اُس نے ایک ایک کا انتظار کیا۔ اتنے عرصہ میں محفل کا وہ رنگ جما کہ سبحان اللہ۔ آخر میں خانصاحب اور میرزا صاحب جو کہ معززین شہر میں تھے تشریف لائے۔ سب نے اُٹھ کر تعظیم کی۔ مزاج پرسی کی۔ اور جگہ جو رُک رہی تھی وہ خالی کی گئی۔ وہ حضرت بی۔ اے بھی اگر برابر والوں کے ساتھ آتے تو ہرگز اُن کے اعزاز میں فرق نہ آتا +

مگر اسی وقت بائیں طرف سے ایسی آواز کان میں آئی کہ معاً میرا دلِ غصہ اور افسوس سے بھر گیا۔ مڑ کر دیکھا تو شاہ صاحب جنکی اور خانصاحب کی آپس میں کچھ چشمک تھی، آئے تھے اور اُن کو چھوٹتے ہی کسی نے یہ کہا "واہ حضرت آپ نے وقت کا کچھ خیال تو رکھا ہوتا۔ معلوم نہیں شاہ صاحب نے کیا جواب دیا مگر کم از کم میری طبیعت اُس وقت سے بہت ہی پژمردہ رہی۔ اوّل تو اگلے وقتوں میں اتنا پاس ادب تھا کہ بفرض محال کوئی دیر میں بھی آئے اور پھر اُس کا ذکر کرنا بھی منظور ہو۔ تو گفتگو اس طرح ہوتی تھی "آئیے آئیے مزاج شریف۔ حضرت آپکا تو بہت ہی انتظار تھا۔ خیر باشد۔ بڑے شاہ صاحب نہیں آئے؟" "جی ہاں شاہ صاحب شاید آجائیں۔ جو کچھ اُنہوں نے دیکھا ہے آجکل کی صحبتوں میں وہ رنگ کہاں۔" بات طے ہوئی۔ نہ یہ کہ یا وقت پر آؤ یا دقت پر اطلاع بھیجو +

دوسری بات یہ ہے کہ شاہ صاحب جیسے آدمی کو کہا کہ آپ دیر سے آئے ازالہ حیثیت عرفی سے کم نہیں۔ وہ کسی کے نوکر نہیں۔ وہ کسی کے

نوکر نہیں - اُنکی بلا وقت پر تشریف لائے امیر آدمی ٹھہرے - دس بیس مصاحب ساتھ چلتے ہیں - راہ میں علیک سلیک ملنا جلنا دیر ہوئی تو ہونے دو دوست کے گھر جانا ہے - دفتر تو نہیں جانا - ایک انگریزی خوان ہیں کہ سرکاری ہرکارے کی طرح بگٹٹ جارہے ہیں - ماشاءاللہ کیا تمیز ہے!

بعض جگہ صاحب خانہ کو پابندیٔ وقت کا جنون ہوتا ہے - نتیجہ یہ کہ اگر عمائدِ شہر کا انتظار کریں تو کھانا ٹھنڈا اور بدمزہ ہوجاتا ہے اور اگر نہ کریں تو مفت کی بدنامی - سو بھئی ہماری یہی نصیحت ہے کہ ہر ملکے دہر رسمے - پابندیٔ وقت کچھ سرد ملک والوں کو ہی موافق آتی ہے - آخر ہمارے بزرگ بھی بیوقوف تو نہ تھے - ہیں - سچ ہے مگر اولاد ضرور بیوقوف چھوڑ گئے ہیں +

جامیؒ - یہ حکایت اُن حالات میں سے لیگئی ہے جو کتاب " مشاہیر اسلام " میں حضرت ملا جامیؒ صاحب کی بابت لکھی ہیں :- حضرت ملا جامی رحمتہ اللہ علیہ سلطان ابوسعید غفراللہ کے پاس ایکدن تشریف لیجارہے تھے رستہ میں ندمائے شاہی میں سے ایک شخص ملا اُس نے حضرت سے عرض کیا کہ اس وقت بادشاہ سلامت بزمِ عیش و عشرت میں سرگرم ہیں اور رحیق کا دور دورہ ہے! ملا صاحب سنتے ہی اپنے کاشانہ سعادت کو لوٹ گئے - ادھر یہ خبر بادشاہ کو لگی کہ حضرت جامی تشریف لاتے تھے مگر رستہ ہی سے گھر کو پلٹ گئے ہیں سنتے ہی تمام حالات طرب و مطربین کو اپنی مجلس سے اُٹھوا دیا اور لہو ولعب موقوف کرکے ایک مصاحب کے ذریعہ سے عرض کرا بھیجا کہ میں آپ کے قدم رنجہ فرمانے کا انتظار کر رہا ہوں +

ملا صاحب نے بجواب اس کے ایک غزل رنگین فی البدیہہ لکھ کر ابوسعید کی خدمت میں بھیجدی - جس کے یہ دو شعر ملا صاحب کے حسن اخلاق و حسن تنبیہہ کو بیان کرتے ہیں :-

نہ زہد آمد مرا مانع ز بزمِ عشرت اندیشان   غم خود دور میدارم ز بزم عشرت ایشان

بجائے طاطلس شاہاں نہ شاید فرش رہ حاشا   کہ راہِ قرب باید دلقِ گرد آلودِ درویشان

(حاجی اسمٰعیل)

زبانِ اُردُو

اُردو زبان کی ابتدا شہنشاہ اکبر (۱۵۵۶-۱۶۰۵) کے عہد سے ہوئی ہے
ہمایوں کے عہد میں سلطنت مغلیہ پنجاب اور مضافات دہلی و آگرہ تک ہی محدود
تھی ۔ مگر اکبر کی ذکاوت اور اس کی قوتِ انتظام کے اس چھوٹے سے علاقے کو ایک
عظیم الشان سلطنت بنا دیا ۔ جو کابل اور قندھار کی سرحد سے شروع ہو کر اوڑیسہ اور
حدود آسام تک پہنچتی تھی ۔ اس کا دار الخلافت کبھی شہر دہلی ہوا کرتا تھا اور کبھی
آگرہ اور ان شہروں کے درمیان اضلاع کی زبان مغربی ہندی کی ایک شاخ
تھی جس کو برج بھاشا کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے ۔ غالب خیال یہ ہے کہ اکبر
کے عہد تک مسلمان بھی ہندوؤں کے ساتھ میل جول کرنے میں یہی برج بھاشا
بولا کرتے تھے ۔ مگر شہنشاہ مذکور کے زمانے سے اس تغیر کا آغاز ہوتا ہے جس
کا نتیجہ بالآخر یہ ہوا کہ ضرورت نے ایک نئی زبان پیدا کر دی ۔ اکبر کے کئی وزرا
بالخصوص وزیر صیغہ مال ہندو تھے جن کو تقاضائے وقت کی وجہ سے اس وقت
کی درباری زبان یعنی فارسی سیکھنی پڑی ۔ جس طرح انگلستان میں شاہان نارمن
کے عہد سے اینگلو سکسن اور نارمن فرنچ کی آمیزش سے انگریزی زبان کا آغاز
ہوتا ہے اسی طرح ہندوستان میں فاتحوں اور مفتوحوں کی زبانوں کی آمیزش
سے یا یوں کہو کہ فارسی اور برج بھاشا کے ازدواج سے اُردو زبان پیدا
ہوتی ہے ۔ فارسی بولنے والے مسلمان سپاہی روزمرہ کے کاروبار میں جگجو
دہلی اور آگرہ کے باشندوں کے ساتھ برتاؤ کرنا پڑتا تھا ۔ اس آمیزش
کے اور بھی ممد ہوئے یہاں تک کہ ہندی مغربی کی قسموں شاہی یعنی اُردوئے معلّٰی

کے نام پر اُردو کہلانے لگی +

حکومت مغلیہ کی توسیع کے ساتھ ساتھ شمالی اور کسی حد تک جنوبی ہندوستان میں بھی تعلیم یافتہ لوگوں میں اس زبان کی ترویج ہوتی گئی اور ہندوستانی مسلمان مصنفین کی فارسی تواریخ واشعار کے ساتھ اس نئی زبان کا علم ادب بھی ترقی کرتا گیا۔ دو صدیوں تک تو محمدیہ علم ادب صرف مذہبی اور عاشقانہ نظموں تک ہی محدود تھا۔ جن کے مطالعہ سے زبان کی تدریجی نشو و نما کا سُراغ ملتا ہے۔ لیکن سولھویں صدی کے اختتام سے پیشتر مسلمان شعرا کی طبع آزمائیاں شروع ہوتی ہیں۔ اگرچہ ان کا عروض اور اُن کی زبان زیادہ تر ہندی اصل کی ہیں ۱۶۰۰ء کے قریب اُردو شعرا فارسی بحور کا استعمال شروع کرتے ہیں اور رفتہ رفتہ فارسی الفاظ و محاورات اُردو زبان میں کثرت سے داخل ہوتے جاتے ہیں۔ اٹھارہویں صدی کے اختتام کے قریب (۱۷۹۰ء) اُردو نثر کا پہلا نمونہ یعنے شیخ عبد القادر صاحب کا ترجمہ قرآن شریف شائع ہوتا ہے۔ مگر چونکہ اِس کے مصنف نے عربی محاورات والفاظ واشعارات کی اندھا دھند تقلید کی ہے اس واسطے یہ ترجمہ تصانیف ادبیہ میں شمار کئے جانے کا مستحق نہیں ہے +

آخر انیسویں صدی کے شروع میں اُردو مصنفین نے یہ محسوس کیا کہ نثر اظہار خیالات و تاثرات قلبی کا ایک موزوں آلہ ہے اس میں کوئی شک نہیں کہ اُردو نثر کے نشو و نما میں ایک بیجا تعویق لاحق ہوئی ہے۔ تاہم یہ تعویق اپنے فوائد سے خالی نہیں رہی۔ مسٹر بیمز فرماتے ہیں :-

"بدقسمتی سے قریباً ہر ہندوستانی زبان کا یہی حال رہا ہے۔ کہ جب مصنفین نے اِس زبان میں لکھنا شروع کیا تو اُن کی طرز تحریر سے قدرتی رنگ معدوم ہو گیا اور تصنع اور بناوٹ نے یہاں تک زور پکڑا کہ متاخرین نے متقدمین کی طرز تحریر

بغیر کسی تبدیل کے اختیار کر لیا"۔ لیکن اُردو زبان اس قید سے مستثنےٰ تھی۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ بعض فارسی تصنعات کی تقلید سے اسے نقصان پہنچا تاہم یہ صحیح ہے کہ اُردو نثر نویسوں نے بالعموم ایسی طرز تحریر کو اختیار کیا جو وقت کے تقاضے سے خود بخود پیدا ہوئی۔ اور جو بناوٹ سے آزاد ہونے کی وجہ سے عوام کے فہم اور سمجھ کے عین مطابق تھے +

موجودہ صدی میں اُردو نثر کی ترقی کے تین بڑے قوی اسباب ہوئے ہیں۔ اول چھاپہ خانہ کی ترویج جو مسیحی واعظوں بالخصوص سیرام پور کے واعظوں کی وساطت سے ہوئی۔ دوم زبان انگریزی نے تعلیم جو ۱۸۳۲ء کی مسیحی واعظوں اور بالخصوص ڈف صاحب کے مساعی جمیلہ سے شروع ہوئی اور جس نے ہندوستان کی زبانوں پر مغربی علمی خزائن کے دروازے کھول کر ان پر وہ احسان کیا جو گم شدہ یونانی علم ادب کی دریافت نے یورپ کی زبانوں پر کیا تھا۔ مغربی علوم وفنون کی ہوا نے اُردو زبان میں ایک نئی روح پھونکدی ہے اور شاید ہندوستان کی کوئی اور زبان اس مغربی اثر سے اس قدر متاثر نہیں ہوئی۔ جس قدر کہ یہ زبان ہوئی ہے سوئم اُردو زبان کا فارسی کے بجائے درباری زبان قرار دیا جانا۔ اس واقعہ کے اثر نے پٹنہ اور پشاور کے درمیان ممالک کو اُردو کے زیر نگین کر دیا ہے اور چونکہ دہلی اور آگرہ کو اب دار الخلافہ ہونے کا شرف نہیں رہا اس واسطے زبان مذکور کی ادبی تحریکات کے مرکز لاہور اور الٰہ آباد قرار پا گئے ہیں +

اُردو کی ماں یعنے برج بھاشا کا اثر تو دہلی اور آگرہ تک ہی محدود تھا مگر بانکی بیٹی کو خدا نے وہ شرف بخشا کہ آج شمالی ہندوستان میں تین لاکھ

مربع میل پر اس کا دور دورہ ہے بلکہ جنوبی اور مغربی ہندوستان کے بعض وسیع اضلاع بھی اُس حکومت سے آزاد نہیں اس کے علاوہ کئی مقامات میں مقامی بولیوں کے علاوہ اُردو گویا "زبان ثانی" تصور کی جاتی ہے جس کی وجہ سے اُردو بولنے والوں کی تعداد کا صحیح اندازہ کرنا نہایت مشکل ہے۔ باوجود اس اشکال کے ہم گریرسن صاحب کی تحقیقات کے مطابق زبان مذکور کے بولنے والوں کی تعداد درج کرتے ہیں اور صاحب موصوف کا شکریہ ادا کرتے ہیں جنہوں نے از روے کرم ہمیں اپنا مسودہ عطا فرمایا۔

پنجاب	۵۸۹۶۱۱
صوبجات متحدہ اور اودھ	۳۴۸۹۳۶۰
بنگال	۱۶۷۴۴۸۸
راجپوتانہ وغیرہ	۵۲۹۰۸۹
ممالک متوسطہ	۱۵۵۰۱۴
حیدرآباد	۲۷۰۳۰۰
بمبئی	۱۳۰۱۲۲۲
میزان	۸۰۰۴۱۸۳

مدراس کے اُردو بولنے والوں کی تعداد اس تعداد میں کچھ بہت بڑا اضافہ نہیں کرسکتی لہذا مندرجہ بالا تعداد کم و بیش ہندوستان کے خالص اُردو بولنے والوں کی سمجھی جانی چاہیئے۔ لیکن یاد رکھنا چاہیئے کہ جزئی طور پر اُردو زبان کی وسعت ان حدود سے وسیع تر ہے۔ مثلاً پنجاب کے ایک کروڑ مسلمان باشندوں اور ایک کروڑ ۵۵ لاکھ مسلمان بنگالی بولنے والوں کے درمیان

اُردو جز اُمروج ہے۔ مزید براں مندرجہ بالا ۸۰ لاکھ اُردو بولنے والوں میں غالباً لکھ پڑھ سکنے والوں کی تعداد شائد اس قدر ہے کہ کسی اور دیسی زبان کے بولنے والوں میں اس قدر نہ ہوگی۔ یہی حال اُن لوگوں کا ہے جو اُردو کو بطور زبانِ ثانی استعمال کرتے ہیں۔ ان لوگوں میں سے اکثر مثلاً اہلِ پنجاب نے اُردو مدرسوں میں پڑھ کر سیکھی ہے +

بعض مغربی مصنفین کی رائے ہے کہ اُردو ہندی سے کوئی الگ زبان نہیں ہے۔ کیونکہ اس کی صرف و نحو کلیتہً ہندی اصل کی ہے۔ بیمز صاحب فرماتے ہیں کہ اُردو کو ہندی زبان سے متمیز تصوّر کرنا غلطی ہے۔ اگرچہ ہندی بولنے والے مقامات میں مقامی بولیوں کے درمیان بہت سا اختلاف ہے تاہم ایک عام مشترک بولی متعارف ہے جس کو تمام تعلیم یافتہ لوگ استعمال کرتے ہیں۔ اس مشترک بولی کی ابتدا مضافات دہلی سے ہوئی اور ہندی کی وہ شکل جو اس شہر کے گرد و نواح میں بولی جاتی تھی رفتہ رفتہ ایک نئی زبان سمجھ کر اختیار کر لی گئی "۔ بیمز صاحب ٹھیک فرماتے ہیں مگر وہ اس امر کو نظر انداز کرتے ہیں کہ اس نئی زبان کا اختیار کیا جانا ہی گویا اُردو زبان کی ابتدا تھی۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو برج بھاشا شمال مغربی ہندوستان کے ایک تھوڑے سے حصہ تک ہی محدود رہتی اور اس کی حیثیت سے بڑھکر نہ ہوتی۔ ڈاکٹر ہارنل نے ٹھیک کہا ہے۔ کہ اُردو برج بھاشا کی ایک تبدیل شدہ صورت ہے۔ جس نے بھاشا کی گردانوں کے اُلجاؤ سے اپنے آپ کو آزاد کر لیا ہے۔ اور بعض صیغے جو پنجابی اور مارواڑی کے ساتھ مختص ہیں رکھ لئے ہیں۔ پس اُردو بلحاظ صرف و نحو کے ہندی الاصل ہے۔ جس میں کچھ مارواڑی اور پنجابی اجزا بھی شامل ہیں اور بلحاظ الفاظ و اصطلاحات کے اس کی اصل کچھ ہندی

ہے اور کچھ فارسی و عربی وغیرہ بلکہ اس کے مصنفین نے کئی غیر ملکی محاورات کا ہندی ترجمہ کر کے اپنی زبان کے ذخیرہ محاورات کو زیادہ کیا ہے مثلاً محنت کھینچنا پھل لانا وغیرہ جو محنت کشیدن اور بار آوردن کا ترجمہ ہیں کتابی ہندی کی تو ابتدا ہی اس صدی سے ہوتی ہے۔ یہ گویا اس اثر کا نتیجہ ہے جو انگریزی تعلیم نے زمانہ حال کی ہندوں پر کیا ہے۔ اگرچہ حقیقت میں یہ کتابی ہندی وہی اُردو ہے جس میں غیر ملکی الفاظ و محاورات کی جگہ تصنع سے ہندی محاورات اور سنسکرت کے الفاظ استعمال کئے جاتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ہندی زبان بولنے والے ممالک کے تعلیم یافتہ ہندو کتابی ہندی کو آسانی سے سمجھ سکتے ہیں اور برج بھاشا بولنے والے اس کے فہم سے عاری ہیں۔ ہمارے نزدیک ڈاکٹر ہارنل نے جو اُردو مشرقی ہندی اور مغربی ہندی میں امتیاز کیا ہے بالکل صحیح ہے۔ اور اُردو مشرقی اور مغربی ہندی سے اس طرح متمیز ہے جس طرح انگریزی ڈچ اور جرمن سے +

فی زماننا انگریزی زبان کی طرز تحریر اُردو زبان پر بہت بڑا اثر کر رہی ہے موجودہ اُردو اخبارات اور تعلیم یافتہ ہندوستانیوں کی بولی انگریزی زبان کے الفاظ و محاورات سے معمور ہوتی ہے۔ اگرچہ مستند اُردو مصنفین کی تحریر میں انگریزی الفاظ و اصطلاحات کو چنداں دخل نہیں ہے۔ تاہم بہت سے الفاظ آہستہ آہستہ اُن کی تحریروں میں آتے جاتے ہیں (مثلاً توبۃ النصوح کے مصنف نے الفاظ انٹرنس۔ البم۔ فری میسن۔ ربڑ۔ پنسل۔ ڈاکٹر وغیرہ کو استعمال کیا ہے) اور اُن کی طرز تحریر اور لکھنے کا ڈھنگ انگریزی طرز ادا سے متاثر ہوتا جاتا ہے۔ اس اثر کا نتیجہ خود واضح ہو جائیگا۔ بیمز صاحب اس امر کے متعلق یوں پیشگوئی کرتے ہیں +

غالب گمان یہ ہے کہ ریلوں سڑکوں اور دیگر وسائل آمدورفت کی توسیع سے پنجابی اور راجپوتانہ کی دیگر مقامی بولیاں معدوم ہو جائینگی جس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ اٹک سے راج محل تک اور ہمالہ سے وہندیاچل تک ایک ہی زبان ہندی مفرس یعنے اُردو کا دور دورہ ہوجائیگا۔ اسوقت اس زبان کے بولنے والوں کی تعداد دس کروڑ سے بھی زیادہ ہوگی اور یہ زبان اپنی عظیم الشان وسعت اور روز افزوں وقعت کے باعث اپنی ہمسایہ زبانوں پر بھی ایک بہت بڑا اثر ڈالے بغیر نہ رہیگی۔ جوں جوں مقامی اتحاد کے وسائل اور ملک کے مختلف حصص کے تعلقات بڑھتے جائینگے توں توں یہ سادی شستہ بانکی اور ہر قسم کے مطالب کو ادا کر سکنے والی اُردو زبان جو ہندوستان کے اکثر حصوں میں بولی جاتی ہے اور جو حکمران قوم کو انگریزی زبان کے ساتھ خاص تشابہ رکھنے کے باعث بالخصوص مرغوب ہے ہندوستان کی اکثر دیگر زبانوں پر غلبہ حاصل کرتی جائے گی اور بالآخر وہ وقت آجائیگا جب کہ تمام آریا ہندوستان کی زبان ایک ہو جائیگی" اس میں کوئی شک نہیں کہ اُردو زبان اور انگریزی زبان کی تاریخ میں ایک عجیب وغریب مماثلت ہے اور ولیم کوپر شاعر انگلستان کے دلفریب الفاظ دونوں پر صادق آسکتے ہیں +

اے انگلستان اس مدت مزید کے بعد بھی تیری زبان پر تیرے فاتحین کا اثر نمایاں معلوم ہوتا ہے شستگی بانکپن اور لطف ادا اس کے خاص جوہر ہیں اور یہ خیالات و الفاظ کے ان گرانمایہ موتیوں سے دمک رہی ہے جو تیرے فاتحین پیچھے چھوڑ گئے ہیں +

امیر خسروؔ کا بچپن

نقار خانہ میں طوطی کی آواز کون سنتا ہے - یہ ایک مشہور مثل ہے۔ الوالعزم پرانے کلیوں کو توڑتے اور نئے کلئے قائم کرتے ہیں - طوطیٔ ہند امیر خسروؔ کے کمال نے مثل بالا کا عکس آئینہ ہمت میں دیکھا ہے اُن کے واسطے یہ کہنا پڑتا ہے کہ طوطی ہند کی آواز نقار خانۂ گردوں میں کون نہیں سنتا - جہاں جاؤ اُن کا کمال بلند آوازہ ہے - جس طرف کان لگاؤ اُن کا کلام سامعہ نواز ہوتا ہے - صوفیا کی مجلس میں حاضر ہو - بزم شعرا میں جاؤ - پرانے مکتبوں کی طرف جا نکلو - موسیقی کے جلسوں میں بیٹھو - گیت گانے والوں کے پاس سے گزرو - لطیفے کہ مکرنیاں وغیرہ سنو ہر جگہ خسروؔ یا خسروؔ کا نام سنو گے - زمانہ بدلا تو مذاق بھی بدل گئے - ہم کسی باکمال کا نام یا کلام سنتے ہیں تو اُس کے حالات کا تفحص اور شوق دل میں پیدا ہوتا ہے - سوسائٹی بیخبر - پیش نظر کتابیں خالی - دل کی آرزو دل میں رہ جاتی ہے - جس طرح ایک تازہ پودا پانی نہ ملنے سے خشک ہو جاتا ہے - اسی طرح یہ عزیز شوق مدد نہ پہنچنے سے افسردہ ہو کر رہجاتا ہے - قیامت یہ ہے کہ جن اہل کمال کے نام مقبولیت کی برکت سے زیادہ روشن ہیں - انہیں کے حالات پر تاریکی نے زیادہ پردے ڈالے ہیں - امیر خسروؔ کی مقبولیت مسلّم - تصوف کی کتابیں پڑھو - تذکرے دیکھو - معدودے چند واقعات پاؤ گے - اُن واقعات سے اُس مذاق واقعہ سنج کی سیری نہ ہوگی جو حال کی سوانح عمریاں دیکھ کر پیدا ہوتا ہے - اسلاف میں باکمال بھی تھے دقایق نگار بھی -

پھر یہ کیا غضب ہے کہ ایسے زندہ جاوید کملا کے حالات لحد فنا میں سو رہے ہیں۔ حال یہ ہے کہ گذشتہ تین چار صدیاں ہم پر ایسی گذری ہیں جنہیں خیالی و ذہنی مضامین کی حکومت ہمارے دماغوں پر رہی ہے علوم میں معقولات۔ فنون میں شاعری۔ رات دن انہیں کا چرچا تھا اور ان دونوں کو واقعات سے بہت کم مناسبت ہے۔ اس زمانہ کی اعلےٰ سے اعلےٰ تصنیف پڑھو اُس کا سرمایہ ناز ذہنی موشگافی پاؤ گے۔ جس کے لئے اپنا خیال اور دماغ کافی ہے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ طبیعتیں حقایق سے غیر مناسب ہو گئیں مذاق واقعات سے آشنا نہ رہے تاریخی سرمایہ کو طاق نسیان میں پڑے پڑے فنا کی دیمک چاٹ گئی۔ خلاصہ یہ کہ پچھلوں نے اگلوں کی کمائی ڈبو دی۔ اور اُس کو ڈبو کر فن تاریخ سے ہاتھ دھو بیٹھے۔ قیامت ہے کہ ابن بطوطہ اور ابن جبیر کے نام اور کام یورپ نے عرب و عجم کو سنائے اور دکھائے تب ہم کو یہ خبر ہوئی کہ ہم میں بھی یہ سرمایۂ نازش تھا۔ ہندوستان میں بہت سے علمائے نامور گذرے ہیں مگر اُن کے حالات میں کوئی تذکرہ یا طبقات کی کتاب نہیں لکھی گئی۔ اگر آزاد بلگرامی سبحۃ المرجان لکھ کر تھوڑی بہت جان نہ ڈال دیتے تو اُن کا نام بھی زندہ نہ رہتا۔ شعرا کا حال سب سے زیادہ تباہ ہوا۔ یہاں ازل سے نام و نشان سے دشمنی چلی آتی ہے۔ تذکروں میں مسجع اور مقفیٰ عبارت بہت۔ نام اور تخلص کی رعائت سے مملو۔ فقرے مسلسل لیکن سلسلہ واقعات معدوم۔ تذکرہ حالات مفقود اس ظلمت کدہ میں جب کسی طرف سے روشنی کی کرن آجاتی ہے تو آنکھیں سی کھل جاتی ہیں۔ دل نور مسرت سے روشن ہو جاتا ہے ✣

یہ تو مشہور ہے کہ امیر خسرو کے چار دیوان تھے۔ تحفۃ الصغر۔ وسط الحیات

غُرۃ الکمال - بقیہ نقیہ - ان چاروں کا خلاصہ دیوان خسرو کے نام سے ہندوستان کے ایک مشہور مطبع نے چھاپا ہے - عبرت کی آنکھیں ان اربعہ عناصر کو دیکھ کر آٹھ آٹھ آنسو روتی ہیں - کلام کو ایسا مسخ کیا ہے کہ اصلی خط و خال کا نشان باقی نہیں - مطبوعہ نسخہ کو کسی صحیح مجموعہ سے ملا کر پڑھے تو اصلیت جلوہ گر ہو۔

تحفۃ الصغر کا ایک قدیم قلمی نسخہ حال میں میرے ہاتھ آیا ہے - دیباچہ میں مصنّف نے اپنی ابتدائی شاعری کے کچھ حالات لکھے ہیں - جو بیحد دلچسپ ہیں تنہا خوری پسندیدہ نہیں - مخزن کے خوانِ نعمت پر اُس کا لُبِ لباب چنتا ہوں - ع صلائے عام ہے یارانِ نکتہ داں کے لئے + عبارت صنائع بدائع سے مرصع نہ ہوتی تو لفظی ترجمہ پیش کرتا - جس سے حال وقال دونو کا لُطف حاصل ہوتا +

اس چھوٹے سے دیوان میں ۱۶ برس کی عُمر سے ۱۹ برس تک کا کلام ہے - ابتداءً امیر خسرو کا تخلص سلطانی تھا وُہی اس مجموعہ میں جابجا نظر آتا ہے کم کم خسرو بھی ہے - قصیدہ - غزل - رباعی - قطعہ ہر قسم کے کلام پاؤ گے - تصوف تغزل - مدح - ظرافت - مفہوم کا بھی ہر رنگ موجود ہے - ہجو نام کو نہیں - اقسام کلام کا شمار حسب ذیل ہے :- قصائد ۳۴ - ترجیع ۲ - ترکیب بند ۲ - قطعات ۲۳ غزلیات (غیر مرتب ۸۷) مثنوی یک - رباعیات ۲۰۵ - قصائد میں بعض قصیدے سلطان علاء الدین کی مدح میں ہیں - یہ غالباً الحاقی ہیں اس لئے کہ سلطان ممدوح ۶۹۵ھ میں تخت نشین ہوا اور اُس وقت امیر خسرو کی عُمر ۴۳ برس کی تھی +

خلاصہ دیباچہ میں جو حالات آپ ابھی پڑھیں گے اُن کے سوا یہ دو چار اور معلوم ہو سکتے ہیں +

امیر خسرو* ۶۵۱ھ کو مومن آباد پٹیالی (ضلع ایٹہ ممالک متحدہ) میں پیدا ہوئے پانچ برس کے تھے کہ دارالکمال دہلی پہنچے - باپ کا سایہ کم سنی میں سر سے اُٹھ گیا - نانا نے تربیت کی - یاوری طالع دیکھو - اُس زمانہ میں حضرت سلطان نظام الدین اولیا کا قیام اُن کے ننہال میں تھا[۲] اُنھوں نے لڑکپن میں ہی شرف بیعت حاصل کیا - نیز منزل سخن کی ہدایت پائی - مرشد کامل نے آغاز ہی میں یہ گُر تلقین فرما دیا تھا "بہ طرز صفاہانیاں بگو" یعنی عشق انگیز و زلف و خال آمیز، ابتدائً جو شعر کہتے وہ حضرت کے ملاحظہ میں پیش کرتے - وان مبتدی و منتہی حضرت نے خود اُن کو پڑھایا اور اُس کے رموز اشارات ذہن نشین فرمائے اِس فیضان نے کلامِ خسرو میں وہ سوز و گداز پیدا کر دیا کہ آجتک جو سنتا ہے دِل تھام لیتا ہے (یہ حالات سیر الاولیا و سیر العارفین سے ماخوذ ہیں) +

خُلاصۂ دیباجۂ تُحفۃُ الصِّغر

بندہ خسرو عرض پرداز ہے کہ عنایت ایزدی سے میں نے بارہ برس کی عمر میں بیت و رُباعی کہنی شروع کی - فضلاء و بلغاء روزگار اُن کو سُنکر تعجب کرتے تھے اُنکے تعجب سے میرا شوق ابھرتا تھا - وہ بزرگ میری قابلیت

---

* سال پیدائش قران السعدین کے ان اشعار سے واضح ہوتا ہے ۔ آنچہ بتاریخ زہجرت گذشت بود ششصد و ہشتاد و ہشت ۔ سال من ار مرز اگر برسی ۔ سال بگویم کہ شش بود و سی ۔ ۳۶ - ۶۸۸ = ۶۵۲ھ

[۲] قدیم دہلی کا ایک دروازہ سنڈی دروازہ کے نام سے مشہور تھا اس کے پاس ہی امیر خسرو کے ننہال کا مکان تھا - اس کا موقعہ اب بی بی نور کے مقبرہ کے قریب متصل درگاہ حضرت قطب صاحب ہے ۱۲

دیکھ کر ترغیب دیتے تھے۔ میرا یہ عالم تھا کہ کثرتِ شوق کے اثر سے شام سے
صبح تک چراغ کے سامنے مثل قلم سرنگوں رہتا تھا۔ اور رات کو مطالعہ میں مصروف
یہانتک کہ نظر میں وقت پیدا ہوئی اور کلام کی باریکیاں خیال میں آنے لگیں
اس کے ساتھ ساتھ یہ بھی تھا کہ ابنائے جنس میری طبیعت کے امتحان لیتے تھے۔
امتحان سے میرا دل گرماتا تھا۔ اور دل کی گرمی زبان میں روانی پیدا کرتی تھی۔
اسوقت تک کوئی اُستاد نہ ملا تھا جو دقائق کی راہ بتاتا۔ قلم کو بے راہ روی سے
روکتا۔ نقائص کو دُور کر کے کمال کا جلوہ دکھاتا۔ پس میں نوآموز طوطی کی طرح اپنے
ہی خیال کے آئینہ کے سامنے بیٹھا بیٹھا مشق سخن کرتا تھا۔ اور سخن سنجی سیکھتا تھا۔
اِسی طرح آہن دِل کی صیقل گری اپنی ہی قوت بازو سے کرتا رہا۔ اُستادوں کی تصانیف
کا مطالعہ ہمیشہ کرتا تھا۔ حتی کہ مذاق لطفِ کلام و ذوق سخن سے آشنا ہوا۔ اور انوری
و سنائی کا کلام دیکھنا اور فہم کو روشنی پہنچاتا۔ جو عمدہ نظم نظر آتی اُس کا جواب لکھتا
جس دیوان کا مطالعہ کرتا اُسی کے انداز پر شعر کرتا۔ ایک عرصہ تک خاقانی کے
دامنِ دولت سے لپٹا رہا جو الفاظ اس کے کلام میں مغلق تھے اُن کی تعلیق
(یعنے نوٹ لکھے) اگرچہ مغلق اشعار کو حل کرتا تھا تاہم بمقتضائے نوعمری
کما حقہٗ حقائق کلام واضح نہیں ہوتے تھے۔ ہرچند میری ہمت آسمان پیما تھی
لیکن استاد کے کلام کا پایہ اتنا بلند تھا کہ میرے فہم کی رسائی وہاں تک نہیں
ہوتی تھی۔ با اینہمہ عاقبۃ الامر استاد کی پیروی سے طبیعت بڑھنے لگی چونکہ میرے
کلام کا کوئی خاص مرجع نہ تھا ہر اُستاد کے رنگ میں کہتا تھا۔ اس لئے اس
مجموعہ میں متقدمین و متاخرین سب کا رنگ موجود ہے +

حاصل کلام میرے والد نے تحصیل علم کے واسطے مکتب میں بٹھایا۔ یہاں یہ
حال تھا کہ قافیہ کی تکرار تھی۔ میرے اُستاد مولانا سعد الدین خطاط مشق خط کی

تاکید کرتے تھے - میں اپنی ہی دھن میں تھا - وہ پیٹھ پر درّے لگاتے مجھ کو
زلف و خال کا سودا تھا - انتہا یہ کہ اسی سن میں وہ شعر و غزل کہنے لگا جسکو
سن کر بزرگوں کو حیرت ہوتی تھی - ایک مرتبہ صبح کے وقت میرے اُستاد
کو خواجہ اصیل نائب کوتوال نے خط لکھنے کے واسطے بلایا - میں دوات
قلم لیکر ہمراہ ہوا - اس عزیز کے گھر میں خواجہ عزیز الدین - کالو گلاتی نظر بند
تھے - خواجہ موصوف عالم متبحر اور دریائے سخن کے شناور تھے - جب ہم
وہاں پہنچے تو وہ مطالعہ کتاب میں مصروف تھے - اثنائے مطالعہ میں جب
وہ کسی مضمون پر گفتگو کرتے تھے تو اُن کے منہہ سے موتی جھڑتے اور جواہر
آبدار زبان سے نکلتے - میرے اُستاد نے اُن سے کہا کہ یہ میرا ذرا سا شاگرد
اس بچپن میں نظم کا بیحد شائق ہے - شعر پڑھتا بھی خوب ہے - کتاب اسکو
دیکر امتحان لیجئے - خواجہ عزیز نے فوراً کتاب مجھ کو دیکر سنانے کی فرمائش
کی - میں نے اشعار ترنم آمیز لہجہ میں پڑھنے شروع کئے - اُس کے اثر سے
آنکھیں پرنم ہوگئیں - ہر طرف سے تحسین کی آواز آنے لگی - پھر میرے
اُستاد نے کہا کہ پڑھنا سن لیا اب کوئی بیت پیش کرکے جودت طبع کی
آزمائش کیجئے - خواجہ ممدوح نے چار غیر متناسب چیزوں کے نام لیکر کہا
اُن کو نظم میں موزوں کرو - وہ نام مو - بیضہ - خربزہ - تیر تھے - میں نے اسی
جلسہ میں یہ رباعی موزوں کرکے سنائی ؎

ہر موئے کہ در دو زلفِ آں صنم است — صد بیضۂ عنبریں بر آں موئے ضم است
چوں تیر مداں راستش دلش را زیراکہ — چوں خربزہ دندانش درون شکم است

جس وقت میں نے یہ رباعی پڑھی خواجہ نے بہت ہی آفرین فرمائی - اور نام
پوچھا - میں نے کہا خسرو - باپ کا نام پوچھا - میں نے کہا لاچین - کہا لاچین

ترک خطا ہے - میں جواب دیا کہ بخیطا ترک ہے - دریافت کیا تم درم خریدہ ناصری[۱] ہو - عرض کی سلطانی شمسی[۲] ہوں (سلطانی اشرفی کو کہتے تھے - درم خریدہ کی کیسی رعائت ہے) فرمایا چونکہ تمہاری نسبت سلطانی ہے لہذا سلطانی اپنا تخلص رکھو - اس کے بعد بہت سی باتیں میرے دل بڑھانے کی کیں - اور فن کے متعلق بہت سی دقیق باتیں تلقین فرمائیں - جنکو میں دل میں رکھتا گیا - اس روز سے میں نے اپنا تخلص سلطانی رکھا - اس دیوان میں یہ سکہ بہت رائج ہے - اس کے بعد میں باریک مضامین کے پیچھے پڑا رہا + یہ سب کچھ ہوا مگر چونکہ زمانہ لڑکپن کا تھا اس لئے کبھی کلام جمع کرنے کا خیال نہیں کیا - میرا بھائی تاج الدین زاہد جس کی باریک بین طبیعت مشاطۂ اشعار ہے ان اشعار کو فراہم کر لیتا تھا - اور جو کچھ میں نے ۱۶ برس کی عمر سے ۱۹ برس کی عمر تک کہا اسکا ایک مجموعہ اس نے بنایا - میں نے اس کو دیکھ کر کہا کہ یہ پانی میں ڈبو دینے کے قابل ہے - اس نے نہ مانا اور فرمائش کی کہ اس کو مسلسل کر دو - چنانچہ میں نے ہر حصۂ کلام پر ایک شعر اس کے عنوان کے طور پر کہہ کر لگا دیا - یہ میرا ایجاد ہے - مجھ سے پیشتر کسی نے یہ سلسلہ قائم نہیں کیا - اس دیوان کا نام تحفۃ الصغر ہے - سچ یہ ہے کہ ہر چند اوراق باطل جمع ہیں - میدان نشیب و فراز سے معمور تھا اور پاؤں میں لنگ تھی - میں نے بہت چاہا کہ باد پائے قلم کو جنبش نہ کرنے دوں لیکن دوستوں نے نہ مانا - عموماً سب اور خصوصاً بھائی تاج الدین برابر مصر رہے - میں برسوں اس تاج بلند گوہر کے سلک محبت میں سرفراز رہا ہوں

[۱] اشارہ بجانب سلطان ناصر الدین ۱۲ [۲] اشارہ بجانب سلطان شمس الدین شمسی ۱۲ +

اور اخوت کے اثر نے ہم دونوں کو بے مبالغہ برادران توام کی مثال بنا دیا ہے۔ خدا ہمارے بھائیوں کی تعداد میں ترقی دے ؎

بسکہ جانم یگانہ شد با او　　　در گمانم کہ این منم یا او

اُس کا مقصود یہ تھا کہ یہ دفتر پر حشو کسی شمار میں آجائے۔ میں کہتا تھا کہ لوگ اعتراض کرینگے۔ وہ کہتا تھا کہ دانا یہ دیکھ کر (جیسا کہ نام سے ظاہر ہے) کہ یہ بچپن کا کلام ہے اعتراض نہ کریگا۔ نادان کے اعتراض کا لحاظ کیا۔ میں کہتا تھا کہ اس میں شتر گربہ (رطب و یابس) بہت ہے۔ اس کا جواب تھا کہ لوگ اس کو تعویذ بنا کر موشک بازو (بازو کی چوہیا) پر باندھینگے۔ غرض برادر موصوف کے اصرار سے اس مجموعہ کو یاران خوب شمائل کی خدمت میں پیش کرتا ہوں۔ امید ہو کہ بہ طیب خاطر قبول فرمائینگے ‘‘

نظرے خوش گذرے

آپ نے دیباچہ کا خلاصہ ملاحظہ کیا۔ دیکھنے کے قابل یہ بات ہے کہ امیر خسرو کو کشور سخن کا تاجدار کس چیز نے بنایا۔ فطری مناسبت کثرت مطالعہ ولولۂ شوق اصلی سبب تھے۔ سوسائٹی کا قابل ہونا ہمسروں کی چھیڑ چھاڑ بزرگوں کی نقادی و شفقت یاران ہمدم کی ہمت افزائی۔ ان سے اون اسباب کو قوت پہنچی اور سب کے مجموعی زور نے تخت خسروی پر جا بٹھایا جب جوہر قابل بنکر دربار سلاطین میں پہنچے تو خان شہید (شاہزادہ محمد سلطان پسر سلطان غیاث الدین بلبن)، سے مربی ملے۔ جو خود سخن سنج نقاد فن تھے۔ قران السعدین میں امیر خسرو نے اپنی ترقی کا جو گر لکھا ہے وہ ہر راہرو

منزلِ کمال کے واسطے توشہ بن سکتا ہے ؎

ہرچہ ستائش کنندم مرد ہوش | گرچہ بود راست نیارم بگوش
زانکہ چوں زیں فن بعزو راوفتم | ترسم ازیں مرتبہ دور اوفتم
چرب زبانی نبود سود مند | طفل بود کش بفریبی بقند
آنکہ شناسندہ ایں گوہر است | گر ہمہ نفریں کنندم درخور است
وانکہ بتقلید نشست اندریں | نشنوم از خود کنندم آفریں

فطرتِ جوانمردی

بیرام (عید) چھوٹے بچوں کے لئے روز فیروز مسرت ہوتا ہے۔اور نو رسیدگانِ بشر کے واسطے فخر و مباہات کا ذریعہ ہوتا ہے۔ہم سب جانتے ہیں کہ بچے کس سرور بیقیدانہ سے اس دن کا استقبال کرتے ہیں الغرض یہ یوم مسعود پہلی بہار ہے۔اِس دن کی کشائیش اور لطافت ننھے ننھے دلوں میں طرح طرح کے نامتناہی حیات شادمانی بھر دیتی ہے اور بچے ایک طفلانہ رغبت کے ساتھ اِس صبح سعادت کو لباس فاخرہ پہنکر جو معصومانہ مگر اِک دوسرے سے جدا رنگ کے ہوتے ہیں۔غرور کے انداز سے گلی کوچوں میں پھرتے نظر آتے ہیں +

جابجا بازاروں اور میدانوں میں یہ رنگین جماعتیں یہ الواح لطیف اک عجب نظرِ زیبا لالہ زار معلوم ہوتے ہیں۔جو اُن کے ذریعہ سے دِل میں حسن فرحت و بہجت پہنچاتے ہیں +

مگر کیا ان بچوں میں تم سب کو خوش سب کو کامگار خیال کرتے ہو؟ آہ!
اگر تحقیقات کرو تو ان ننھے ننھے دلوں میں بعض ایسے ہونگے جن میں وہ دریائے
خون موجزن ہوگا کہ جس کی گہرائی دیکھ کر تم بھی خوف زدہ ہوجاؤ +

باعتبار عام یہ دن مسرت کا دن تھا اور لڑکے خوشی میں اچھل رہے
تھے لیکن ان میں ایک پانچ برس کی لڑکی بھی تھی - اس لڑکی کا سر اوروں کی
مانند مزین و رنگین نہیں کیونکہ بیچاری یتیم ہے - چھ مہینے ہوئے کہ بیچاری
کا شفقت کرنے والا باپ مرگیا جو اسے اس کی ہم عمروں کی طرح اچھے اچھے کپڑے
پہناتا - صرف ماں کی آغوش مرحمت ہے اور وہی اس لڑکی کی التجاگاہ ہے مگر
وہ بدبخت بھی اپنے نوجوان خاوند کی دائمی جدائی اور حیات فرسا ہجران اور
اس کی وجہ سے احتیاج و تنگی معاش سے بستر الم و اضطراب پر پڑی رہتی تھی -
اس عورت نے جو تھوڑے ہی دن ہوئے کہ حسین و دلربا تھی عید سے ماقبل
شام کو جبکہ صدائے توپ نے اعلان عید کیا - چھوٹے بچے کو گود میں لیکر بوسوں
کی بھرمار کردی کون جان سکتا ہے کہ بیچاری عورت کو کیا حیات پر نا امیدی تھی
جس کی وجہ سے لڑکی کے رخسار پر گرم بوسوں کے ساتھ گرم آنسوؤں کا تار
بندگیا تھا - بچی نے پوچھا "اماں کیوں روتی ہو؟" +

"کچھ نہیں میری بچی! یونہی دل بھر آتا ہے"

"نہیں ہمارے ابا کو روتی ہو - کیا نہیں اماں؟ آفندی بابا - بہت دن
سے گھر میں نہیں آئے - اس دن خاموش ایک جگہ گئے تھے - تم نے کہا تھا
گڑیں لائینگے - جب سے اب تک نہیں آئے - تم نے کہا تھا دور گئے ہیں"
لڑکی کی ان معصومانہ باتوں نے دل دکھی ہوئی ماں پر ایسا خوق العادۃ اثر
کیا کہ وہ ہچکیاں لیکر رونے لگی - مایوس والدہ کی بجائے حزن دیکھ کر لڑکی

بھی روئی۔ اُس نے ماں کے رونے پر وہ کام کیا جو آگ پر تیل کرتا ہے۔ جب ماں اپنے آنسوؤں کا تمام ذخیرہ ختم کر چکی تو نوازش مادرانہ کے ساتھ اپنے جگر پارہ کو سینے سے دبا کر خاموش کرنا چاہا +

لڑکی پر ماں کی گود میں جاکر تاثیراتِ الم سے ایک قسم کی بیہوشی طاری ہوگئی اور تھوڑی دیر میں وہ سو گئی۔ تمام رات اس ننھے دل کے غم نے سینہ کو ایک ہیجان کی حالت میں رکھا۔

صبح سویرے جب بچی زمرہ اطفال میں جاکے شامل ہوئی تو انہوں نے اُسے دیکھ کر کہنا شروع کیا "دیکھو! دیکھو! عصمت نے آج اچھے کپڑے نہیں پہنے" اور صرف اسی قدر نہیں کہا بلکہ سب نے خوش خوش اور کود کود کے اپنی رنگین جاکٹیں اور چمکتے ہوئے بوٹ عصمت کو اس طرح دکھائے کہ بیچاری معصوم کے قلب رقیق پر حسن نومیدی ایک عجیب جگر سوز صورت میں پیدا ہوئی اور اُس نے ایک حد درجہ الم انگیز مایوسانہ سے گردن پھیر پھیر کر اپنی ساتھیوں کی حقیقتاً دلربا جاکٹوں کو رشک کی نظر سے دیکھا +

عصمت اپنی ماں پاس آئی اور ٹھنک ٹھنک کر شکائت کرنے لگی اور کہا مجھے اور جاکٹ پہناؤ۔ ماں نے ایک اطلسی جاکٹ جو عصمت کے باپ کے زمانہ حیات میں سلائی گئی تھی اور سینکڑوں مرتبہ پہنائی جا چکی تھی۔ ناچار اپنے نور عین کو اسی صورت سے خوش کرنے کے لئے پہنادی اور اُس کے ننھے ننھے خوبصورت پاؤں ایک پورانے بوٹ کے جوڑے میں ڈالدئے اور عصمت یہ کپڑے پہن کے باہر گئی مگر ہر شخص ایک نظر میں سمجھ لیتا تھا کہ یہ بیچاری بیکس و یتیم ہے +

اچھی لڑکی اپنی ہمجولیوں سے الگ گھر کی دیوار کے نیچے جا بیٹھی۔

اور ٹکٹکی باندھ کے سامنے اس طرح دیکھنے لگی گویا اُسے باپ کی صورت نظر آرہی ہے +

اسی درمیان میں اُدھر سے گذرنے والے ذکی بے نے ننھی عصمت کو احوال پریشاں کو دلسوزی کی نظر سے دیکھا اور نہائت شفیق اور نوازشانہ آواز سے پوچھا +

"چھوٹی چھوٹی خانم! اپنی ہمجولیوں کے ساتھ کیوں نہیں کھیلتیں؟"

"میرے پاس اچھے کپڑے نہیں ہیں! سب کہتی ہیں دیکھو عصمت کے پاس کپڑے ہی نہیں۔ میرے بوٹ پُرانے ہونے کی وجہ سے سب مجھ پر ہنستی ہیں۔"

"چھی چھی! اُنہوں نے ایسے نامناسب طور پر تمہیں ناراض کیا؟ میری بچی کیا تمہارے ماں باپ نہیں ہیں؟"

"آفندی بابا تو گڑیاں لینے گئے ہیں۔ اماں کہتی ہیں بہت دُور گئے ہیں۔ اتنی دور گئے ہیں کہ بہت دنوں میں آئینگے۔ یہ کہکر روتی ہیں۔ بابا گھر میں آتے ہی نہیں۔"

"ننھے فرشتے! اپنا گھر مجھے دکھا سکتی ہو؟"

عصمت نے اپنے چھوٹے ہاتھ ایک معصومانہ دلفریب طریقہ سے اُٹھا کر سامنے کی طرف اشارہ کر کے کہا کہ یہ ہے۔"

"اچھا اماں وہیں ہیں۔"

"ہاں! مگر بیمار ہیں بستر پر پڑی ہوئی ہیں۔"

اس مکالمہ کے بعد ذکی بے نے بچی کے تمام احوال متالمہ سے واقفیت حاصل کر کے اپنے پاس نوکر کو بلایا اور اُس سے چند باتیں آہستہ آہستہ کیں۔

دو گھنٹے بعد عصمت نہائیت لطیف کپڑے پہنے ہوئے گاڑی میں بیٹھ کر خوش خوش آغوش مادر میں واپس آئی +

اُس دن کے بعد سے زکی آپ کی اولاد معنوی ہوکر عصمت نے اپنی ماں کے ساتھ زیر حمائیت زکی بے حیات مسعودانہ گذارنا شروع کی - بارہ برس بعد عصمت صنعتِ قدرت کا عجب حسین نمونہ اور ایک گھر پر حکمرانی کرنے کے قابل ہوکر ایک جوان کے دست ازدواج میں سپرد و بختیار کامران ہوئی +

رموز حیات

اِس مضمون میں ہمیں اُن قوائے اندرونی سے بحث کرنی ہے جنکو ٹھیک ٹھیک سمجھنے اور برتنے سے اِنسان کے لئے ہر جائیز ترقی کا دروازہ کُھل جاتا ہے اور زندگی قابل قدر و شکر گذاری بنجاتی ہے - خیال کو معلومات حیات انسانی میں بہت بڑا دخل ہے حتےٰ کہ اکثر صورتوں میں بہت کچھ زندگی خیالات ہی کے نتایج سے مرتب ہوتی ہے - اگر خیالات کا ابال کسی اصلی اور صحیح مادہ کے جوش کھانے کا نتیجہ ہے تو اِنسان کی زندگی نہائیت صحیح اور پائیدار اصول پر قایم ہوگی - اگر اس کے برعکس ہے تو نتیجہ بھی برعکس ہوگا - کسی صحیح مادہ کی تحریک اولیٰ جو قلب اِنسان میں پیدا ہوتی ہے اُسے ایمان کہتے ہیں - اِس کی تفصیل اور پھیلاؤ کا نام عقائید ہے اور یہ دونو ملکر خیال پر جو اثر پیدا کرتے ہیں اور پھر خیال کے زیر سایہ جس طرح زندگی مُرتب

ہوتی ہے اُسے اعمال سے تعبیر کیا جاتا ہے صحت اور اصلیت قلب کی تہ میں ہے
اور جب اس میں تحریک پیدا ہوتی ہے تو اُس کا نشانہ قلب کی چاندماری پر جا لگتا
ہے اور وہاں سے کل دار و گیر شروع ہوتی ہے۔ اب سب سے پہلے یہ پتہ لگانا
چاہیئے کہ اصلیت یا صحت اپنی ذات میں ہے کیا شئے اور جب اُسی کے متحرک
ہونے سے دنیا میں ہر عمدگی اور خوبی کا وجود ہے تو وہ ذرائع کیا ہیں۔ جن سے
وہ تحریک میں آسکتی ہے +

ساری دنیا کی جان بلکہ جان کی بھی جان۔ ہر سطح کا عمق بلکہ عمق کی تہ ایک
ذات واحد ہے جس میں وہ کل جوہر مضمر ہیں جو عالم عرض وسبب میں ظہور پذیر
ہوکر آفرینش و بقا و فناء کائنات کے قواعد کا کلیہ ہیں۔ ذات ہر شئے میں
ساری و طاری ہے اور انسان جو بدرجہ اکمل مظہر ذات ہے صرف اسی وجہ
سے ان سب اسباب پر قادر ہے جو ذات کے جلو میں کام کرتے ہیں۔ انہی
اسباب کو آفرینش و بقا و فنا کائنات کے قواعد کا کلیہ کہنا چاہیئے اور انہی
کی مکمل فہرست بنانا انکو اچھی طرح سمجھ لینا اور ان کا رخ دیکھکر کام کرنا انسان
کو اشرف المخلوقات کے لقب کا مستحق کرتا ہے۔ اگر ذات یکتا و یکساں نہ
ہوتی تو دنیا میں کوئی کلیہ قایم نہ ہوسکتا۔ سوسائٹیوں اور افراد میں یکتائی
اور یکسانیت کا خیال ہی نہ پیدا ہوتا اگر ذات معطل محض ہوتی اور اُس کے
جلوس متذکرہ بالا اسباب نہ ہوتے تو کوئی شخصی زندگی اس سے
گرمی پاکر نشو و نما نہ پکڑ سکتی کل عالم میں یہ چلت پھرت
نہ ہوتی اور ایک ایسی حالت ہوتی جسے سکون محض کہنا چاہیئے
یہ حالت باعتبار مشاہدہ بھی محال ہے اور یہ بات کہ انسان
ترقی کرتا ہے اس بات کا ثبوت ہے کہ ذات متصرف ہے اور ذات کا متصرف

ہونا انسان کے لئے ترقی کو لازمی کرتا ہے وہ اس کا ۔

اس بیان سے معلوم ہوا کہ اصلیت یا صحت ذات ہے اور اس کی تحریک اولے الترقی ہے جو انسان کا ایمان ہے ۔ نیز یہ کہ ترقی کا مرکز انسان میں ہے نہ کہ اُس سے باہر ۔

کہیں تجھ کو نہ پایا گرچہ ہم نے اک جہاں ڈھونڈا
پھر آخر دل ہی میں دیکھا بغل ہی میں سے تو نکلا

اس کے بعد اُن اسباب کی توضیح ہونی چاہئے جو نظام عالم کے کلئے ہیں اور یہ دیکھنا چاہئے کہ خود انسان میں کیا کیا قوے ہیں جو ان اسباب سے دست و گریباں ہو سکتے ہیں ۔ اسباب کو ڈھونڈنا اور ان پر تسلط کرنے کے قابل جو قوے ہیں اُن کو باہر نکال کر لانا صحیح مادہ کو تحریک میں لاتا ہی اس کام کو انجام دینے کا صرف یہی کامل ذریعہ ہے خلاصہ یہ ہوا کہ ترقی کرنا تو دین ایمان ہی ٹھہرا صرف یہ دیکھنا باقی ہے کہ کن کن باتوں میں ترقی کرنا ہی اور اُس کی ذرائع ہم میں کیا موجود ہیں ۔ کل کائنات کی بنا اور گویا آفرینش کی اصلی رمز محبت ہے اسی چاشنی سے یہ کل قوام تیار ہوا ہے ۔ اس دعوے کا بڑا ثبوت یہ ہے کہ شخصی زندگیوں میں بمقابلہ اور اجزا کے یہ جزو بہت زیادہ عام اور دخیل ہے ۔ بنیاد اس کل تماشا گاہ کی محبت ہے ۔ اس کے قیام میں عدل کا تصرف ہے اور یہی وجہ ہے کہ ہر جاندار نا واجب سختی سے گریز کرتا ہی اور غلام تک اپنے دل میں عدل کا اُمیدوار ہوتا ہے اس نئے قیام کے لئے ہمت کا ضامن دیا گیا ہے اور کن فیکون سے لیکر آجتک بغیر صرف ہمت کی کوئی گاڑی نہیں چلی اور نہ آئندہ چلے ۔ محبت ۔ عدل اور ہمت نظام عالم کے اصلی اور زبردست کلئے قرار دئے جا سکتے ہیں باقی جو کچھ ہے وہ اُن کی فروعات

ہیں اور ہر صاحب ایمان یعنی ترقی کرنے والے انسان کا فرض ہے کہ ان اجزاء کے عمل کو محسوس کرے اور خیالات پر انکا پورا اثر لے۔ با عتبار اس کے کہ یہ قواعد عالمگیر ہیں ہر زندگی ان سے یکساں متاثر ہوتی ہے اور جہاں کہیں نتیجہ برعکس دکھائی دیتا ہے ضرور ہے کہ کچھ موانعات ایسے حائل ہوں جو ان کے اثر کو باطناً محسوس نہیں ہونے دیتے۔ ان اجزا کی کارپردازی کو بدرجہ اکمل اور بے حجاب اپنے میں دیکھنا اور رشتہ ان کا اپنے منبع یعنے بحر ذات سے ہے اسی بے کم و کاست پہچان لینا اعلےٰ مقصد حیات ہے۔ عالم اندرونی میں یہ اجزاء ایمان۔ عقائد خیالات اور ارادوں کے لباس میں جلوہ گر رہتے ہیں عالم بیرونی میں بھی اور صرف یہی اپنے اپنے موقع اور محل پر عملاً ظہور پذیر ہوتے ہیں۔ بہر حال خلوت اور جلوت دونوں میں انہی کا تصرف ہے اور چونکہ یہ خود ذات سے قوت پذیر ہیں اس لئے ھُوَ الظَّاھِرُ وَالْبَاطِنُ دین و ایمان ٹھہرا[ا]

ہمارا ترقی کرنا یہی ہے کہ ہم میں محبت بڑھے۔ عدل دستور العمل بنے اور ہمت ہر وقت ہماری سربراہی کرتی رہے۔ جہانتک انکا تعلق ہم سے اندرونی طور پر ہے ہم ان کے معاملہ میں قوائے باطنی سے کام لیں اور جہاں یہ بیرونی شائبہ زندگی سے وابستہ ہیں وہاں قوائے ظاہری سے ان کا عمل درآمد کیا جائے اس بارہ میں کامیاب ہونے کے ذرائع ہم میں یہ موجود ہیں کہ سب سے پہلے تو یہی ہمارا ایمان ہے کہ ہم ترقی کے موضوع اصلی ہیں اور مبدء فیاض جس کے پرتو فیض سے محبت عدل اور ہمت قائم ہیں ہمارے لئے بنا بنایا آئڈیل[ا] زندگی کا موجود ہے بلکہ وہ آئڈیل خود

ا۔ یہ لفظ ان انگریزی الفاظ میں سے ہے جن کا اردو میں صحیح ترجمہ ہونا قریباً محال ہے۔ اس کا مفہوم ہے مقصد اعلےٰ ۱۲ +

خود ہماری زندگیوں میں جلوہ گر ہے۔ ہمیں بنحوائے اِنّی جَاعِلٌ فِی الْاَرْضِ خَلِیْفَۃً
صرف اسے بدرجہ اولیٰ اظہور میں لانا ہے اس اندرونی یقین کے بعد صرف یہ کرنا
باقی ہے کہ آئیڈیل کو جس قدر زیادہ ہو سکے سامنے رکھیں۔ وہ خود دل میں
ایک کر یدلی پیدا کر دیگا جس کا نتیجہ یہ ہو گا کہ ترقی کے اسباب خارجی بھی سب
مہیا ہو جائینگے +

یہانتک تو اصُولی بحث تھی۔ اب ہم ذرا بدیہات میں آکر یہ بیان
کرنا چاہتے ہیں کہ ہم مسلمانانِ ہند کو محبت۔ عدل اور ہمت کی کس طرح جلا کرنی چاہئے
اور زمانہ کی رفتار اور ضرورت کے موافق اُن سے کیا کام لینا چاہئے۔ ہماری
جو موجودہ حالت ہے اور جس میں بین ترقی نہ ہونے سے خدا کی زمین و آسمان
ہم پر تنگ ہوتے نظر آتے ہیں۔ ضرور فطرت کے مقررہ قواعد کے تحت میں
ہے انہی قواعد کی رو سے ہم پستی میں ہیں انہی قواعد کے موافق ہم ترقی
کر سکتے ہیں ہمارا تنزل اس وجہ سے ہے کہ ہم نے فطرت کے عالمگیر قواعد
کے خلاف کارروائی کی محبتوں کو منتشر اور ضعیف کر دیا عدل سے مُنہ موڑ لیا
اور ہمت کو زنانہ لباس پہنا دیا۔ ترقی کرنے کی یہی صورت ممکن ہو کہ محبتوں
کو مجتمع کر کے اصلاح قوم کی جانب رجوع کریں۔ عدل کی تعمیل میں حقوق اللہ
وحقوق العباد کو پہچانیں اور اس کے موافق عملدرآمد کریں اور سب سے
بڑھکر ہمت اور بلند حوصلگی کی ہر اُس رَگ کو جو ہم میں ہے متحرک کر کے
فلاح اور بہبُود قوم میں صرف کریں۔ میری رائے میں ہر مسلمان کو تجدید ایمان
کرنا چاہئے۔ اگر ابتک کسی نے یہ سمجھ رکھا ہے کہ تھوڑی سی حسب عادت
اور مثل ایک کل کے عبادت کر لینا اور ہر طرف سے آنکھیں بند کر کے پستی کی
حالت میں پڑا رہنا نجات کے لئے کافی ہے۔ اور خدا اور اُس کا رسول ہم سے

راضی ہے تو جہانتک جلد ممکن ہو اس مغالطے سے اپنے آپ کو نکالنا چاہیے
ہم دکھا چکے ہیں کہ انسانی فرض منصبی ترقی کرنا ہے ہر مسلمان کو اسپر ایمان لانا
چاہیئے کہ میں اسی صورت میں نجات کا مستحق ہوں جب میں حسب منشاء خدا و رسول
ترقی کروں۔ ایک زمانہ وہ تھا کہ خدا اور رسول کی خوشنودی کے لئے مسلمانوں
کو ترقی حاصل کرنے کے رستہ میں جانیں دینی پڑتی تھیں۔ مال لٹانے پڑتے
تھے بے گھر۔ بے در ہونا پڑتا تھا۔ اللہ کا احسان ہے کہ ہم مسلمانان ہند کو ان
سخت آزمایشوں میں سے ایک کا بھی سامنا نہیں کرنا ہے۔ ہمایں تو گنی
چنی یہ دو تین باتیں کرنی ہیں کہ دل سے خدا اور رسول کی خوشنودی اپنی
اصلاح حال میں تسلیم کرکے۔ گورنمنٹ کی وفاداری۔ ترقی تعلیم۔ تحفظ قوی
اور کفائت شعاری پر ٹوٹ پڑنا چاہیے۔ صرف محبت کے لئے ہمارے سامنے
ایک بڑا وسیع میدان غریب بیکس ناسمجھ جاہل مسلمانوں کا ہے۔ تھوڑی سی
توجہ۔ خدا ترسی اور منکسر المزاجی سے ہمیں ان کے ساتھ محبت اور ہمدردی
پیدا ہو سکتی ہے۔ تصویریں تو پہلے مسلمانوں میں ہوتی نہ تھیں اور ہوتی بھی
تھیں تو خال خال۔ مگر خدا کے ناموں۔ اچھے اقوال پاکیزہ اشعار وغیرہ کے
طغرے اور قطعات اکثر ذی استطاعت لوگوں کے کمروں میں لگے ہوئے
ہوتے تھے۔ مطلب یہ تھا کہ وہ چیزیں وقتاً فوقتاً نیکی کی طرف مائل کرتی
رہیں۔ اب جو زمانہ کی ضرورت کے موافق ہماری نیکیوں کی فہرست از سر نو
مرتب ہوئی ہے تو ہمیں چاہیئے کہ اُس فہرست کو مختلف صورتوں میں اپنی
پیش نظر رکھیں۔ قطعوں میں۔ طغروں میں سادی تحریروں میں۔ تصویروں
میں الغرض جس طرح ہو سکے وہ فہرست ہماری آنکھوں کے سامنے رہے
کہیں یتیموں کی طرف متوجہ کرنے کا کوئی سامان ہو کہیں قوم کے جہل و

وتعصب کا رونا دل نرم کرنے کے لئے موجود ہو۔ کہیں فضول خرچی کی ڈراؤنی صورت دل دہلا دے۔ کہیں بے دینی کا مرقع خون کے آنسو رلا دے دیکھیں کب تک اثر نہیں ہوتا۔ بادی النظر میں اس بات پر ہنسی آئیگی مگر ہے کرنے کی بات اور اصلاح قلب کے مسلّم طریقوں میں سے ایک طریقہ ہے۔ میں صرف ذرا نیا رنگ دیکر عرض کرتا ہوں۔ وہ یہ ہے کہ بعض اوقات خالی الذہن ہو کر اور اکیلے میں بیٹھ کر قلب کی طرف متوجہ ہو کر "ترقی تعلیم تحفظ قوائے" "کفائت شعاری" وغیرہ وغیرہ الفاظ کا ورد کرنا چاہیئے تھوڑے عرصہ کے بعد اپنی عادت کے موافق دل اور چیزوں کو خود اپنے میں جگہ دے لیگا اور جب ایک دفعہ دل میں بس گئیں تو پھر ظہور میں آنا مشکل ہے ایک بڑی عمدہ ترکیب دماغ وقلب کو صحیح رکھنے اور صحیح کاموں کی طرف متوجہ کرنے کی یہ ہے کہ عمدہ چیزوں۔ عمدہ کاموں۔ عمدہ لوگوں کی تعریف اکثر کرتے رہنا چاہیئے۔ اس ترکیب کا سریع التاثیر ہونا اور اُس کے فوائد دو چار ہی دن کے تجربہ سے واضح ہو سکتے ہیں فرض کیجئے کہ صبح کے وقت ایک شخص نے پندرہ منٹ یا آدھ گھنٹہ کسی اچھی چیز۔ اچھی بات یا اچھے کام کی تعریف میں گذارا اور بعد میں اپنے معمولی دنیاوی مشاغل میں مصروف ہو گیا تو تقریباً چھ سات گھنٹہ کے بعد اس پر خود بخود پندرہ بیس منٹ کے لئے ایسی حالت طاری ہو گی جس میں وہ اپنے آپ کو بہت سی قیود سے آزاد سمجھے گا اور ترقی کرنے کے لئے مستعد و تیار پائیگا۔ برعکس اس کے اگر کسی بُری اور نفرت انگیز چیز کے متعلق وقت صرف کیا ہے اور بیزاری اور غصہ پیدا ہوا ہے تو وہی سات آٹھ گھنٹے کے بعد پستی کا ایک حملہ ہو گا جس میں وہ شخص اپنے تئیں بہت سی باتوں سے مجبور، مظلوم اور مقید تصور

کریگا اور یہ سب ترقی کے دشمن جانی ہیں ان عملی تجاویز سے جو صرف ذریعہ قوائے اندرونی ہم کام میں لاسکتے ہیں۔ بہت سے ایسے موانع دُور ہوجائینگے جو ہمیں پشت ہمت کرتے ہیں اور طائر ترقی بہت کچھ بلند پروازی کرنے لگے گا۔ زندگی میں عملی پاکیزگی پیدا کرنے کی ایک اندرونی تدبیر یہ ہے کہ ماں بہن بیٹی یا مثل ان کے متبرکات کا خیال اکثر دل میں رکھنا چاہیئے اور اُن کے حق میں دعا کرنی چاہیئے۔ دعا کے معنے ہیں قلب کو متحرک کرنا کسی ضروری خیال کے متعلق آپ یہی دعا کیا کیجیے کہ یا اللہ ہمیں تعلیم سے بہرہ ور کر جس قدر باطن میں متفکل ہوکر دعا مانگیئے گا اُسیقدر قلب اس سے متاثر اور چاشنی یاب ہوگا۔ اور اس پر ملمع چڑھا اور عمل کی توفیق ہوئی۔ صحت کے لیئے احتیاطیں۔ غذائیں دوائیں حسب ضرورت ہر شخص استعمال کرتا ہے مگر ایک ہلکا سا نسخہ ہم بتائیں۔ اگر ماء اللحم انگوری دو آتشہ کا کام نہ دے تو جبھی کہنا۔ ہنسکر نہ ٹال لیئے اور صرف آٹھ دس دن استعمال کرکے دیکھیئے وہ یہ ہے کہ کھانے سے ۵ منٹ بعد تک طبیعت کا رُخ عبادت آمیز رکھیئے اور ایک شکر گذاری کی کیفیت اپنے اوپر طاری رکھیئے۔ پھر دیکھیئے کہ دل و دماغ کیا جلا پاتا ہے اور صحت کیسی عمدہ رہتی ہے۔ اول اول ان مشقوں کا کرنا ذرا شاق اور بے پھل معلوم ہوتا ہے مگر تھوڑے ہی دنوں کے بعد اُن سے فیضیاب ہوکر زبانِ حال سے یہ شعر نکلتا ہے۔

ے سالہا دل طلبِ جامِ جم از ما میکرد + آنچہ خود داشت ز بیگانہ تمنا میکرد + ہمیں سب کچھ معلوم ہے اپنی پستی معلوم ہے اوروں کی ترقی معلوم ہے۔ مذہب کے برکات سے واقف ہیں۔ گورنمنٹ کی احسانات

سے دن رات فیضیاب ہوتے ہیں اور جانتے ہیں کہ ہمیں کن چیزوں کی ضرورت ہے اور ان کے حاصل کرنے کے کیا قواعد ہیں کمی صرف اس بات کی ہے کہ ہماری عملی قوت اس قدر نہیں جس قدر ہونی چاہیے - ایک ترکیب تو عملی قوت کے بڑھانے کی یہ ہے کہ تقریروں - لکچروں اور مضامین سے قوم کو جگایا جاوے - یہ جب سے شروع ہوا قوم دن بدن سنبھلتی جاتی ہے - میری ساری کوشش اس مضمون میں اس بات کے پیش کرنے کی ہے کہ اندرونی قوائے عملیہ کی طرف بھی توجہ کرنی چاہئے فرض کیجیے کہ ایک شخص کے خیالات منتشر رہتے ہیں اور وہ کوئی اچھا کام جس کے لئے یکسوئی درکار ہے نہیں کر سکتا - ہم اُسے ایک کتاب پڑھاتے ہیں جسمیں انتشار کی برائیاں - یکسوئی کی تعریفیں وغیرہ لکھی ہوئی ہیں لکچر سناتے ہیں - ترغیب دلاتے ہیں ان لوگوں کی مثالیں پیش کرتے ہیں جن کو انتشار سے نقصان پہنچا اور جو یکسوئی کی بدولت فائز المرام ہوئے - ان سب کوششوں سے ہم اس میں ایک جھرجھری پیدا کرتے ہیں - اور ایک حد تک کامیاب بھی ہوتے ہیں - ان کو ہم بیرونی تدابیر سے تعبیر کرتے ہیں - اب انتشار رفع کرنے اور یکسوئی پیدا کرنے کیلئے اندرونی ذرائع بھی ہیں جو ان بیرونی تدابیر سے مستغنی ہیں اور ان سے بدرجہا زیادہ سریع الاثر - ہم اسی آدمی کو فوراً چند ضروری قواعد روزمرہ کی زندگی کے بتاتے ہیں اور یہ کہ وہ اپنے اندرونی قوائے سے کام لے - دن رات میں صبح و شام مگر زیادہ تر صبح کا وقت نیچر کے سکون کی حالت میں ہونے کا ہوتا ہے ایسے وقت میں اس شخص کو چاہئے کہ تنہائی میں تھوڑی دیر بیٹھ کر خاموشی کے ساتھ - کوئی ایک لفظ ایک

فقرہ ایک خیال لیکر اس پر غور کرے اور پھر چھوڑ کر اپنے اور کاموں
میں مصروف ہو۔ پھر دوسرے روز ایسا ہی کرے۔ اور اسی طرح چند روز
کرتا رہے۔ یکسوئی کی عادت ہو جائیگی۔ محض مبتدی کے لیے سب
سے آسان ترکیب یہ ہے کہ سانس کی ضربوں کو گنے سانس ایک
ہلکی سی ضرب نیچے دیتا ہے ایک اوپر۔ ان کی طرف توجہ کرے۔
رفتہ رفتہ یکسوئی پیدا ہو جائیگی۔ ان تفکرات۔ تخیلات اور مشقیات
کا ایک مستقل فن ہے اور اس کے سیکھنے سے آدمی بجائے غلام ہونے
کے اپنا آقا ہو سکتا ہے آدمی آدمی بن سکتا ہے۔ ہمارے ہاں تھا
مگر اب مُردہ ہے۔ امریکہ میں آج لاکھوں آدمی اسے عمل میں لا رہے
ہیں اور ترقی کی کوئی منزل انہیں دشوار گذار نہیں معلوم ہوتی۔ اس
کی تائید میں ایک ذاتی واقعہ عرض کرتا ہوں۔ امریکہ کے ایک لائق
اہل دل ڈاکٹر کولس ٹرنبل صاحب جو فلسفہ اور طبعیات میں ید طولیٰ
رکھتے ہیں اور وہاں کے کئی اضلاع کے مقتدا مانے جاتے ہیں۔
کئی سال ہوئے ہندوستان میں تشریف لائے تھے۔ نینی تال
آئے تو میں بھی ان کی خدمت میں حاضر ہوا۔ دس بیس ہندو مسلمان
اور بھی موجود تھے یہ ذکر شروع ہوا کہ ہندوستان میں قومی محبت بہت
کم ہے انہوں نے کہا کہ میں اس کی اندرونی عملی تدبیر بتاؤں گا۔ دوسرے
دن شام کے وقت ہم سب کو ایک علیحدہ جگہ لے گئے حلقہ کیا یعنے
سامنے آپ بیٹھے اور گرد و پیش ہم سب کو بٹھایا۔ آنکھیں بند کرائیں
اور کہا کہ قلب کی طرف متوجہ ہو کر یہ تصور کرو کہ ہم میں سے ایک درخت
پیدا ہو کر کل عالم پر سایہ کرتا ہے۔ کوئی دس منٹ تک ہم لوگوں نے ایسا کیا

کبھی کبھی طبیعت بٹ بھی جاتی تھی مگر ایک عجیب سرور معلوم ہوا اور انکے جانے کے بعد بھی فرداً فرداً ہم میں سے بعض نے ایسی نشستیں کیں اور قوائے اندرونی کے جلا سے اپنے میں بمقابلہ پہلے کے ہمت اور ہمدردی وغیرہ کے مادہ کو زیادہ پایا۔ جو لوگ اپنے لئے قوم کے لئے۔ ملک کے لئے۔ مذہب کے لئے کچھ کرنا چاہتے ہیں وہ ضرور اس فن کی طرف توجہ کریں۔ اوّل اول مبتدی کو غذا کا اعتدال بھی نہائت مفید ہوتا ہے ان غذاؤں۔ صحبتوں اور مشاغل سے جو بے اعتدالیوں کی طرف لیجاتی ہیں چندے بچنا چاہیے۔ اعتدال خود انسان میں موجود ہے جہاں ان معتدلات کو قابو میں کیا اور اندرونی جوہر چمکنے لگے۔ پھر دیکھئے زندگی کا غبارہ کتنا اونچا جاتا ہے +

حسن اتفاق اور خوبی تقدیر سے مذہباً ہمیں خدا ایسا مکمل اور ہر قوت کا خزانہ بتایا گیا ہے۔ کہ اپنے تصورات تفکرات اور تخیلات میں ہم اپنی ہر ضرورت کے واسطے اور تمام قوائے اندرونی کو جلا دینے کے لئے خدا کی طرف رجوع کر سکتے ہیں اگر محبت کے مادہ کو جلا دینی ہے تو خدا سے زیادہ سرچشمہ محبت کا اور کون ہو سکتا ہے۔ عدل کے خیال کو پکانے کے لئے اس سے بہتر اور کون ملیگا۔ ہمت کی کلید سوائے اس کے اور کس سے مل سکتی ہے۔ الغرض جس قدر زیادہ ہم اپنے میں خدا کا ایر پھیر رکھینگے اور خیالات الفاظ اور دعائیں مناسب ضرورت معیّن کر کے سرچشمۂ حیات یعنے ذات باری کی طرف توجہ کرینگے اسیقدر زیادہ ہماری زندگیاں سوسائٹی کے لئے مفید ثابت ہونگی۔ یہ کام آسان بھی ہے۔ مشکل بھی ہے +

فاصلہ کوچۂ محبوب کا کیا پوچھتے ہو — جیسا مشتاق ہو نزدیک بھی ہے دور بھی ہے

عادت کا اثر - عادت فطرت انسانی کا ایک نہائت پیچیدہ قانون ہے کبھی ہمارے لئے باعثِ قوت ہے اور کبھی باعث ضعف اگر ایک رستہ سے انسان ایک دفعہ سب چیزوں کو بغور دیکھتا ہوا گذرے اور منزل مقصود پر کامیابی کے ساتھ پہنچ جائے تو دوسری دفعہ اُس طرف گذرتے ہوئے قدم خود بخود اسی راہ کی طرف کھنچے جاتے ہیں۔ اور اپنے پہلے نقش قدم پر چلنا کسی اور رستہ سے آسان معلوم ہوتا ہے۔ اس قانونِ عادت اور ایک دوسرے ایسے ہی زبردست قانون - قانونِ تقلید پر ہمارے اخلاق کی بنیاد ہے - یہ دونوں خاصیتیں ہم میں ہر وقت ظہور پذیر ہوتی ہیں - اِن کے ذریعہ سے ہم کام کرتے اور کام سیکھتے ہیں اور یہی علم اور عمل کی محرک ہیں +

سرکاری اور دوسرے باغوں میں جن میں جانے کی عوام کو اجازت ہو۔ عموماً لکھا ہوتا ہے "پھولوں کو توڑنا منع ہے" مجھے ایک باغ کی سیر کا اتفاق ہوا۔ جس کے ہر درخت پر بوٹے پر پھل - ہر پھول - بلکہ ہر پتے پر لکھا ہوا تھا - کہ "چھونا منع ہے" - مگر یہ ہدائت ایسے حروف میں لکھی ہوئی تھی جنہیں صرف باغ کے مالک کی نگاہِ جزو رس ہی پہچانتی تھی اور

معمولی ظاہر بیں آنکھ اُن حروف کی شناخت نہیں رکھتی تھی۔ اس لئے باغ کے مالک اور اُس کے چند رفقا میں جنہیں وہ سیر کرانے ہمراہ لے گیا تھا۔ ایک اندرونی کشمکش جاری تھی۔ باغ میں ایک طرف پھولوں کا تختہ اس بات پر خندہ زن تھا۔ کہ وہ یہاں اہل تطاول کے ہاتھ سے محفوظ ہے۔ مگر کہیں کہیں کوئی شرارت پسند غنچہ مسکرا کر اہل نظر کو اپنی جانب بلا رہا تھا۔ اور آہستہ سے چٹک کر یہ اشارہ کرتا تھا۔ کہ اب اگر مجھے چن لو تو وقت ہے۔ کل دھوپ کے اثر سے اسی شاخ پر سوکھ کے رہ جاؤں گا اور میری رنگینی بغیر قدردان کے ہاتھ تک پہنچنے کے بیرنگی سے بدل جائیگی۔ دوسری طرف پکے پکے میوے جن سے شاخیں جھکی پڑتی تھیں۔ آنے والوں کو فرشی سلام کر کے یہ پیام دیتے تھے۔ کہ کیا ہم اسی لئے ہیں کہ کوئی زردوست دوکاندار توڑ کر دمڑی دمڑی دھیلے دھیلے کے واسطے سر بازار لے جائے اور کیا ہماری قسمت میں یہ نہیں کہ کوئی صاحب شناخت شوق کے ہاتھوں سے ہمیں توڑے ذوق کے لبوں سے چکھے۔ اور دلی فرحت حاصل کرے تاکہ ہمیں اپنی زندگی کا مقصد اعلےٰ حاصل ہو۔ ان اشاروں کنایوں کو سمجھ کر سیر کرنے والوں کے دل میں ہاتھ بڑھانے کا شوق بے اختیار گدگدی کرتا تھا اور اُن کی للچائی ہوئی نگاہیں گل و ثمر دونوں کو یقین دلاتی تھیں کہ تمہاری کشش بے سود نہ جائیگی۔ اور تمہاری ایسی قدر کی جائیگی۔ جس کے تم مستحق ہو۔ مگر جب کبھی یہ نگاہیں باغ کے مالک کی نگاہ سے دور ہو جاتی تھیں۔ تو جانبین حُسن سے رہ جاتے تھے۔ مالک کا دل تھا کہ دہل رہا تھا۔ کہ مبادا یہ ہاتھ پھیلا بیٹھیں اور روکنا بہ تقاضائے الفتِ قدیم دشوار ہو جائے اور اُس کے رفقا اس کی آنکھ سے ممانعت کا حکم پاتے تھے اور اُس کے لبوں کی

جنبش سے یہ خیال کرتے تھے کہ بغیر صاف آواز نکالنے کے یہ کہہ رہے ہیں
کہ چھونا منع ہے۔" اس کشمکش سے گھبرا کر مالک ایک درخت کی طرف بھاگا
اور اُس کے ہمراہیوں کو یہ یقین ہُوا۔ کہ کچھ آتا ہے۔ میوے کے ایک پکتے
سے دانہ پر اُس کا ہاتھ پہنچا اور رفقا کے مُنہہ میں پانی بھر آیا۔ مگر اُن کے
دیکھتے دیکھتے مالک کا رنگِ رُخ بدلا۔ اُس کی فیاضی میں اور چھونا منع ہے۔"
کے اصول کی پابندی میں اندر ہی اندر لڑائی شروع ہو ئی۔ آخر فیاضی مغلوب
ہوئی۔ اب وہان سے ہٹ آئیں تو کس تدبیر سے۔ میوہ کی نبض دیکھنے لگے۔
یعنی دو انگلیاں اس کے ایک حصہ پر اس طرح رکھیں جیسے کوئی طبیب کسی
بیمار کی نبض دیکھتا ہو۔ ذرا میوہ کو دبایا اور بآواز بلند کہا "جتنے تیار دانے
تھے کمبخت سب توڑ لے گئے ہیں۔ اب یہ رہ گئے ہیں دو چار دن میں
کھانے کے لائق ہونگے۔" معلوم نہیں "لے گئے" کی ضمیر کن کمبختوں کی طرف
راجع تھی۔ گو سُننے والوں کا خیال تھا۔ کہ اس دشنام سے ہوا کے کانوں
کو ہی صدمہ پہنچا۔ در اصل اس کا مخاطب کوئی تھا نہیں۔ کیونکہ جیسا آگے
چل کر معلوم ہو گیا "چھُونا مت" وہ اصول تھا۔ جس سے باغ میں مالک
کے علم میں کبھی سرتابی نہیں کی گئی تھی۔ ہمارے سیر کرنے والے دوست چند
قدم آگے بڑھے۔ اُن میں ایک بہت کم سن بچہ تھا۔ اُسے وہاں کی حکمت عملیوں
کی کیا خبر تھی۔ اُس نے نادانستہ دست گستاخ ایک اور پھل کی طرف بڑھایا
مالک نے آگے بڑھکر نہایت ملائمت سے اُس کا ہاتھ تو روک لیا اور اپنے
دوستوں کو یوں محظوظ کرنا شروع کیا۔ "یہ آم کا بوٹا اپنی قسم کا ایک ہے ایک
ہزار کوس سے تو یہ منگوایا گیا ہے۔ جہان سے منگوایا گیا ہے۔ وہان بھی
ایک ہی بوٹا تھا۔ اور یہ بچہ فرمائش سے مہیا کیا گیا ہے اس کے آم لذت میں

نوجوانوں کے بڑے گروہ ایک جگہ جمع ہو کر کسی خاص شخص پر آوازے کستے ہیں جو اپنے کوٹھے پر بیٹھا ان کا جواب دیتا ہے ایک ایک گالی کو نہایت بلند آواز سے سو سو دفعہ دہرایا جاتا ہے اسی مشغلہ میں بعض اوقات ساری ساری رات گذر جاتی ہے جیسے گالیاں دیجاتی ہیں وہ خاموش رہنا اپنی ہتک سمجھتا ہے اور ہر چند اس کا گلا بیٹھ جاتا ہے اور اس کی آواز خستہ ہو جاتی ہے اور بے خوابی کی زحمت برداشت کرنی پڑتی ہے مگر وہ یہ بیغیرتی ہرگز گوارا نہیں کر سکتا کہ اس سے گالیوں کا جواب بن نہیں پڑا یہی حال بعض عورتوں کا ہے جنہوں نے زبانی لڑائی کو بیکاری کا ایک مشغلہ قرار دے رکھا ہے۔ بعض بدزبان عورتوں نے خوش مزاجی میں اس بات کا اقرار کیا ہے کہ لڑائی میں انہیں ایک قسم کا مزہ آتا ہے اور جب کئی دن تک وہ کسی سے دو بدو نہیں ہوتیں تو خواہ مخواہ کوئی بہانہ پیدا کر لیتی ہیں بلکہ ایک خاص فرقہ کی عورتوں کی نسبت مشہور ہے کہ جب انپر یہ جذبہ غالب آتا ہے تو وہ اپنی ہمسائی کو بلا کر لڑائی کی دعوت کرتی ہیں اور اس طرح ایک عظیم زبانی جنگ کی طرح ڈالدیتی ہیں۔ جو کئی کئی دن تک جاری رہتی ہے نئی نئی اور فی البدیہ گالیاں جو ان کا حاضر جواب دماغ ایجاد کرتا ہے ان کا دور دور کے گھروں میں چرچا ہوتا ہے اور ہمچشموں میں بہت تعریف ہوتی ہے۔

ہمارے ملک کی بعض اقوام میں بیاہ کے موقعہ پر جب دولہا والے برات لیکر آتے ہیں تو دلہن والے گھر کی عورتیں اپنے سمدھیوں کو اور برات والوں کو مقفی گالیاں دیتی ہیں جنہیں سٹھنیاں کہتی ہیں۔ اکثر فحش باتیں بے تکلفی سے کہی جاتی ہیں اور وہ عورتیں بھی جو عام طور پر بہت کم گو اور باحیا سمجھی جاتی ہیں اس رسم میں شامل ہوتی ہیں گویا وہ خاص موقعہ ان کو اس قبیح رسم کی اجازت

دے دیتا ہے اور ان کے مرد بھی اس سے اغماض کرتے ہیں بلکہ بعض خوش ہوتے ہیں +

بے معنی گالیوں کے ذکر میں اس مذموم عادت کا بیان کرنا شائید بیجا نہ ہوگا جو بدقسمتی سے ہندوستان کے لوگوں میں موجود ہے اور وہ یہ ہے کہ چھوٹی لڑکیوں کو پیار کے موقعہ پر ایسے الفاظ سے یاد کیا جاتا ہے جو دراصل نہائیت دل دکھانے والے ہوتے ہیں۔ حالانکہ یہ محض ایک عادت ہے اور ان کے کہنے والے ان لڑکیوں کو دل سے عزیز رکھتے ہیں اور جسوقت یہ الفاظ کہے جاتے ہیں باقی تمام حرکات نہائیت ہی مہربانی اور ناز برداری کے ہوتے ہیں مگر یہ نتیجہ ہے۔ اہل ہندوستان کے اس غلط اور خودغرضی کے خیال کا جس سے اُنہوں نے اپنے آپ کو اناث سے اس قدر بلند پایہ اور ان کا حاکم مطلق سمجھ رکھا ہے اور ان پر طرح طرح کی غلامی کی قیدیں لگا رکھی ہیں +

جو لوگ تعلیم کے زیور سے آراستہ ہوتے ہیں۔ اور جو اصلاح نفس اور اصلاح ابنائے جنس کے خواہاں ہیں۔ انہیں گالیوں سے قطعی پرہیز کرنا چاہئے زبان ہی انسان کی تہذیب کا پہلا معیار ہے اور گفتار کا اثر انسان کے افعال اور اخلاق پر ہوتا ہے۔ کبھی کوئی شخص مہذب نہیں بن سکتا جب تک اُس کی زبان مہذب نہ ہو۔ گالیاں بدتہذیبی کا نشان ہیں اور بے تہذیبی کی یادگار ہیں اور ہر ایک شخص کو کوشش کرنا چاہئے کہ وہ ان سے احتراز کرے اور اپنی اولاد کو ایسے لوگوں کی ہمنشینی سے بچائے جو دشنام دہی کے عادی ہیں گالیوں کی عادت نہ صرف انسان کو اخلاقی اور روحانی اصلاح سے باز رکھتی ہے بلکہ اچھی صحبت میں بیٹھنے کے ناقابل کر دیتی ہے اور خودداری اور غیرت کا مادہ دور کر دیتی ہے۔ اس لئے کہ جو دوسروں کو برا کہتا ہے وہ سنتا بھی

ضرور ہے۔ (بقول شاعر)

دہن خویش بدشنام میالائے صائب
کیں زرِ قلب بہرکس کہ دہی باز دہد

ویدک لٹریچر

ہندوؤں میں اول درجے کی کتاب آسمانی ویدؔ ہے۔ جدید سے جدید تحقیقات اہل یورپ کے رو سے یہ امر ثابت ہے کہ سب سے پرانا وید جس کو رِگ وید کہتے ہیں۔ اقلاً تین ہزار سے چار ہزار سال قبلِ مسیح میں مدوّن ہوا۔ مدوّن ہونے سے یہ مراد نہیں ہے۔ کہ وہ تحریر میں آیا۔ اس لئے کہ ہندوستان میں تحریر کے جاری ہونے کا زمانہ ایک مختلف فیہ مسئلہ ہے اور اس کی نسبت محققین کا اتفاق نہیں ہے لیکن تدوین سے مراد یہ ہے۔ کہ وید کے الفاظ بجنسہ جس حالت میں آج ہم تک پہنچے ہیں۔ اُس حالت میں وہ تین ہزار سال قبل مسیح موجود تھے اور اُس وقت سے اس وقت تک ان میں کسی قسم کا بیّن تغیر نہیں ہوا ہے اُس زمانے میں جو طریقہ تعلیم تھا۔ اس سے غرض یہ تھی کہ علم سینہ بسینہ اُستاد کو شاگرد سے پہنچے۔ بلکہ یہ کہنا چاہیئے کہ صرف ایک ہی طبقے کے اشخاص یعنے برہمنوں میں محدود رہے۔ برہمنوں کے بچوّں کا یہ فرض تھا۔ کہ بعد سن شعور کے وہ اپنی عمر کے بارہ سال تحصیل علم میں یعنے وید کے سیکھنے میں اور اس کو زبانی یاد کرنے میں صرف کریں۔

اس کے بعد زمانہ تاہل ہوتا تھا۔ جس میں وہ دنیاوی کاروبار میں مصروف ہوتے تھے۔ اور جس سے بہت بڑی غرض یہ بھی تھی۔ کہ وہ کسی بیٹے کے باپ ہوں۔ تاکہ بعد مرگ اُن کی نجات کی صورت نکلے اور تیسرا حصہ زندگانی کا عبادت اور مراقبے میں صرف ہوتا تھا۔ کہ وہ آبادی کو چھوڑ کر بن باشی ہو جاتے تھے۔ وہ محض عبادت اور تعلیم میں اپنے اوقات کو صرف کرتے تھے۔

اس کتاب آسمانی کے چار حصے ہیں۔ ان میں سب سے اوّل رگ وید ہے اور اس میں صرف دعائیں ہیں۔ اور مختلف دعاؤں کی تپشیا ہے۔ یہ دعائیں نظم میں ہیں۔ اور ان کی بحریں مخصوص ہیں۔ علاوہ اس کے ان دعاؤں کے پڑھنے کا ایک خاص طریقہ ہے۔ جس کو ہندوؤں کا علم تجوید کہا جا سکتا ہے۔ اور یہ علم اس قدر مشکل ہے کہ بلا اُستاد کے اُس کا حاصل کرنا محال ہے۔ رگ وید میں بالمجموع ایک ہزار اٹھائیس دعائیں ہیں۔ اور ان کو رگ وید کے جمع کرنے والوں نے دس کتابوں پر تقسیم کیا ہے۔ ہر ایک دعا کے شروع میں اُس رشی کا نام جس سے وہ منسوب ہے اور اُس دیوتا کا نام جس کی شان میں ہے اور اُس خاص بحر کا نام جس میں وہ لکھی گئی ہے۔ درج کیا جاتا ہے۔ اور ان چیزوں کا علم بجائے خود ایک شاخ وید کی تعلیم کی ہے۔ جس کو اصطلاح میں پراتیشا کھیا کہتے ہیں۔ رگ وید کی زبان بہت ہی قدیم سنسکرت ہے۔ اور فی الواقع اس کی صرف و نحو اور اس کی زبان کی صرف و نحو جس میں معمولی سنسکرت لٹریچر مثلاً نظمیں ناٹک۔ قصے۔ کہانی کی کتابیں۔ مہابھارت پران وغیرہ لکھے گئے ہیں۔ بالکل علیحدہ ہے۔ ایک عجیب امر یہ بھی ہے کہ ان دس کتابوں

ہیں سے بعض کی زبان زیادہ قدیم معلوم ہوتی ہے - اور صرف ونحو- طرز بیان - ترکیبِ الفاظ - قدامتِ لغات - ان سب امُور کے لحاظ سے محققین کی اب رائے یہ ہے کہ سب سے پُرانا حِصّہ رگ وید کا وہ ہے - جس کو ساتویں کتاب کہتے ہیں - اور دسویں کتاب سب سے جدید حِصّہ ہے +

اگرچہ رِگ وید کا بہت بڑا حِصّہ عبادت اور خدا کی ستائش سے بھرا ہوُا ہے - لیکن بعض بھجن ایسے ہیں کہ جن سے تاریخی واقعات اور قدیم آریاؤں کی تمدنی حالت کا استنباط ہو سکتا ہے - مثلاً ندیوں کا جو بھجن ہے - اُس سے آریہ لوگوں کا وسطِ ایشیا سے بہ تدریج پنجاب میں آنا معلوم ہوتا ہے اسی طرح دسویں کتاب کے بھجن نمبر نوّے میں جس کا نام پرُش سوکت ہے چاروں ذاتوں کا یعنے برہمن - کھتری - ویش - شودر کا علیحدہ ہونا معلوم ہوتا ہے - اسی طرح شادی اور موت کے متعلق بھجن ہیں غرض جدید تحقیقات سے نتیجہ یہی پیدا ہوتا ہے - کہ رِگ وید نہ صرف ہندوؤں کی بلکہ کل طبقہ آریہ کی جس میں ایران اور یورپ کی بہت سے اقوام شامل ہیں سب سے قدیم کتاب ہے +

رِگ وید کی زبان کی نسبت ایک امر اور بھی نہائت تعجّب انگیز ہے یعنے یہ زبان اشد درجے میں ژندوستا کی زبان سے مشابہ ہے - یہ مشابہت اِس درجے تک ہے - کہ محض چند حروف کے تغیر اور تبدّل سے رگ وید کے بعض بھجنوں کو ژند زبان میں اور ژندوستا کے بھجنوں کو قدیم سنسکرت میں تبدیل کر سکتے ہیں - اور اِس وقت جرمنی کے مدارس میں جہاں وید کی تعلیم اعلےٰ درجے پر ہے - رِگ وید اور ژندوستا کا سبق ساتھ ساتھ ہوتا ہے +

رگ وید کے بعد قدامت کے لحاظ سے سام وید ہے ۔لیکن سام وید کے بھجن الفاظ کے لحاظ سے بالکل رگ وید کے بھجن ہیں ۔ صرف اُن کے پڑھنے میں ایک خاص لحن بلحوظ رکھا جاتا ہے ۔ رگ وید اور سام وید دونوں دعائیہ ہیں اور تیسرا وید جس کو یجر وید کہتے ہیں اعمال کا وید ہے ۔ یعنے مختلف اوقات میں اور مختلف مواقع پر اور مختلف اغراض کے حاصل کرنے کے لئے جس قسم کے اعمال مفید اور بکار آمد ہیں ۔ ان کا بیان یجر وید میں ہے یجر وید کے دو شاگھا ہیں کرشن ۔ یجر وید اور شکل ۔ ان میں بہت کم فرق ہے اور ان کی تقسیم ایک ہی طرح پر ہے ۔ چوتھا وید اتھروَن ہے ۔ وضع اور ترکیب میں اتھروَن رگ وید سے ملتا ہوا ہے ۔ لیکن زبان کے لحاظ سے سب سے جدید معلوم ہوتا ہے ۔ اور اس میں زیادہ تر تعویذ اور گنڈے اور بھوت پریت کے دافع کرنے کی ترکیبیں اور جڑوں اور بوٹیوں کے خواص مذکور ہیں ۔ اور اس کے مطالعہ سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ اِس کا معتدبہ حصہ آریاؤں کے ہندوستان میں آنے کے بعد اور یہاں کے پُرانے باشندوں سے میل جول کے بعد مدون ہوا ہے +

ان چاروں ویدوں میں جو چیز مشترک ہے ۔ وہ یہ ہے کہ ان کے الفاظ تجوید سے پڑھے جاتے ہیں اور ہر ایک بول کا چڑھاؤ اور اُتار قدیم الایام سے مقرر ہے اور اس میں کسی قسم کی ترمیم یا تغیر کرنا گناہ عظیم سمجھا جاتا ہے ۔ اگرچہ بعض برہمنہ[۱] میں بھی اعراب اور آواز کی قید لگائی گئی ہے ۔ لیکن یہ امر شاذ ہے +

---

[۱] ۔ ہندوؤں کی مقدس کتابوں کی ایک دوسری شاخ ۱۲

ویدک لٹریچر کا دوسرا حصہ برہمنہ ہے اور چاروں ویدوں کے ساتھ کئی کئی برہمن منسوب ہیں۔ ان میں مختلف قسم کے اعمال اور عبادات کا طریقہ بیان کیا گیا ہے اور جا بجا قدیم قصص اور حکایات اور واقعات بھی درج ہیں مثلاً اتیریا برہمنہ میں جو رگ وید سے متعلق ہے۔ ہریش چندر کا قصہ ہے۔ اور اسی طرح شت پتھ برہمنہ میں جو شکل یجر وید سے متعلق ہے طوفان کا واقع اور منو کا ذکر مندرج ہے۔ انہی برہمنہ کے ساتھ ساتھ ایک اور قسم کے عبادتی رسالے ہیں۔ جن کو ارن نیگ یعنے جنگل اور بیابان میں لکھے ہوئے رسالے کہتے ہیں۔ ان برہمنہ اور ارن نیک کی زبان بھی قدیم ہے مگر اتنی پرانی نہیں۔ جتنی خود ویدوں کی۔ ان کے بعد درجہ اپنشد کا ہے۔ جس کو ویدانت یعنے وید کا ضمیمہ بھی کہتے ہیں۔ اور ان میں ہندوؤں کا سارا فلسفہ بھرا ہوا ہے۔ جس طرح برہمن اور ارن نیگ مختلف ویدوں سے منسوب ہیں۔ اسی طرح خاص خاص اپنشد بھی خاص خاص ویدوں کے ضمیمے سمجھے جاتے ہیں۔ ان اپنشدوں کی تعداد سو سے زیادہ ہے لیکن ان میں سے مشہور اور زیادہ متداول دس اپنشد ہیں۔

یہ ہے مختصر بیان ان کتابوں کا جن پر بطور عام لفظ وید کا اطلاق ہے ان کو سنسکرت میں شرتی کہتے ہیں۔ یعنے وہ چیز جو آنکھوں سے نہیں پڑھی گئی۔ نہ قلم سے لکھی گئی۔ بلکہ کانوں سے سنی گئی یہ گویا آواز غیبی ہے جس کو قدیم رشیوں نے سنا اور ان سے ان کے شاگردوں نے سنا اور اس طرح ان کا علم سینہ بسینہ ہزارہا سال کی مدت تک چلا آیا۔ اور بالآخر ہم تک پہنچا۔ ان کے مقابل میں ایک دوسرا بڑا ذخیرہ رسالوں کا ہے۔ جن کو سوتر یا اسمرتی کہتے ہیں۔ یعنے وہ چیز جو یاد کی جاتی ہے۔ یہ سوتر بھی

مختلف ویدوں پر منقسم ہیں۔ ان میں ہر ایک قسم کے مسائل کو جن کا تعلق مذہب سے ہے۔ یعنے اعمال اور عبادت روزمرہ کی زندگانی کی کریا کرم۔ شادی بیاہ موت وغیرہ نہائت اختصار کے ساتھ۔ بلکہ کہنا چاہیئے کہ پہیلی اور چیستاں کی صورت میں لایا گیا ہے اور ان سے غرض یہ ہے کہ یہ آسانی سے حفظ کر لئے جائیں اور ضرورت کے وقت کام میں لائے جائیں۔ ان کے سوا بھی چند علوم اور ہیں جن کا تعلق وید سے سمجھا جاتا ہے اور ان کو ویدانگ کہتے ہیں۔ یعنے وید کے ہاتھ پیر۔ ان میں صرف ونحو اور تجوید (سکھشا) اور عروض اور جوتش اور علم لغت ہے یہ وہ علم ہیں۔ جن کے بغیر وید کا تلفظ کرنا اور اُس کے معانی کا سمجھانا ناممکن ہے اور اسی وجہ سے اُن کو وید کے ہاتھ پیر کہتے ہیں +

اس بیان سے معلوم ہوگا۔ کہ بہت بڑا حصہ ویدک لٹریچر کا وہ ہے جو خاص برہمنوں کے لئے ہے اور بجز اُن کے یا اُس قسم کے طالب علموں کے جو صرف زبان کی تحقیق یا تمدن انسانی کی تاریخ کے لحاظ سے ہر ایک قوم کے قدیم لٹریچر پر نظر ڈالتے ہیں۔ عام طور پر دلچسپ نہیں ہے۔ لیکن وہ حصہ وید کا جسکو اپنشد کہتے ہیں اور جس میں ہندو فلسفہ جس کی قدامت اور باریکی اور خوبی تمام عالم میں مشہور ہے درج ہے۔ اس کے ساتھ ہر تعلیم یافتہ شخص کو۔ وہ کسی قوم اور کسی ملک کا کیوں نہ ہو۔ دلچسپی پیدا ہو سکتی ہے۔ اس لئے ہمارا قصد ہے کہ وقتاً فوقتاً بعض اپنشدوں کے ترجمے اس رسالے میں درج کریں۔ تاکہ ہندوؤں کے لٹریچر کی عظمت اور اُس کا عمق عام طور پر ظاہر ہو جائے +

طلسمِ خیال

پندرہ برس کی عمر میں مجھ کو اپنے وطن سے کوئی سو میل کے فاصلہ
پر ایک گاؤں میں رہنے کا اتفاق ہوا۔ اُس گاؤں میں پہنچکر اگلے دن
صبح کے وقت میں ٹہلتا ٹہلتا جنگل میں چلا گیا۔ ستمبر کا مہینہ تھا مگر
اس صبح میں گرمی اور روشنی ماہ جولائی کی صبح کی سی تھی۔ جنگل میں شاہ
بلوط کے درخت چند اخروٹ کے درختوں کے ساتھ ملے جلے کھڑے
تھے اور میرے سر پر اُن کا نہائیت گنجان سایہ تھا۔ زمین سخت اور
ناہموار تھی اور اس پر جھاڑیاں اور چھوٹے چھوٹے کم سن درختوں کے
جھنڈ چھائے ہوئے تھے اور صرف ڈنگروں کے رستے ہی ان جھاڑیوں
میں سے جاتے تھے۔ جس رستے اتفاق سے میں گیا وہ ایک شفاف
چشمے پر پہنچا جس کے کنارے پر ہری ہری گھاس کا حاشیہ تھا۔ اِس
گھاس میں صبح بہار کی سی شاداب سبزی تھی۔ چشمے پر شاہ بلوط کے
ایک بڑے تناور درخت کے تنے کا سائیہ تھا۔ سورج کی ایک کرن اکیلی
نیچے آئی اور پانی میں سنہری مچھلی کی طرح کھیلنے لگی +

بچپن ہی سے مجھے چشموں کے دیکھنے کا بڑا شوق رہا ہے۔ یہ پانی
ایک گول ظرف میں کھڑا تھا۔ یہ ظرف چھوٹا سا تھا مگر گہرا اِس کے اندر
پتھر جمے ہوئے تھے۔ بعض پتھر ہری ہری کائی سے ملبوس تھے بعض
بالکل برہنہ مگر طرح طرح کے رنگوں کے۔ سرخی مائل۔ سفید اور بھورے
تہ پر موٹا موٹا ریت تھا جو اُس اکیلی کرن کی روشنی میں چمکتا تھا اور چشمے

کو غیر مستعار روشنی سے منور کرتا تھا۔ ایک جگہ پانی کا اسنڈ نا ریت
کو سخت حرکت میں لاتا تھا لیکن اس طرح کہ چشمہ تاریک نہ ہوتا تھا اور
نہ اس کی سطح کی آئینہ دار صفائی میں فرق آتا تھا۔ مجھے ایسا خیال ہوا کہ
گویا کوئی زندہ مخلوق جو شاید اس چشمے کی پری ہو ایک حسین نوجوان نازنین
کے روپ میں پانی کی کائی کا باریک لباس پہنے ہوئے۔ قوس قزح
کے قطروں کی پیٹی لگائے ہوئے۔ اپنا بے مہر۔ معصوم۔ اور بے جذبہ
چہرہ دکھاتی ہوئی نکلنے کو ہے۔ اگر وہ ان پتھروں میں سے ایک پر بیٹھی
ہوئی اپنے گورے گورے پاؤں ننھی ننھی لہروں میں مارتی ہوئی اور پانی کو
اچھال کر دھوپ میں چمکاتی ہوئی نظر آئے تو دیکھنے والا مسرت اور
خوف سے کس قدر کانپے! جہاں کہیں وہ سبزے یا پھولوں پر اپنے ہاتھ
رکھے گی وہ فوراً شاداب ہو جائینگے گویا ان پر صبح کی شبنم پڑ گئی۔
پھر وہ ایک چتر گرہستن کی مانند کام میں مصروف ہو کر مرجھائے ہوئے
پتے۔ کائی دار لکڑی کے ٹکڑے پرانے شاہ بلوط کے پھل اور اناج
کے دانے جو ڈنگروں کے منہہ سے پانی پیتے پیتے گر گئے ہیں چشمے
سے نکال ڈالیگی حتیٰ کہ چمکتا ہوا ریت روشن پانی میں ہیروں کے خزانے
کی مانند دکھائی دینے لگے گا۔ لیکن اگر تماشائی بہت ہی قریب آجائیگا تو
اس کو صرف موسم گرما کے مینہہ کے قطرات ہی اس جگہ پڑے چمکتے ہوئے
ملینگے جہاں اس نے اس نازنین کو دیکھا تھا۔

جہاں اس شبنمی پری کو ہونا چاہئے تھا وہاں سبزے کے حاشئے پر لیٹ کر
میں آگے کو جھکا اور پانی کے آئینے میں دو آنکھیں میری آنکھوں سے
چار ہوئیں۔ یہ میری آنکھوں کا عکس تھا۔ میں نے پھر جو جھانکا تو ایک

اور چہرہ نظر آیا یہ میرے اپنے عکس سے پرے کو چشمے کی گہرائی میں تھا۔ سارا چہرہ صاف نظر آتا تھا اور تاہم خیال کی مانند دھندلا تھا۔ اس نظارہ کی شکل ایک سنہری گیسوؤں والی حسین نوجوان لڑکی کی سی تھی۔ اُس کی نگاہوں میں مسرت آمیز تبسّم کی جھلک تھی اور تمام دُھندلے چہرے پر اس تبسّم سے گڑھے پڑے جاتے تھے۔ یہاں تک کہ یہ خیال ہوتا تھا کہ اگر یہ چشمہ دھوپ میں فرطِ انبساط سے رقص کرنے لگے اور رقص کرتے کرتے ایک عورت کی شکل اختیار کر لے تو بالکل ایسی شکل ہو۔ رخساروں کی نفیس اور دُھندلی گلابی رنگت میں سے بھُورے بھُورے پتے۔ کائی وار شاخیں۔ شاہ بلوط کے پھل۔ اور چمکیلا ریت جھلک رہا تھا۔ وہ اکیلی کرن سنہری بالوں میں پھیلی ہوئی تھی اور پگل کر بالوں کی چمک بن جاتی تھی اور اُس خوبصورت سر کے گرد ایک ہالہ عظمت ڈالتی تھی۔ میں بیان نہیں کر سکتا کہ کیسے یکایک یہ چشمہ آباد ہو گیا اور کس قدر جلد ویران ہو گیا میں نے ایک سانس لیا تو وہ چہرہ موجود پایا۔ میں نے سانس روکا اور وہ چہرہ چل دیا۔ "ہیں! یہ غائب ہو گیا یا معدوم ہو گیا؟" مجھے یہاں تک شک ہو گیا کہ وہ چہرہ کبھی تھا بھی یا نہیں ٭

پیارے ناظرین! جہاں یہ نظارہ مجھے دکھائی دیا اور مجھ سے چھپ گیا وہاں میں نے کیا مزے سے خواب کے سے عالم میں ایک گھنٹہ صرف کیا! دیر تک بالکل بے حرکت اسی انتظار میں بیٹھا رہا کہ وہ صورت دوبارہ نظر آئے اور ڈر رہا تھا کہ مبادا ذرا سی حرکت یا میرے سانس کی جنبش اُس صورت کو آتے آتے ڈرا کر بھگا دے۔ اسی طرح میں اکثر کوئی دل کش خواب دیکھتا دیکھتا چونک اُٹھا ہوں اور پھر اس اُمید پر

خاموش رہا ہوں کہ شاید وہ خواب پھر آجائے۔ میں اس ہوائی وجود کی نوعیت اور صفات کے بارے میں بہت غور و خوض کرنے لگا۔ کیا میں ہی اسے عدم سے وجود میں لایا تھا؟ کیا یہ میرے خیال کی کرتوت تھی اور ان عجیب و غریب شکلوں کی قسم سے تھی جو بچوں کی آنکھوں کے پپوٹوں کے اندر آکر جھانکنے لگتی ہیں؟ کیا اس کا حسن مجھے لمحہ بھر خوش کر کے فنا ہو گیا؟ کیا یہ اس چشمے کے اندر کوئی پانی میں رہنے والی پری تھی یا جنگل کی دیوی تھی۔ جو میرے کاندھے پر سے میرے پیچھے کھڑی جھانک رہی تھی یا کسی ایسی دوشیزہ کا ہمزاد تھا جس سے کسی نے بیوفائی کی تھی اور وہ عشق کے ہاتھوں جان پر کھیل گئی اور ڈوب کر مر گئی؟ یا حقیقت میں ہی ایک پیاری لڑکی گرمجوش دل والی اور ایسے ہونٹوں والی جن کا چومنا احاطہ امکان سے خارج نہیں ہے۔ چپکے سے دبے پاؤں میرے پیچھے آکھڑی ہوئی تھی اور اپنا عکس چشمے میں ڈال رہی تھی؟ میں اسی انتظار میں بیٹھا دیکھتا رہا۔ لیکن پھر نظارہ دکھائی نہ دیا۔ میں اٹھ کر چلا آیا مگر مجھ پر کچھ ایسا جادو سا ہو گیا تھا کہ اسی روز سہ پہر کو میں اس چشمے پر پھر گیا۔ وہی پانی امنڈ رہا تھا وہی ریت چمک رہا تھا اور وہی سورج کی کرن ٹمٹما رہی تھی۔ وہاں وہ نظارہ نہ تھا۔ وہاں اس عزلت آباد کا راہب ایک بڑا سا مینڈک موجود تھا اور اس نے فوراً اپنی واعظانہ کھتھنی کو ہٹا لیا اور سوائے اپنی لمبی ٹانگوں کے سارے کا سارا ایک پتھر کے نیچے غائب ہو گیا۔ مجھے وہ شیطان کی صورت دکھائی دیتا تھا اور میں اسے یہ سمجھ کر مار بھی ڈالتا کہ یہ کوئی جادوگر ہے جو اس عجیب و غریب نازنین کو اس چشمے میں قید کئے ہوئے ہے +

افسوس اور غم کے عالم میں میں گاؤں کو واپس آ رہا تھا۔ میرے اور گرجا کے مینار کے درمیان ایک چھوٹی سی پہاڑی تھی۔ پہاڑی کی چوٹی پر درختوں کا ایک جھنڈ باقی تمام جنگل سے علیحدہ تھا۔ مغرب کیطرف کی کچھ روشنی ان درختوں پر بھی منڈلا رہی تھی اور مشرق کی طرف ان کا سایہ بھی اکیلا ہی پڑتا تھا۔ چونکہ دن بہت ڈھل گیا تھا دھوپ پر اُداسی سی چھائی ہوئی تھی اور سایہ کے چہرے پر بشاشت تھی عظمت اور تاریکی اس دھیمی روشنی میں ملی جلی تھی گویا کہ دن اور شام کے ہمزاد اُن درختوں کے نیچے دوستوں کی طرح آ ملے اور ایک دوسرے کو اپنا ہم جنس پایا میں نگاہِ تحسین سے اس نقشہ کو دیکھ ہی رہا تھا کہ شاہ بلوط کے درختوں کے جھنڈ کے پیچھے سے ایک نوجوان لڑکی کی شکل دکھائی دی۔ میرا دل اس کو پہچان گیا۔ یہ وہی نظارہ تھا۔ لیکن وہ اس قدر دور اور ہوائی۔ اِس دنیا سے اس قدر نرالی۔ اور جس جگہ وہ کھڑی تھی اس جگہ کی اُداس عظمت سے اس قدر بہرہ ور معلوم ہوتی تھی کہ میرا دل پہلے سے بھی زیادہ اُداس ہو کر بجھ گیا۔ یہی خیال آیا کہ اس تک کیونکر میری رسائی ہو سکتی ہے؟ +

میری نظر ادھر محوِ تماشا تھی کہ یکایک اُن درختوں کے پتّوں پر ٹپ ٹپ بارش ہونے لگی۔ ایک دم میں ہوا روشنی سے معمور ہو گئی۔ مینہ کی ہر ایک بوندمیں برستے ہوئے دھوپ کا کچھ حصہ منعکس ہوا۔ اور یہ تمام باریک باریک بارش دُھندسی معلوم ہونے لگی جس میں صرف اسی قدر سکت تھی کہ روشنی کے بوجھ کو برداشت کر لے ہوا میں قوس قزح نمودار ہوئی۔ اس کا رنگ اس قدر شوخ تھا جیسا آبشار نیاگرا

کی قوسِ قزح کا ہوتا ہے۔ اس کا جنوبی سرا ان درختوں کے آگے اگر زمین کو چھوتا تھا۔ اور اس نظارہ کو اس طرح اپنا لباس پہنتا تھا کہ گویا آسمانی رنگ ہی اُس کے حسن کا شایاں لباس ہے جب قوسِ قزح غائب ہوئی تو وہ نازنین بھی جو اس قوسِ قزح کا جزو معلوم ہونے لگی تھی کافور ہو گئی کیا اس مہ جبیں کی ہستی قدرت کے اس نہایت پیارے ظہور میں جذب ہو گئی یا اُس کا نفیس جسم اس رنگا رنگ روشنی میں پگھل گیا؟ مگر میں اُس کے پھر نظر آنے کی آس نہ توڑوں گا کیونکہ قوسِ قزح کا لباس پہن کر وہ امید کی تصویر بن گئی ہے"۔

اس طرح سے مجھے یہ نظارہ چھوڑ گیا۔ اور اس جدائی کے لمحے کے بعد بہت سے پراندوہ دن آئے۔ میں نے اس نازنین کو جب وہ میری نظروں سے غائب ہو گئی چشمے کے پاس جنگل میں۔ پہاڑی پر گاؤں میں "پرشبنم۔ صبح کو۔ تپتی ہوئی دوپہر کو۔ اور غروب آفتاب کے جادو بھرے وقت۔ غرض بہت ہی ڈھونڈا مگر کچھ پتہ نہ ملا۔ ہفتے گذر گئے مہینے گذر گئے مگر وہ دکھائی نہ دی۔ میں نے اپنا بھید کسی کو نہ بتلایا ادھر ادھر پھرتا تھا یا تنہا بیٹھا رہتا تھا۔ گویا مجھے خلد بریں کی ایک جھلک دکھا دی گئی تھی۔ اور اب اس دنیا میں دل نہیں لگتا تھا۔

میں ایک اندرونی دنیا میں جا بسا۔ وہاں میرے خیالات کی بستی تھی اور وہ نظارہ اُن خیالات کے ہمراہ رہتا تھا۔ میں خود بخود بلا ارادہ کئے ہی گویا ایک عشقیہ فسانے کا ہیرو بن گیا۔ رقیب بھی خیال ہی خیال میں پیدا ہو گئے۔ واقعات بھی ہونے لگے اپنے اور دوسروں کے کارنامے بھی دکھائی دینے لگے اور عشق کے تمام تغیرات اور انقلابات کا مجھ کو تجربہ ہونے لگا

حصے کہ رشک اور یاس کا انجام راحت ہوا۔ آہ! اگر مجھے اِس وقت جوانی کی سی آتش خیز قوت متخیلہ اور کھولت کا بے جوش عطیہ یعنے قوت بیان دونو حاصل ہوں تو پیاری نازنینو! تمہارے دل میرے فسانے کو سنکر تڑپ ہی تو اُٹھیں!۔

ماہ جنوری کے وسط میں مجھ کو گھر سے بُلاوا آگیا۔ گھر کو روانہ ہونے سے ایک دن پہلے جو اُن مقاموں میں گیا جنکو اُس نظارے نے میرے لئے مقدس بنا دیا تھا۔ تو دیکھا کہ چشمے کا سینہ منجمد تھا اور قوس قزح والی پہاڑی پر سوائے برف اور موسم سرما کی دھوپ کے اور کچھ نہ تھا۔ میں نے سوچا کہ مجھے اُمید قایم رکھنی چاہئے۔ ورنہ میرا دل ایسا ہی برف سا ٹھنڈا ہو جائیگا جیسا یہ چشمہ ہے اور تمام دنیا ایسی ہی ویران سنسان کھائی دیگی جیسی یہ پہاڑی ہے۔ دن کا اکثر حصہ سفر کی تیاری میں گذر گیا۔ کیونکہ اگلی صبح کو چار بجے چلنا تھا۔ شام کو کھانا کھانے سے ایک گھنٹہ بعد جب سب تیاری ہو چکی میں اپنے کمرے سے اتر کر نشست گاہ میں گیا تا کہ پادری صاحب اور اُن کے کنبے سے جنکے گھر میں میں رہتا تھا رخصت ہولوں میں جو دروازے میں سے گذرا تو ہوا کے ایک جھونکے نے میرا لیمپ گل کر دیا۔

تمام کنبہ حسب معمول نشست گاہ میں بیٹھا تھا اور سوائے اس روشنی کے جو چولھے سے آتی تھی اور کوئی روشنی نہ تھی۔ چونکہ اس نیک دل پادری کی قلیل تنخواہ اُسے ہر قسم کی کفایت شعاری پر مجبور کرتی تھی اِس لئے اُس کے ہاں آگ کی بنیاد ہمیشہ موٹی موٹی چھال ہوتی تھی جو صبح سے رات تک سلگتی رہی اور خفیف گرمی پیدا کرے اور شعلہ نہ نکلے۔ اِس شام کو چھال کا تودہ نیا ہی لگایا گیا تھا۔ اور اُس کے اوپر شاہ بلوط کی تین گیلی شاخیں

اور خشک پیڑھ کے چند ٹکڑے تھے جو ابھی سُلگے نہ تھے۔ روشنی بالکل نہ تھی سوائے اُس کے جو دونیم سوختہ لکڑیوں سے آتی تھی جس سے انگیٹھی کے سرے بھی روشن نہ ہوتے تھے۔ مگر میں جانتا تھا کہ بڈھے پادری کی آرام کرسی کہاں ہوتی ہے اور اُس کی بیوی کہاں بیٹھ کر جرابیں بنا کرتی ہے اور اُس کی دو لڑکیوں سے کیونکر کترانا چاہئے جن میں سے ایک تو موٹی دیہاتی لڑکی ہے۔ دوسری مرض سل کی کھائی ہوئی ہے اندھیرے میں ٹٹولتا ٹٹولتا میں پادری کے بیٹے کے پاس جا بیٹھا۔ یہ ایک کالج کا فاضل تھا اور سردی کی تعطیل میں گانوں میں مدرسہ پڑھانے آیا تھا۔ میں نے دیکھا کہ میرے اور اس فاضل کی کرسی کے درمیان معمول سے کم جگہ تھی ٭

چونکہ لوگ اندھیرے میں ہمیشہ خاموش رہا کرتے ہیں میرے وہاں پہنچنے سے کچھ دیر بعد تک ایک لفظ تک بھی نہ بولا گیا۔ خاموشی میں سوائے بڑی بی کے جراب بننے کی ٹک ٹک کے اور کوئی آواز خلل انداز نہ ہوئی کبھی کبھی آگ ایک دھندلی سی روشنی ذرا سی دیر کے لئے ڈال دیتی تھی۔ جو بڈھے کی عینک پر ٹمٹماتی تھی۔ اور ہمارے حلقے کے گرد کچھ شک کے سے عالم میں منڈلاتی تھی لیکن اس قدر دھندلی تھی کہ ہمارے مجمع کے افراد کا نقشہ نہیں کھینچ سکتی تھی۔ مجھے خیال ہوا گیا ہم روحوں کی مانند نہیں ہیں؟ یہ منظر خواب سا تو ہے ہی مگر کیا جس طرح مرنیوالے جنہوں نے دنیا میں ایک دوسرے کو جانا اور چاہا ہے ابدالآباد عاقبت میں ملینگے اُس کی یہ ایک مثال نہیں ہے؟ ہم اس وقت ایک دوسرے کی ہستی سے آگاہ ہیں مگر نہ نظر کے ذریعے سے۔ نہ آواز کے ذریعے سے۔

نہ چھونے سے۔ بلکہ ایک باطنی آگاہی کے ذریعے سے۔ کیا خفتگان خاک میں بھی ایساہی نہیں ہوتا؟
اس خاموشی کو اس سل زدہ لڑکی نے توڑا اور اس نے اس مجمع میں کسی سے ایک بات کہی جسکو اس نے رشل کہہ کر پکارا۔ اس کی کانپتی ہوئی اور مریل آواز کا جواب ایک ہی لفظ سے ملا جس کو سنکر میں چونک اٹھا اور اس طرف کو جھک کر دیکھنے لگا۔ جدھر سے یہ آواز آئی تھی "کیا میں نے کبھی یہ میٹھی میٹھی دھیمی دھیمی آواز سنی ہے؟ اگر کبھی نہیں سنی ہے؟ تو اس کے سننے سے اس قدر پرانی یادیں یا یادوں کے ہمزاد اور آشنا لیکن نامعلوم چیزوں کے سائے کیوں تازہ ہوتے ہیں؟ اور کیوں اس کے چہرے کی بے ترتیب تصویروں سے میرا دل بھر آیا ہے اگرچہ وہ اس نشست گاہ کی تاریکی میں غائب ہے؟ میرے دل نے کس کو پہچان لیا کہ اس طرح دھڑکنے لگا؟" میں اس کے پاس سانس کی آواز سننے کے لئے متوجہ ہوا اور آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھنے لگا کہ اس کی شکل کی جو دکھائی نہ دیتی تھی تصویر کھینچوں +
یکا یک خشک چیڑھ جل اٹھا۔ آگ سرخ شعلے سے جلنے لگی اور جہاں پہلے اندھیرا تھا وہاں وہ نظر آئی یعنی اس چشمے والا نظارہ! وہ محض ایک نور کی روح تھی کہ قوس قزح کے ساتھ غائب ہو گئی تھی۔ اور اب آگ کی روشنی میں شاید اس لئے ظاہر ہوتی تھی کہ شعلے کے ساتھ ذرا کی ذرا چمکے اور کافور ہو جائے۔ مگر اس کا رخسارہ گلابی اور انسانوں کا سا تھا اور اس کا چہرہ کمرے کی گرم روشنی میں اس سے بھی زیادہ پیارا اور محبت آمیز دکھائی دیتا تھا جیسا میری یاد میں سمایا ہوا تھا۔ وہ مجھے جانتی تھی!۔

وہ بشاشت آمیز تبسّم جو اُس کی نگاہوں میں تھا اور جس سے اس کے چہرے پر (جب میں نے اُس کے نازک حُسن کو چشمے میں دیکھا تھا) گرڑھے پڑے جاتے تھے۔ اب بھی اسی طرح موجود تھا۔ ایک لمحے کے لمحے ہماری نگاہیں چار ہوئیں۔ دوسرے لمحے میں جلتی ہوئی لکڑی پر چھال ڈھیر آگرا۔ اور تاریکی اُس نورانی نژاد کو مجھ سے چھین لے گئی! +

حسین نازنینو! یہ کہانی یہیں ختم ہے۔ کیا یہ سیدھا سادہ راز بتلا ہی دوں؟ راشل اس گانو کے رئیس کی بیٹی تھی اور جس روز میں گانوں میں پہنچا تھا اُس سے اگلی صبح کو گانو سے ایک مدرسے کو چلی گئی تھی اور اور میرے گانو سے روانہ ہونے سے پہلے دن واپس آگئی تھی۔ اگر میں نے اُسے فرشتہ بنا دیا ہے تو یہ نقشہ تو ہر نوجوان عاشق اپنی معشوقہ کا کھینچتا ہے۔ میری کہانی کا عطر یہی ہے۔ پیارے نازنینو! تم کو فرشتہ بننے کے لئے بہت ہی کم بدلنے کی ضرورت ہے! +

ترجمہ

سوتاڑہ

بہارستانِ فطرت میں پہاڑوں کا ایک عجیب مرتبہ ہے کیسا ہی معمولی منظر ہو لیکن اگر وہ کسی اونچے پہاڑ پر منتہی ہوتا ہے تو اُس میں عجیب دلفریبی پیدا ہو جاتی ہے۔ دُور سے سر سبز سر بفلک کشیدہ پہاڑ نظر اگر مُردہ دلوں کو زندہ کرتے ہیں اور جو شفاف سیمیں چشمے اُن سے جا بجا اچھلتے کودتے نکلتے ہیں وہ اپنی مجموعی قوّت سے دریا بہاتے اور عالم

کی سرسبزی وشادابی کا موجب ہوتے ہیں۔ یہی پہاڑ ہیں جنکا نظارہ انسان کو اپنی بے حقیقتی وبے بضاعتی کا دل ہی دل میں قائل کرکے کسی اور عالم میں پہنچا کر معرفت آلہی کا سبق پڑھاتا ہے اور انہیں پہاڑوں کے تاریک کھوؤں کی خوفناک تنہائی میں نفس امارہ کا ستایا ہوا انسان گوشہ گزین ہوکر عبادت وریاضت کے بدولت قید جسمانی سے آزاد ہوکر کسی اور ہستی کی سیر کرتا ہے۔ یہی پہاڑ ہیں جو ہزارہا سال سے بیش بہا جواہرات کو جگر گوشوں کی طرح سینہ میں چھپائے ہوئے چلے آتے ہیں اور سختی مقابلہ سے انسان کی بہترین کوششوں کی بھی بمشکل اُن تک رسائی ہونے دیتے ہیں۔ انہیں پہاڑوں کی چوٹیوں پر بکھرے ہوئے سنگریزے ایسے ایسے سمندروں اور دور دراز طوفانوں کو یاد دلاتے ہیں جن کے مقابلہ میں گویا کہ طوفان نوح کل ہوا ہے۔ غرضیکہ پہاڑ زمانہ قدیم کی جہاں تک کے مورخوں کا ذہن بھی رسائی نہیں کرسکتا زندہ تاریخ اور انسان کے لئے عجب مایۂ دولت وعبرت ہیں +

ضلع بیڑ کی خوش قسمتی ہے کہ مغربی گھاٹ کا شمالی حصہ آدھے ضلع کو گھیرے ہوئے ہے۔ اور گو ان پہاڑوں میں یہ بڑا نقص ہے کہ درختوں سے جو در اصل ان کا زیور ہیں بالکل خالی ہیں اور اُن کا بالائی حصہ کوسوں تک انسان وحیوان کی سکونت اور پرورش کے لئے پھیلتا ہوا چلا گیا ہے۔ اور صرف نظر کے قدم قدم پر چھوٹے اور بڑے۔ گول از ...اکدار ...روڑہ ہوں سے ٹھوکر کھانے سے محسوس ہوتا ہے کہ بالائے کوہ ہیں۔ لیکن پھر بھی کہیں کہیں خصوصاً ...

اور اوتار پر ایسے ایسے دلفریب سمان سامنے آجاتے ہیں جو بھولے سے بھی نہیں بھولائے جاسکتے۔ اگرچہ گرمیوں کے موسم میں اُنکا جلا بھنا سطح اور ڈراؤنی بلندی تھکے ماندے مسافروں کا دِل دُور سے نظر آکر بٹھا دیتی ہے۔ لیکن کسی کسی مقام پر جب قریب پہنچتے ہیں تو اُس کی کافی تلافی ہوجاتی ہے۔ بیڑ کے مغرب میں جس مقام پر گھاٹ ختم ہوتا ہے وہاں کی زمین عجب زرخیز ہے کوسوں تک جدھر نظر جاتی ہے ہرے بھرے کھیتوں کی تازگی کحل الجواہر کا کام کرتی ہے اور برسات کے موسم میں خواہ حضرت میکائیل کیسی ہی جزرسی فرمائیں مگر وہاں کی سیر حاصل زمین محنت کے مارے کسانوں کو وقت پر مالا مال کردیتی ہے۔ جوار کے درخت انسان کے قد سے بھی ایک ہاتھ اونچے ہوتے ہیں اور بڑے بڑے دانوں کی کثرت سے بھٹے پھٹے پڑتے ہیں اُن زرخیز کھیتوں کا سلسلہ ایک سیدھی ہموار سڑک پر ختم ہوتا ہے جو بخط مستقیم گھاٹ سے اُترتے ہوئے احمد نگر کو جاتی ہے یہ کھیت اور یہ سڑک آفتاب کی تیز روشنی میں بالکل ایسے معلوم ہوتے ہیں کہ گویا دہانی دوپٹہ پر روپہلی ٹھپہ لگا ہُوا ہے۔ اس سڑک کی دوسری طرف گھاٹ کے کنارہ کے نزدیک موضع سوتاڑہ اس طرح واقعہ ہوا ہے کہ گویا کوئی عقاب قلۂ کوہ پر پر پھیلائے ہوئے بیٹھا ہے اگرچہ مکانات اور باشندوں کی عام حالت اور اشغال کے لحاظ سے مرہٹواری کے دوسرے دیہات کے مقابلہ میں سوتاڑہ میں کوئی چیز مابہ الامتیاز نہیں ہے لیکن گردواطراف کی سرسبزی و شادابی ٹھنڈی ہوائیں باشندوں کی فارغ البالی اور تواضع اور سب سے

زیادہ وہاں کا دلفریب منظر انسان کے دل پر عجیب اثر ڈالتا ہے۔ موضع
کے دوسری طرف بجانب مغرب نصف میل تک افتادہ زمین کا سلسلہ
جو کہیں سے اونچی اور کہیں سے نیچی ہے نشیب و فرازِ ہستی کا سبق پڑھاتا
ہوا گھاٹ کے کنارہ تک چلا گیا ہے وہاں پہونچکر خدا کی قدرت کا
تماشا نظر آتا ہے۔ اگر ذرا گردن جھکا کر دیکھا جائے تو ایک عمیق غار
نظر آتا ہے۔ جس کے دونوں طرف سیدھی دیوار بن کھڑی ہوئی ہیں
یہ دونوں دیواریں ملکر زاویہ حادّہ بناتی ہیں اور ایسا معلوم ہوتا ہے
کہ کسی فوق الانسان قوت نے پہاڑ کا ایک مثلث نما ٹکڑا جدا کر لیا
ہے عمق پانچ چھ سو فیٹ سے کم نہیں ہے اور چونکہ اوتار بالکل
عمودی ہے اس لئے نظر کانپتی تھرتھراتی نیچے اترتی ہے مگر وہاں پہنچکر
جو سماں سامنے آتا ہے وہ تمام خوف اور تمام زحمت کا کافی بلکہ کافی سے
بھی زیادہ معاوضہ ہوتا ہے۔ چونکہ عرف عام میں اس غار کی گہرائی
سو تاڑ کے برابر سمجھی جاتی ہے اس لئے موضع کا نام سوتاڑہ رکھا گیا ہے
خوف زدہ نگاہ سطح تحتانی پر پہنچکر ہر طرف گھنے درخت دیکھتی ہے
جنکے گھنگھور پتوں کی سیاہی مایل سبزی دل پر ایک خاص اثر پیدا کرتی
ہے اور درختوں کے بیچ میں پتوں کی سبز نقاب منہ پر ڈالے ہوئے
ناہموار پہاڑی سطح پر ایک بلوّرین چشمہ بہتا ہوا نظر آتا ہے جہاں
کہیں کہ پتے زیادہ گھنے نہیں ہیں یا دو درختوں کی شاخیں آپسمیں
گلے ملتی ہیں یا ہوا کے جھونکے نقاب کو ذرا چہرہ سے ہٹا دیتے
ہیں چشمہ کے شفاف پانی کی نورانی جھلک انسان کی اپنی ہستی کو بھلا کر
کسی اور ہستی کو یاد دلاتی ہے۔ غور سے دیکھتے ہیں تو پانی میں کسی

گنبد نما عمارت کا عکس پیچ و تاب کھاتا ہوا نظر آتا ہے اور جب سایہ
سے اصل کی طرف ذہن منتقل ہوتا ہے تو ڈھونڈتے ڈھونڈتے
گھنے پتوں کی گہری سبزی سے کوئی سفید سفید چیز جس نے منظر کو اور
بھی دلربا بنا دیا ہے جھانکتی ہوئی دکھائی دیتی ہے جس مقام پر غار بصورت
زاویہ ختم ہوتا ہے وہاں کچھ اور ہی کیفیت ہے ہر طرف سے چھوٹے
چھوٹے چشمے بہتے چلے آتے ہیں اور غار کے قریب پہنچکر اُن کا منتشر پانی
ایک تیز پہاڑی چشمہ کی شکل میں نمودار ہوتا ہے جو شور مچاتا اچھلتا
کودتا مچلتا کنارہ تک پہنچتا ہے اور وہاں اپنی سطح کو جس کی تلاش میں
اس قدر سرگرداں و پریشان ہوتا پڑا ہے نہ پاکر بے قرار ہو جاتا ہے
اور اسی کرب و اضطرار کے عالم میں ایک چھلانگ ایسی مارتا ہے
کہ منہ کے بل گرتا ہے اور یہ معلوم ہونے لگتا ہے کہ گویا ایک دریا
ہوا میں معلق لٹک رہا ہے۔ یہ تماشا دیکھکر انسان اس قدر محو ہو جاتا
ہے کہ اس کا بے اختیار جی چاہتا ہے کہ ذرا نیچے اتر کر اس بہار جانفزا
کا لطف اور بھی اچھی طرح اٹھائیں۔ مگر پہلے یہ عمودی آثار دل بٹھا دینے
والی گہرائی اور اونچی ناہموار سیڑھیاں اُس کے پاؤں پکڑ لیتی
ہیں۔ مگر شوق اُسے اس زور سے دھکیلتا ہے کہ بے اختیار اُس کے
قدم حرکت میں آتے ہیں اور ان اُنگڑہ سیڑھیوں کو جن کے بنانے میں
دست صنعت کا بہت ہی دخل ہے۔ جس طرح بنتا ہے طے کرتا ہوا ایک
ایسے مقام پر پہنچتا ہے۔ جہاں کچھ دور پہلوان چٹان کے سوا کوئی اور
شے نظر نہیں آتی مجبور بیٹھ کر پھسلنے لگتا ہے اور جب تھوڑی دیر
میں پھر سیڑھیاں نمودار ہو جاتی ہیں تو پھر پہلے کی طرح گرتا پڑتا آگے

بڑھتا ہے اور اگر خدا خدا کر کے کوئی آدھ گھنٹہ کی سخت محنت میں جو اسکو پسینے پسینے کر دیتی ہے۔ نیچے کی سطح پر قدم رکھتا ہے۔ مگر وہاں پہنچتے ہی ایسا ہوش ربا سین دیکھتا ہے جو تمام کلفتوں کو آن کی آن میں بھلا دیتا ہے۔ دو طرف سر بفلک کشیدہ سنگلاخ دیواریں نظر کو روکتی ہیں۔ جن پر جا بجا کسی دیہاتی مگر ہمدرد انسان نقاش نے اپنے غیر تربیت یافتہ ہاتھوں سے آدمی نما پتلوں کی انگڑہ تصویریں ناواقف اترنے والوں کی رہبری کے لئے بنا دی ہیں۔ جنوب کی طرف جہاں تک نظر جاتی ہے کھیت ہی کھیت پھیلتے ہوئے چلے گئے ہیں۔ جن میں ایک شفاف ندی جس کا پاٹ فاصلہ کے ساتھ بڑھتا جاتا ہے بہ رہی ہے۔ شمال کی طرف آبشار ریل کی طرح شور مچاتی ہوئی گر رہی ہے۔ مگر درختوں کے جھرمٹ کی وجہ سے نظر نہیں آتی۔ بیچ میں ایک بلوریں چشمہ اپنی پہاڑی ندی میں عجب مستانہ چال سے لڑکھڑاتا قدم قدم پر گول اور نوکدار اور چھچل چھوٹے اور بڑے سنگریزوں سے ٹکر کھاتا ہوا بہ رہا ہے اور ہر طرف بڑے بڑے درخت اس کے سرد اور شفاف پانی کو آفتاب کی گرمی اور پہاڑی ہواؤں کے تند جھونکوں سے محفوظ رکھنے کے لئے ہر طرف چھتریاں لگائے کھڑے ہیں۔ جن میں سے چھن چھن کر آفتاب کی زرد کرنیں سطح آب پر گرتی اور پانی میں مہتاب کے چھوٹنے کا سماں دکھاتی ہیں۔ چشمہ کے ادھر پتوں میں چھپی ہوئی وہی عمارت جس کا عکس اوپر سے نظر آیا تھا دکھائی دیتی ہے اور جب چشمہ کو عبور کر کے دوسری طرف پہنچتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ بلند کرسی پر

ایک چھوٹا سا مندر ہے۔ جو کبھی فطرت پرست رشی نے اس ہوش ربا مقام میں جہاں ہر شے صانع حقیقی کی لاجواب صنعت کا پتہ دے رہی ہے۔ اطمینان قلب سے صحیفہ فطرت کی ورق گردانی میں مصروف رازِ ہستی کے حل کرنے کی نیت سے بنایا ہے اِس دلربا مندر کی سیر اور اُس کے پانی کے لاجواب انتخاب پر داد دیکر انسان درختوں کے سایہ میں چشمہ کے کنارہ کنارہ اس کی دل لبھانے والی خوش فعلیوں کا نظارہ کرتا ہوا شمال کی طرف بڑھتا ہے اور جبھی کہ درختوں کے جھنڈ سے سر نکالتا ہے تو ایک عجب جانفزا منظر نظر کے سامنے آجاتا ہے۔ شور ایسا ہے کہ کان پڑی آواز سنائی نہیں دیتی مگر معلوم یہ ہوتا ہے کہ ایک دریا اڈا ہوا چلا آتا ہے جس سے نظر کو حیرت کے ساتھ تسکین بھی ہوتی ہے۔ جب عالم محویت میں قدم بڑھاتا۔ اور بھی قریب ہوتا اور نظر اُٹھا کر دیکھتا ہے تو پہلے یہ معلوم ہوتا ہے کہ ایک بلور کی چادر ہوا میں لٹکی ہوئی ہے مگر کسی قدر نیچے آکر اُس چادر کے ٹکڑے ہوکر کئی دھاریں بنجاتی ہیں اور تھوڑی دُور تک یہی کیفیت رہتی ہے پھر ہر چھوٹی دھار بڑی بڑی بوندوں کی شکل میں منتقل ہوتی ہے جنکی جسامت فاصلہ کے ساتھ گھٹتی جاتی ہے یہاں تک کہ جب نیچے پہونچتی ہیں تو چھوٹی ہوتے ہوتے جزِ لایتجزی کا ثبوت دیتی ہوئی دھوئیں کی شکل میں نمودار ہوتی ہیں لیکن یہاں کی خاک بھی اکسیر کا حکم رکھتی ہے کہ یہ موہوم اجزا سے مائی سطح تحتانی سے ملحق ہوتے ہی پھر ایک زوردار چشمہ بنجاتے ہیں۔ یہ نظارہ اس قدر دلفریب ہے کہ انسان گھنٹوں تک عالم محویت نظر جمائے کھڑا رہتا ہے

پھر دفعتاً خیال آتا ہے کہ شام ہوئی جاتی ہے واپس چلنا چاہئے مگر شوق کے تقاضے اور ہمت دلانے نے یہاں تو پہنچا دیا تھا لیکن اب واپسی کارے دارد بہر حال جس طرح بھی ممکن ہے بادلِ ناخواستہ گرتا پڑتا بیٹھتا اُٹھتا جابجا پانی سے حلق کو ترکرتا ہوا اوپر پہنچتا ہے اور تھک تھکا کر بدن تختہ سا ہو جاتا ہے اور یہ معلوم ہوتا ہے کہ

خواب تھا جو کچھ کہ دیکھا جو سُنا افسانہ تھا

نفس کی قوتیں

زمانۂ حال کی تحقیقات ڈنکے کی چوٹ کہہ رہی ہے کہ نفس کی کیفیتیں بھی بجائے خود چیزیں ہیں۔ قوتیں ہیں۔ جان بخش وجان کاہ قوتیں ہیں۔ جن سے بڑھ کر اس عالم اسباب میں اور کوئی قوت نہیں ہے۔

ہمارا ہر ایک خیال ایک معین شکل رکھتا ہے۔ ایک وجود رکھتا ہے جسے اُس کی جان کہنی چاہئے اس میں ایک مخصوص طاقت اور قابلیت ہے جس کی کیفیت اور کمیت اس شخص کی حالت اور طرزِ زندگی پر موقوف ہے۔ جس کے دماغ میں اُس نے جنم لیا ہے۔

یہ سمجھنا کہ خیال کی ہستی نہیں۔ یہ بے قیام و بے ثبات ہے۔ نقش برآب ہے۔ ہوا کا بلبلا ہے کہ خبر ہی نہیں کہاں اُٹھا اور کہاں بیٹھا۔ غلط ہے اس کی ہستی پائیدار ہے پیدا ہوتے ہی اُس کی صورت معین ہوتی ہے اُسی وقت اپنی طاقت اور قابلیت کو ساتھ لیکر

نکلتا ہے۔ جو شخص ملتا ہے۔ جس کی زندگی سے ٹاکرا ہوتا ہے۔ اسی پر اپنا اپنا اثر ڈالتا ہے۔ اسی پر نشتر مارتا ہے +

علم النفس کے محقق تجربے اور مشاہدے کی رو سے آپ جانتی ہیں اور دوسروں پر ثابت کر رہے ہیں۔ کہ روح کا تعلق جسم کے ساتھ کیا۔ اور کتنا ہے اور وہ بدن پر کیسی حکومت کرتی ہے۔ اُنھوں نے معلوم کر لیا ہے کہ ہر ایک خیال۔ ہر ایک جذبہ اپنا اپنا جدا خواص رکھتا ہے۔ اور انہی خواص کے موافق ہر ایک کی تاثیر اور تحریک ہے۔ اس بنا پر خیالات اور جذبات کی فریق بندی بڑی صحت کے ساتھ کی گئی ہے۔ اول ہی ان کے دو بڑے فریق ہیں ایک ادنےٰ ایک اعلےٰ +

فریق ادنےٰ میں بغض۔ عداوت۔ حسد۔ کینہ۔ غضب شہوت شامل ہیں۔ جب ان میں سے کوئی کیفیت غلبہ پاتی ہے بدن میں آگ لگ اُٹھتی ہے۔ ایک قسم کا زہر کھل جاتا ہے۔ گویا کسی نے تیز آب پلا دیا ہے۔ جو اندر ہی اندر بدن کو کھائے جاتا ہے اور تمام اخلاط و رطوبات کو زہر آلودہ کر کے دشمن جان بنا دیتا ہے۔ غصے کی کیفیت کون نہیں جانتا۔ ایک لمحے کا غیظ و غضب سینے میں طوفان برپا کر دیتا ہے۔ تمام اخلاط و رطوبات کو تلخ و ترش کر دیتا ہے۔ اور ان مدات صحت کو مضرات و سمیات کے زمرے میں داخل کر دیتا ہے۔ بھلا جب دو چار منٹ کے غصے کا یہ حال ہے تو گھڑی دو گھڑی۔ دو چار پہر۔ ایک دو روز کے غصے کا تو خدا ہی حافظ ہے۔ متواتر غصے سے کیونکر صحت میں فرق نہ آئیگا؟ اس سے تو وہ دہ

مرض پیدا ہو گئے۔ جن کی دوا لقمان کے ہاں بھی نہیں ملتی۔ اور ایک مرض کیا۔ اکثر مرض نفس کی حرکات قبیحہ اور جذبات رذیلہ سے پیدا ہوتے ہیں۔ پہلے اندر ہی اندر طبیعت میں مرض گھر کر لیتا ہے۔ تب کہیں مادی جسم میں اُس کا ظہور ہوتا ہے۔ زندگی کے سوتے اندر سے باہر کی طرف رواں ہوتے ہیں۔ جتنا دکھ درد ہے باہر سے آکر ہمارے اندر داخل نہیں ہوتا ہے۔ بلکہ اُس کی جڑ ہمارے نفس میں پھوٹتی ہے۔ از ان بعد اس کے برگ و شاخ جسم میں نمودار ہوتے ہیں۔ خوف۔ حسد۔ بغض۔ کینہ۔ شہوت۔ غضب۔ سب بیماری کا گھر ہیں۔ ان میں سے ایک بھی تو ایسا نہیں کہ زہر کی خاصیت نہ رکھتا ہو۔ اور طرح طرح کے مخصوص مرض پیدا نہ کرتا ہو +

فریق اعلےٰ میں حلم۔ عفو۔ اُمید۔ محبت۔ تواضع۔ تلطف۔ خوش مزاجی داخل ہیں۔ یہ وہ چیزیں ہیں جنکی بدولت بدن میں عمل صالح شروع ہوتے ہیں۔ جن سے ہاتھ پاؤں کھلتے ہیں۔ سینہ فراخ ہوتا ہی بصارت میں نور آتا ہے۔ زبان میں امرت ہوتا ہے۔ طبیعت ہشاش اور بشاش رہتی ہے۔ اُن کے نام ہی کہہ دیتے ہیں کہ یہ انسان کے اصلی اور ازلی یار و مددگار ہیں۔ قانون صحت کے یہی اصول ہیں۔ سلامتی کے ربط کے لئے یہی طار ہیں۔ خوش باشی اور خوش گذرانی کی معجون کے یہی اجزا ہیں۔ ہر ایک جز اکسیر کا حکم رکھتا ہے۔ مجموعے کا تو کہنا ہی کیا ہے۔ جس کے خون میں یہ اجزا سرائیت کرینگے اُس کے بدن میں کونسی بیماری کا مادہ پیدا ہو سکتا ہے؟ بالفرض کسی طرح کوئی مرض لاحق بھی ہو جائے۔ تو ان کے سامنے وہ کب کھڑا رہ سکتا ہے؟ یہ وہ نسخہ ہے

کہ کایا پلٹ دے۔ حواس کو تازگی اور طاقت بخشے۔ دماغ آسمان سے باتیں کرے۔ ہر ایک رگ و ریشہ جملہ اقسام فساد سے پاک ہو۔ ایڑی سے چوٹی تک صحت کامل اور طاقت وافر کا نمونہ بنے۔ اور خط و خال میں ایک نورانی جمال مثل فرشتوں کے نمودار ہو +

فنِ تنقید

ہندوستان میں علوم و فنون کی ترقی کی راہ میں ایک روک یہ رہی ہے کہ یہاں فن تنقید کا رواج نہیں تھا۔ اور باوجود ترقی کے مختلف خیالات پیدا ہو جانے کے آج تک یہ فن اس ملک میں رائج نہیں ہے۔ آج کل بعض تحریرات میں کہیں کہیں ناقدانہ جھلک نظر آتی ہے۔ مگر ایسی تحریریں ابھی تعداد میں اس قدر کم اور وہ جھلک ابھی ایسی خفیف ہے کہ یہ کہنا مشکل ہے کہ اس فن کا رواج ہندوستان میں ہو گیا۔ مغربی دنیا کے باشندوں میں جہاں آجکل اور خوبیاں نظر آتی ہیں وہاں یہ بھی ہے کہ لوگ ہنروروں کے عیب و ہنر کو دیکھتے ہیں۔ نظم و نثر کی تصنیفات قبول عام کا خلعت پہننے سے پیشتر جوہریان سخن کی نقاد نظروں کے کامل العیار ترازو میں جانچی اور تولی جاتی ہیں۔ اور اُن سے سندِ ہستی حاصل کرنے کے بعد سخن فہم قدردانوں کی نظروں میں سمائی ہیں۔ انگریزی میں ایک لفظ ہے "کرِٹک" جس سے مُراد ہے وہ شخص جو کسی فن کی نسبت رائے لگائے اور کھوٹا کھرا انصاف سے پرکھ دے اس لفظ سے

مشتق ہے ایک لفظ کرٹسزم جس کے معنے ہیں جانچنا۔ پرکھنا۔
تعجب ہے کہ اس فن کا وجود تو ایک طرف ہمارے ہاں ابھی ان دونوں
لفظوں کے صحیح ترجمہ کا فیصلہ نہیں ہوا ان الفاظ کے ترجمے عموماً غلط
کئے جاتے ہیں جو ان کے اصل مفہوم سے بہت دور ہیں۔ مدرسوں
میں تو بعض نیم ملا "کرٹسزم" کے معنے نکتہ چینی بڑھاتے ہیں یا بہت
بڑھے تو رائے زنی کہدیا۔ اس میں شک نہیں کہ کرٹسزم میں بعض
اوقات نکتہ چینی ہوتی ہے۔ مگر بعض اوقات تعریف بھی ہوتی ہے
اس لئے نکتہ چینی کچھ ٹھیک ترجمہ نہیں۔ ابتدائی تعلیم میں غلط معنے
ذہن نشین ہو جانیکا یہ نتیجہ ہوتا ہے کہ بعض اچھے خاصے انگریزی خواں
تحصیل سے فارغ ہوتے پر بھی اس غلطی میں مبتلا رہتے ہیں۔ اور
"کرٹک" کو محض نکتہ چین اور اس کے فن کو فقط نکتہ چینی جانتے ہیں
رائے زنی والا گروہ بمقابلہ ان کے راستی پر ہے۔ مگر اول تو یہ لفظ پورا
مفہوم ظاہر کرنے سے قاصر ہے دوسرا کچھ کانوں کو بھلا نہیں معلوم
ہوتا۔ مثلاً کسی شخص کی نسبت یہ کہنا کہ اپنے زمانے میں انگلستان
کے نامور رائے زنوں میں گذرا ہے خواہ مخواہ مذاق سلیم کو کھٹکتا ہے
اور جو لوگ بالکل اصلی انگریزی لفظ سے ناآشنا ہیں۔ وہ کچھ نہیں کہہ
سکتے کہ حضرت موصوف کس معاملہ پر رائے زنی کیا کرتے تھے معاملات
ملکی سے انہیں خاص دلچسپی تھی۔ یا تمدنی امور میں زیادہ دخیل تھے
علوم کی طرف رجوع تھا یا فنون کی طرف۔ حالانکہ انگریزی لفظ کے
معنے زیادہ تر علم اور فن کے ساتھ مخصوص ہیں۔ کرٹک یا تو علم
ادب کی تصانیف کے لئے ہوتے ہیں یا فن نقاشی اور مصوری

ومعماری وغیرہ کے لئے۔ اگر اور کسی چیز کی نسبت رائے دینے والے
لوگوں کا ذکر کرنا ہو تو اُس کا نام لینا پڑتا ہے اور کہنا پڑتا ہے کہ فلاں چیز
کے "کرٹک" ان دو ترجموں کے علاوہ حال میں کہیں کہیں لفظ تنقید
اس معنے میں استعمال ہوتا نظر آیا ہے مگر اہل زبان کی غفلت اور سہل
انگاری سے رواج نہیں پا سکا۔ کیونکہ بعض ایسے لکھنے والوں نے
جو اُستادوں میں گنے جاتے ہیں۔ اس کوشش سے کہ اپنی زبان
کے کسی لفظ کو ان معنوں میں رواج دیں۔ اجتناب کیا اور عافیت
اس میں سمجھی کہ اصل انگریزی اصطلاح اُردو کتابوں میں لکھدیں۔ گر
بدقسمتی سے وہ اصطلاح ایسی ہے کہ اُس کا تلفظ آسان نہیں۔ کبھی فارسی
خوان اصحاب کی زبان سے جو اس اصطلاح کو سُنا ہے تو سخت ہنسی آئی
ہے۔ فرمانے لگے "ہمارے ملک میں ابھی کرٹک نہیں نکلتے" جو پوچھا
"صاحب وہ کیا"۔ تو بولے "یہی جو کتابوں پر "کیری ٹی سزم" لکھتے ہیں"
ہم دعوے سے کہہ سکتے ہیں کہ۔ یہ اصطلاح اُن انگریزی الفاظ میں سے
نہیں ہے جو اُردو میں عام طور پر مقبول ہو سکتے اور جزو زبان بن سکتے
ہیں۔ یہ ایسی اصطلاح ہے کہ اس کا تلفظ اگر انگریزی خوانوں کی زبان سے
صحیح طور پر بھی ادا ہو گا تو بھی اُردو آشنا کانوں کو کھٹکیگا۔ اس لئے ضروری
ہوا کہ اس کے لئے ایک لفظ ایسا تلاش کیا جائے جو زبان اُردو میں
پہلے سے مروج ہو۔ اور جو اس اصطلاح کے مفہوم کو ادا کر سکے ہماری نظر
میں اس مطلب کے لئے "تنقید" سے بہتر کوئی لفظ نہیں۔ اور ہم تو آج
سے ہی کیری ٹی سزم کو سلام کہتے ہیں۔ اور تنقید سے کام لیں گے۔
کرٹک کو ہم نقاد یا ناقد سخن کہینگے۔ کیونکہ ہمیں ابھی علم ادب ہی کے

نقادوں سے کام ہے۔ اور ان دو لفظوں کے رواج کو فن تنقید کی ترقی کا پہلا زینہ سمجھیں گے۔ اور فن تنقید کی ترقی۔ اگر یہ فن ایماندار اور انصاف پسند لوگوں کے ہاتھ میں رہا۔ ہمارے علم ادب کو اس معراج ترقی پر پہنچاوے گی۔ جس کے اکثر ہوا خواہان ملک دل سے آرزو مند ہیں۔ اس وقت مصر میں عربی زبان کا علم ادب غیر معمولی ترقی کر رہا ہے۔ یورپ کے علمی اور ادبی خزانے مال غنیمت کی طرح ملک کے ذخیروں کو مالا مال کرنے کے لئے لوٹے جا رہے ہیں۔ جو کام پہلے سلطنتیں کرتی تھیں وہ عوام کر رہے ہیں۔ اور ہر قسم کی انگریزی اور فرانسیسی کتابیں عربی زبان میں ترجمہ ہوتی جاتی ہیں۔ وہاں ضرورت نے بہت سے غیر زبانوں کے لفظوں کو اختیار کرنے اور بعض کے لئے اپنی زبان کی اصطلاحیں ڈھونڈ نکالنے پر مجبور کیا ہے۔ مگر اس بات کی داد دینی پڑتی ہے کہ جن لفظوں کو اختیار کیا ہے۔ ان کو بالعموم خوبصورتی سے اپنا بنا لیا ہے اور جن کے ترجمے ڈھونڈھے ہیں۔ ایسے موزوں کہ لفظی رعائت بھی ملحوظ ہے۔ اور مطلب بھی ادا ہو گیا ہے۔ انہی ترجموں میں یہ لفظ "تنقید" ہے۔ وہاں اکثر اخبارات یا رسالوں میں جہاں تازہ تصانیف کی پرکھ ہوتی ہے۔ وہاں صفحہ یا کالم کے اوپر "باب التنقید" لکھا ہوتا ہے۔ خود کالم کے لفظ کی بجائے وہ عماد لکھتے ہیں جو انگریزی لفظ کا صحیح ترجمہ ہے اور اگر ہمارے اخبارات میں کالم کا لفظ حد سے زیادہ مروج نہ ہو چکا ہوتا۔ اور یوں بھی ایک سادہ اور سہل لفظ نہ ہوتا تو ہم زور سے رائے دیتے کہ "عماد" کو یہ نئے معنے عطا کئے جائیں۔

فن تنقید کے رواج کے لئے دو تدبیریں ہمارے ذہن میں ہیں۔ ایک تو یورپ کی بعض مشہور تصانیف میں سے وقتاً فوقتاً اس فن کی نسبت

اقتباسات درج کرنا دوسرے اصول فن کے موافق اس رسالہ میں آج کل کی بعض مشہور تصنیفات کو تنقید کے ترازو میں تولنا اور نتیجہ یا ماکم و کاست ظاہر کرنا۔ یہ دونوں کام بجائے خود مشکل کام ہیں۔ پہلی تدبیر میں تو ترجمہ کا کام نہایت دشوار ہے۔ اس فن کی مختلف اصطلاحیں تعداد میں اسقدر ترقی کر گئی ہیں اور درجہ دوم کے ایسے ایسے باریک پہلو نکالے گئے ہیں۔ کہ اُن عبارات کو جو وہاں صدیوں میں منجھی ہیں۔ اُردو میں ادا کرنا کار سے دارد دوسری تدبیر میں علاوہ اس کے کہ صحیح تنقید کوئی آسان بات نہیں۔ دقت یہ ہے کہ مصنفین اور مطابع ابھی سچی تعریف اور سچی مذمت سُننے کے عادی نہیں۔ یہاں مدت سے تقریظوں کا رواج رہا ہے۔ کوئی پُرانا دیوان یا کتاب اُٹھا کر دیکھئے۔ قلمی نسخہ ہو یا چھپا ہوا۔ آخر میں صفحو نکے صفحے تقریظوں سے پُر ہیں۔ ہمیں یاد نہیں کہ آجتک کوئی ایسی تقریظ کسی کتاب کے ساتھ لگی ہوئی ہو۔ جس میں جہاں دس خوبیاں جتائی ہیں ایک آدھ نقص بھی جتا دیا گیا ہو۔ مصنّف کو دیکھئے تو ہر تقریظ لکھنے والے کے قلم جواہر رقم طبع رسا اور کلک گہر سلک کے گیت گا رہے ہیں۔ اور تقریظوں کو دیکھئے تو سب کی سب کتاب کو لاجواب رشک آفتاب و مہتاب۔ ہزاروں میں انتخاب بتا رہی ہیں۔ کوئی یہ نہیں دیکھتا کہ کتاب کتنے تقریظی الفاظ کی مستحق ہے اور ہر شخص یہ دیکھتا ہے کہ اس کی تقریظ دوسرے سے زور والی ہو۔ تقریظ لکھنا ہر شخص کے لئے اپنی طبع آزمائی کا موقعہ ہوتا تھا۔ نہ کہ مصنف کو ایسی داد دینے کا جس کا وہ مستحق ہے۔ بعض ایسی مثالیں بھی دیکھنے اور سننے میں آئی ہیں کہ تقریظ میں تو تعریف کے پل باندھ دئے اور ویسے اگر کسی نے پوچھا کہ کتاب کیسی لکھی گئی ہے تو کہ دیا۔ کہ کتاب تو مبتدیانہ

مشق ہے۔ ہم نے تو ایک دوست کی خاطر سے تقریظ لکھ دی ہے۔ تقریظوں کے علاوہ بعض پرانی کتابوں پر نکتہ چینی بھی کی گئی ہے۔ مگر اس کا مذاق یہ نہیں کہ ع عیب مے جملہ بگفتی ہنرش نیز بگو۔ بلکہ یہ کہ اُس کو سراپا عیب ہمہ تن نقص قرار دیتے تھے۔ ایک ایک لفظ پر اعتراض۔ حرکات سکنات پر گرفت۔ بندش پر نکتہ چینی۔ مضمون پر حرف گیری ایسے ہی لوگوں کی شان میں میر انیس مرحوم لکھ گئے ہیں۔

مزا یہ طرفہ ہے۔ مضموں تو دستیاب نہیں ۔۔۔ مقابلہ پہ چڑھ آئے ہیں آستینوں کو

یہ لفظ غلط وہ بندش بری یہ مضموں سست ۔۔۔ ہنر عجیب ملا ہے یہ نکتہ چینوں کو

غرض افراط تفریط کی عملداری رہی ہے۔ اور مذاق میانہ روی سے آشنا ہی نہیں۔ نتیجہ یہ ہے کہ کتاب کی تعریف کر دینا نشان دوستی سمجھا جاتا ہے اور نہ کرنا یا کوئی اعتراض کرنا علامت دشمنی ہے۔ آپ ذرا کسی کی کتاب میں ذرا نقص بیان کیجئے مصنف کے بیسیوں طرفدار آپ کی پگڑی اُتارنے کو کھڑے ہو جاتے ہیں۔ اور کہتے ہیں کہ آپ میں کتاب کے سمجھنے کی صلاحیت ہی نہیں۔ اس حالت میں آزادی سے تصانیف پر رائے دینے کا بیڑا اُٹھانا ایک جہان سے دشمنی پیدا کرنا ہے۔ اور دشمنی بھی وہ جسے خدا واسطے کی دشمنی کہتے ہیں یعنے نہ کوئی ذاتی غرض نہ عناد۔ صرف ملک کے علم ادب اور مذاق کی صلاح اور منفعت عام کی غرض سے تو تنقید لکھی جائے اور جن کے کلام پر تنقید ہو وہ ایسے بگڑیں کہ دل میں غصہ بھر لیں اور بدلا لینے کی فکر میں رہیں۔ اس میں شک نہیں کہ رفتہ رفتہ تنقید کی برداشت لوگوں میں پیدا ہوتی جائیگی۔ مگر ابتدا میں بہت سی مشکلات کا سامنا ہے

ہم سردست یہ تجویز کرتے ہیں کہ ہمارے پاس جو کتابیں ریویو کے واسطے بھیجی جائینگی۔ ان کو دو قسم میں تقسیم کرینگے۔ ایک وہ جن پر ہم ناقدانہ نگاہ ڈالیں گے۔ اور انجن کی نئی برقی شعاعوں کی طرح ناظرین کو اس کے حسن و قبح صاف دکھا دینگے۔ اس صیغہ میں ممکن ہے کہ ہماری سخن فہمی غلطی کرے۔ مگر نیت کبھی غلطی نہ کریگی۔ نہ کسی کا لحاظ تعریف کی طرف راغب کریگا۔ نہ کسی کا عناد مذمت کی طرف۔ مال کو کسوٹی پر کس کے رکھدینگے۔ گاہک کا جی چاہے اٹھائے۔ جی چاہے نہ اٹھائے۔ جو صاحبان مطابع اس معیار کو منظور فرمائیں تنقید کی فرمائش کریں ورنہ لکھدین کہ وہ صرف تقریظ چاہتے ہیں۔ ہمارے ہاں کی تقریظ "رشحۂ قلم جواہر رقم" تو نہ ہوگی۔ اس پرانے رنگ میں کسی قدر ترمیم کیجائیگی اس تقریظ کی تعریف یہ ہوگی +

دنداں تو جملہ در دہان اند

چشماں تو زیر ابروان اند

یہ بتا دیا جائیگا کہ کس مضمون کی کتاب ہے۔ کون صاحب مصنف ہیں۔ کیسی چھپی ہے کیا قیمت ہے شائد تقریظ لینے آپ کو اس وجہ سے بھی گرا چکی ہے۔ اس لئے ہم اس سے یہ اصطلاحی مطلب لیتے ہیں + اگر کوئی صاحب یہ تحریر نہ فرمائیں گے کہ وہ تقریظ چاہتے ہیں یا تنقید تو ہمیں اختیار ہوگا کہ دونوں میں سے کوئی پسند کرلیں +

ایک اسکیمو[1] دوشیزہ کی داستان

وہ آرام سے ایک برف کے تودہ پر جس کو ہم آرام چوکی کے طور پر استعمال کرتے تھے ۔ بیٹھ گئی ۔ اور میں اُس کی داستان سننے کے لئے تیار ہو بیٹھا ۔ اسکیمو کے معیار کے مطابق وہ نہائت حسین تھی اور لوگ شائد اُس کو کسی قدر بھاری بدن کا سمجھتے ۔ ۲۰ سال کا سن تھا ۔ اور گو اسوقت وہ بے ڈھنگا سا پوستین کا کوٹ ۔ پاجامہ اور بوٹ پہنے ہوئی تھی ۔ اور سر کو چادر سے ڈھانکے تھی ۔ تاہم چہرہ کی خوبصورتی اس لباس میں سے بھی عیاں تھی ۔ وہ خندہ پیشانی تصنع سے پاک اور دل کی صاف تھی اس کا نام **لاسکا** تھا ۔ ہم دونو اکثر ساتھ دریائی بچھڑے کا شکار کرنے جایا کرتے تھے ۔ ایکدفعہ کچھ دور ریچھ کے شکار کے لئے بھی میں ساتھ گیا ۔ لیکن آدھے راستہ سے پھر آیا کیونکہ ریچھ سے مجھ کو ڈر لگتا ہے +

لاسکا نے اپنی کہانی اس طرح شروع کی +

" اور قبیلوں کی طرح ہماری قوم بھی منجمد سمندر پر خانہ بدوشوں کی طرح زندگی بسر کیا کرتی تھی ۔ لیکن دو سال ہوے میرے باپ نے آوارہ گردی کو خیرباد کہہ کر یہ عالیشان برف کا محل اپنے رہنے کیلئے

[1] ۔ شمال یورپ کے برفانی ملک کے باشندوں کو اس نام سے پکارتے ہیں +

تعمیر کیا ہے ۔ یہ سات فیٹ بلند ہے اور آس پاس کے مکانوں سے تین چار گنا لمبا ہے ۔ اب ہم مستقل طور پر یہیں رہتے ہیں ۔ میرے باپ کو اس مکان کا بڑا فخر ہے ٭

اب غور سے دیکھیں تو معلوم ہو گا کہ معمولی قسم کے مکانوں سے یہ کسی قدر بہتر اور مکمل ہے ۔ سامنے کی طرف اس میں ایک بلند چبوترہ مہمانوں کی آسائش اور سب اہل خاندان کے ایک جگہ بیٹھ کر کھانا کھانے کے لئے ہے ۔ اس پر دریائی بچھڑے ۔ ریچھ ۔ سفید لومڑی وغیرہ کے پوستینوں کا فرش ہو رہا ہے ۔ اس کے علاوہ متعدد برف کے بنچ دیواروں کے ساتھ ساتھ بچھے ہوئے ہیں ۔ غرض خدا کا دیا سب کچھ موجود ہے ۔ لیکن مدت سے جس چیز کی تلاش ہے وہ نہیں ملتی ۔ عاشق صادق کوئی نہیں ملتا ۔ یوں تو بیسیوں پیغام آتے ہیں ۔ میں جانتی ہوں کہ وہ سب میرے باپ کی دولت کے عاشق ہیں ۔ میرا اُن میں سے ایک بھی شیدا نہیں ٭

میں نے دل میں خیال کیا کہ اس دولت سے مراد مکان تو ہو نہیں سکتی تھی ۔ کیونکہ اور لوگ بھی ایسی عمارت تیار کر سکتے تھے ۔ نہ اس سے بظاہر غرض بن بیٹے گاڑیوں ۔ کتوں ۔ برچھوں ۔ کشتی ۔ مچھلی کی ہڈی کے کانٹوں اور سوئیوں سے تھی ۔ کیونکہ اس قسم کی چیزیں وہاں دولت کے شمار میں نہ تھیں ۔ میری حیرت کو معلوم کر کے لاسکا پاس آ کر چپکے سے کان میں کہنے لگی ۔

"بھلا تم اندازہ تو لگاؤ کہ میرے باپ کے پاس کس قدر دولت ہے ؟"
میں دیر تک خاموش بیٹھا سوچتا رہا ۔ لیکن کچھ سمجھ میں نہ آیا ۔ لاسکا

میری حالت کو دیکھکر خوب کھلکھلا کر ہنسی اور پھر کان کے پاس منہہ لاکر سنجیدگی سے کہا " یہ مچھلیوں کے کانٹے ۔ ہڈی کے نہیں ۔ بلکہ سب اصلی لوہے کے ۔ اور غیر ملک کی ساخت ۔

یہ کہکر وہ جلدی سے پرے ہٹ گئی کہ دیکھئے مجھ پر اس غیر معمولی خبر کے سُننے سے کیا اثر ہوتا ہے ۔ میں نے بھی نہ چاہا کہ اُسے مایوسی ہو ۔ اس لئے نہایت حیرت اور تعجب کے لہجہ میں کہا :

" کیا سچ مچ ؟ "

" تمہارے سر کی قسم "

" لاسکا تم مجھ سے فریب کرتی ہو ۔ سچ کہو " ۔ یہ سُنکر وہ کچھ گھبرا سی گئی اور نہایت سنجیدگی سے کہا " مسٹر ٹوٹن یہ بالکل درست ہے اور میں اُمید کرتی ہوں کہ تم مجھے جھوٹی نہیں سمجھو گے ۔ لاسکا کو جب اطمینان ہو گیا کہ مجھے اُس کے کہنے کا باور آگیا ہے تو میرے متعجب اور خوش کرنے کے لئے اپنا بیش قیمت تعویذ دکھایا ۔ (یہ ایک پیتل کا مربع ٹکڑا تھا)

لاسکا ۔ اِس گہنے کے متعلق تمہاری کیا رائے ہے ؟

میں ۔ میں نے ایسی عمدہ چیز آج تک نہیں دیکھی ۔

لاسکا ۔ سچ کہتے ہو ۔ واقعی یہ بڑی بیش قیمت چیز ہے ۔ اس کے دیکھنے کی خاطر لوگ کوسوں سمندر پار سے آتے ہیں ۔ کہیں تم نے ایسا اور بھی دیکھا ہے ؟

میں ۔ نہیں ۔ (یہ جھوٹ بولتے ہوئے ۔ مجھ کو تکلیف تو ہوئی لیکن کیا کرتا ۔ یہ بھی دل نے نہ چاہا کہ اس بیچاری لڑکی کو سچ بول کر تکلیف دوں کہ ایسے ٹکڑے لاکھوں نیو یارک میں مارے مارے پھرتے ہیں

اور کوئی پوچھتا بھی نہیں، لیکن اس نادر چیز کو تو چاہیئے کہ نہائت حفاظت سے رکھا جائے +

لاسکا۔(ذرا آہستہ بولو۔ کوئی سُن نہ لے) یہ میرے باپ کے خزانہ میں رہتا ہے آج میں نے پہن لیا ہے۔ کس کو معلوم ہے کہ یہ میرے پاس ہے۔

میں۔لاسکا۔ تم بڑی خوش قسمت ہو۔ ایسا خوبصورت مکان تمہارے رہنے کے لئے ہے۔ یہ نادر تعویذ پہننے کو۔ علاوہ اس کے یہ بیش قیمت خزانہ برف کے کھیت بڑے بڑے برفانی میدان پھرنے کو۔ ریچھ اور دریائی بچھڑے شکار کرنے کو۔ یہ نعمتیں کس کو نصیب ہوتی ہیں۔ اور سب سے بڑی بات یہ کہ تمام دُور و نزدیک کے نوجوان تم پر فدا ہیں۔ تمہاری خدمت کو اپنا فخر سمجھتے ہیں +

لاسکا۔ اس بظاہر روشنی کی کرنوں کے پیچھے ایک سیاہ بادل چھپا ہوا ہے۔ دولت کا بوجھ اُٹھانا آسان بات نہیں ہے اکثر مجھے خیال آتا ہے۔ کہ کاش میں کسی غریب کے گھر پیدا ہوتی۔ یا کم از کم اس قدر مالدار نہ ہوتی۔ مجھے تکلیف ہوتی ہے۔ جب پڑوسی میری طرف اشارہ کرتے ہیں اور آپس میں سرگوشیاں کرتے ہیں کہ "وہ دیکھو لکھ پتی کی لڑکی" +

یہ لوگ۔ نہائت حسرت کے لہجہ میں کہتے ہیں۔ "اس لڑکی کے پاس تو مچھلی کے کانٹوں کا خزانہ ہے اور ہمارے پاس ایک بھی نہیں" یہ سن کر میرے دل کا عجب حال ہوتا ہے۔ جب میں بچہ تھی۔ اور یہ دولت ہم کو نصیب نہ ہوئی تھی تو ہم مکان کا دروازہ کھلا چھوڑ کر بے کھٹکے

سور ہنتے تھے۔ اب ہمیں چوکیدار رکھنا پڑتا ہے۔ اُن دِنوں میں میرا
باپ سب سے نہایت حلم اور بُردباری سے پیش آتا تھا۔ اب
وہ درشت مزاج اور متکبر ہوگیا ہے اور کسی سے بے تکلف ہونا پسند
نہیں کرتا۔ پہلے اس کے دل میں سوائے اپنے خاندان کے اور کسی
کا خیال تک نہ گذرتا تھا۔ اب ہر وقت ان کمبخت کانٹوں کا ہی خیال
لگا رہتا ہے۔ اس دولت کی وجہ سے لوگ اس کی بے انتہا خوشامد کرتے
ہیں پہلے کوئی شخص بھی اس کے لطیفوں پر نہ مُسکراتا تھا۔ اب بات منہہ
سے نکلتی نہیں اور لوگوں کے پیٹ میں بل پڑنے شروع ہو جاتے ہیں
غرض اسی دولت کی وجہ سے ہمارے تمام قبیلہ کی اخلاقی حالت ردی
ہوگئی ہے۔ جو پہلے بہادر اور کھرے تھے اب وہ خوشامدی اور مکّار
ہوگئے ہیں +

سب سے پہلے شاعری کی حقیقت اور ماہیت سے ارسطو نے بحث
کی منطق کے اُس نے جو آٹھ حصّے قرار دئے اُن میں ایک بوطیقا تھا۔
یعنی شاعری۔ عربی زبان میں اس خاص حصّہ کا ترجمہ متی نے سریانی
زن کے ترجمہ سے لیا۔ ابن رشد نے اس کی تلخیص کی اور بو علی سینا نے
منطقیات شفا میں اس کے مضامین کو نہایت خوبی سے اپنی طرز میں
ادا کیا۔ ابن رشد کی تلخیص کے جستہ جستہ حصّے پروفیسر شیخو لیس نے

اپنی کتاب علم الادب میں جو بیروت میں چھپ گئی ہے شامل کئے ہیں افسوس ہے کہ چونکہ مسلمانوں نے ارسطو کی ادبی تصنیفات کی طرف کچھ التفات نہیں کیا۔ اس لئے شاعری کے متعلق ارسطو کے جو خیالات تھے وہ مسلمانوں میں بالکل پھیل نہ سکے۔ کتب ادبیہ میں شاعری کی جو تعریف کی گئی ہے اور وہی عام و خاص کی زبانوں پر جاری ہے۔ وہ یہ ہے کہ کلام موزوں ہو اور متکلم نے بہ ارادہ موزوں کیا ہو۔ لیکن یہ تعریف در حقیقت عامیانہ تعریف ہے۔ آج تو یہ مسئلہ بالکل فیصل ہو چکا ہے لیکن قدما کے کلام میں بھی اس کے اشارے بلکہ تصریحات پائی جاتی ہیں کتب ادبیہ میں مذکور ہے کہ ایک دفعہ حسان بن ثابت کے ایک صغیر السن بچہ کو بھڑ نے کاٹ کھایا۔ وہ حسان کے سامنے روتا ہوا آیا۔ کہ مجھ کو ایک جانور نے کاٹ کھایا ہے حسان نے جانور کا نام پوچھا۔ وہ نام سے واقف نہ تھا۔ حسان نے کہا اچھا اس کی صورت کیا تھی؟ بچہ نے کہا:۔

كَاَنَّهٗ مُلْتَفٌ بِبُرْدَیْ حِبَرَةٍ یہ معلوم ہوتا تھا کہ وہ مخطط چادروں میں لپٹا ہوا ہے بچہ کو بھڑ نے کاٹا تھا۔ اور چونکہ بھڑ کے پروں پر دھاریاں ہوتی ہیں۔ اس لئے اس نے مخطط چادر سے تشبیہ دی۔ حسان اس کے منہ سے یہ الفاظ سنکر اچھل پڑے اور خوشی کے جوش میں کہا کہ وَاللہِ صَارَ ابْنِی الشَّاعِرُ یعنے خدا کی قسم میرا بیٹا شاعر ہو گیا وہ فقرہ موزوں نہ تھا۔ لیکن چونکہ تشبیہ اچھی تھی حسان نے سمجھا کہ بچہ میں شاعری کی قابلیت موجود ہے اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ اہل عرب کے نزدیک شعر کی اصل حقیقت کیا تھی؟ ابن رشیق قیروانی نے عرب کی شعر و شاعری پر ایک مستقل کتاب لکھی ہے۔ اس میں شعراء اور علمائے ادب کے جو اقوال

نقل کئے ہیں اُن سے بھی اسی خیال کی تائید ہوتی ہے۔ شعرائے فارس کے نزدیک بھی شاعری دراصل تخیل کا نام تھا۔ نظامی عروضی سمرقندی جو خود بہت بڑا شاعر اور نظامی گنجوی سے متقدم تھا۔ اپنی کتاب چہار مقالہ میں لکھتا ہے:-

"شاعری صناعتے است کہ شاعر بداں صنعت اتساق مقدمات موہومہ کند۔ والتیام قیاس نتیجہ برآں وجہ کہ معنی خورد را بزرگ کند۔ و بزرگ را خورد۔ و نیکو را در لباس زشت۔ و زشت را در حلیۂ نیکو جلوہ دہد۔ و با ایہام قوت ہائے غضبانی و شہوانی برانگیزد۔ تا بداں ایہام طباع را انبساطے وانقباضے بود و امور عظام را در نظام عالم سبب گردد"

اس تعریف کا ماحصل یہ ہے کہ "شاعری اس فن کا نام ہے کہ مقدماتِ موہومہ کی ترتیب ہے۔ اچھی چیز بدنما اور بُری چیز خوشنما ثابت کیجائے اور محبّت وغضب کی قوتیں مشتعل کر دی جائیں"۔ یہ تو قدما کے اقوال وخیالات تھے۔ یورپ کے نکتہ سنجوں نے اس مسئلہ پر نہایت دقیق بحثیں کی ہیں اور عجیب عجیب نکتے پیدا کئے ہیں۔ مِل نے اس پر ایک نہایت مفصل اور بسیط مضمون لکھا ہے جس کا نہایت مختصر خلاصہ حسب ذیل ہے:-

"انسان کے مُدرکات میں سے بعض ایسے ہیں جن سے جذباتِ انسانی کو کچھ تعلق نہیں ہوتا۔ مثلاً اگر ہم اقلیدس کا کوئی مسئلہ حل کریں۔ تو اس سے ہم کو غصّہ یا جوش یا رنج نہیں پیدا ہوگا۔ لیکن اگر ہمارے سامنے کسی شخص کی مصیبت کا حال دردانگیز لفظوں میں بیان کیا جائے تو اِس واقعہ کے ادراک کے ساتھ ہم پر ایک اثر طاری ہوگا۔ اِس قسم کے اثروں کا نام جذبات یا احساسات ہے اور جو چیز ان جذبات اور

احساسات کو برانگیختہ کر سکتی ہے۔ وہی **شاعری** ہے۔ اس تعریف میں تصویر۔ تقریر۔ وعظ بھی شعر کی تعریف میں داخل ہو جاتے ہیں۔ کیونکہ یہ چیزیں بھی جذباتِ انسانی کو برانگیختہ کر سکتی ہیں۔ اسی بنا پر بعضوں نے ان چیزوں کو بھی شاعری میں داخل کر لیا ہے۔ لیکن مِل صاحب کے نزدیک یہ چیزیں شاعری کے دائرہ سے باہر ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ انسان جو کلام کرتا ہے اس کی غرض کبھی تو دوسروں پر اثر ڈالنا ہوتا ہے۔ مثلاً اسپیچ لکچر وغیرہ کہ ان سب کا مقصد دوسروں کا متاثر کرنا ہوتا ہے اور کبھی دوسروں سے مطلق غرض نہیں ہوتی۔ بلکہ انسان محض اپنے آپ سے خطاب کرتا ہے اور اپنا آپ ہی مخاطب ہوتا ہے۔ مثلاً اگر کسی شخص کا بیٹا مر جائے تو اس حالت میں اُس کی زبان سے جو الفاظ نکلینگے اس کی غرض کسی شخص یا گروہ کو مخاطب کرنا نہ ہوگا۔ بلکہ وہ اپنا آپ مخاطب ہوگا۔ فرض کرو کہ وہاں کوئی شخص موجود نہ ہو تب بھی وہی الفاظ اُس کی زبان سے نکلینگے۔ شاعری اسی قسم کے کلام کا نام ہے۔ اس بنا پر شاعری کی تعریف منطقی طور پر کرنا چاہیں تو یوں کہیں گے کہ جو کلام اس قسم کا ہو کہ اس سے جذباتِ انسانی برانگیختہ ہوں اور اس کا مخاطب حاضرین نہ ہوں بلکہ انسان خود اپنا آپ مخاطب ہو۔ اس کا نام شاعری ہے۔"

مِل صاحب کی یہ تعریف اگرچہ نہایت باریک بینی پر مبنی ہے لیکن اس سے شاعری کا دائرہ نہایت تنگ ہو جاتا ہے۔ اور اگر اسی کو معیار قرار دیا جائے تو فارسی اور اردو کا دفتر بے پایاں بالکل بیکار ہو جائیگا۔ حقیقت یہ ہے کہ **شعر** کا دائرہ نہ اس قدر تنگ ہے جیسا مِل صاحب کرنا چاہتے ہیں۔ اور نہ اس قدر وسیع جتنا ہمارے علمائے ادب نے کیا ہے۔

شعر کی تعریف جو ارسطو نے کی وہ نہایت معتدل ہے اور اسی کو اس بحث کا فیصلۂ قطعی قرار دینا چاہیئے۔

ارسطو کے نزدیک شعر ایک قسم کی مصوری اور نقالی ہے۔ فرق یہ ہے کہ مصور صرف مادی اشیاء کی تصویر کھینچ سکتا ہے۔ بخلاف اس کے شاعر ہر قسم کے خیالات۔ جذبات اور احساسات کی تصویر کھینچ سکتا ہے۔ ایک شخص کا عزیز دوست جدا ہو رہا ہے۔ اس حالت میں اس پر جو صدمے گذرتے ہیں اور دل دوز خیالات کا جو طوفان اس کے دل میں اٹھتا ہے۔ شاعر اس کی تصویر اس طرح کھینچ سکتا ہے کہ اگر رنج و غم مادی چیزیں ہوتیں اور انکی تصویر کھینچی جاتی تو وہی ہوتی جو شاعر نے الفاظ کے ذریعہ سے کھینچی تھی۔

اس بنا پر کسی چیز کا بیان جب اس طرح کیا جائے کہ اس شے کی اصلی تصویر آنکھوں کے سامنے پھر جائے تو اس پر شعر کی تعریف صادق آئیگی۔ دریا کی روانی۔ جنگل کا سناٹا۔ باغ کی شادابی۔ سبزے کی لہک۔ خوشبو کی لپٹ۔ نسیم کے جھونکے۔ دھوپ کی شدت۔ گرمی کی تپش۔ جاڑوں کی ٹھنڈک۔ صبح کی شگفتگی۔ شام کی دلاویزی۔ یا رنج غم۔ غیظ۔ غضب۔ جوش۔ محبت۔ افسوس۔ حسرت۔ خوشی ان اشیاء کا اس طرح بیان کیا جائے کہ انکی صورت آنکھوں میں پھر جائے یا وہی اثر دل پر طاری ہو جائے۔ یہی شاعری ہے۔ ایک اور پیرایہ میں شاعری کی تعریف کیجا سکتی ہے اور وہ بھی ارسطو کی تعریف کے قریب قریب ہے۔ دنیا میں جس قدر قدرت کے مظاہر ہیں۔ خواہ مادی ہوں مثلاً۔ پہاڑ۔ بیابان۔ باغ۔ دریا وغیرہ خواہ غیر مادی مثلاً وصل۔

ہجر۔ تحسین۔ نفرین ان سب سے دل پر اثر پڑتا ہے اور ہر شخص کے دل پر پڑتا ہے۔ لیکن اثر کے مراتب متفاوت ہوتے ہیں۔ بعض اشخاص پر کم۔ بعض پر زیادہ۔ اور بعض پر بہت زیادہ ہوتا ہے۔ جو شخص ان مظاہر قدرت سے عام لوگوں کی نسبت زیادہ متاثر ہو اور اس اثر کو بعینہٖ ادا بھی کر سکتا ہو وہی شاعر ہے +

شاعر کے جذبات اور احساسات فطرۃً نہایت نازک۔ لطیف اور سریع الاشتعال ہوتے ہیں۔ دوست کی جدائی ہر شخص پر اثر کرتی ہے لیکن شاعر اس موقع پر بالکل بیتاب ہو جاتا ہے۔ دریا کی روانی سے ہر شخص محظوظ ہوتا ہے۔ لیکن شاعر پر وجد کی کیفیت طاری ہو جاتی ہے۔ سبزے کے دیکھنے سے ہر شخص کو فرحت ہوتی ہے۔ لیکن شاعر جھومنے لگتا ہے۔ ممکن ہے کہ اس درجہ کی کیفیت دوسروں پر بھی طاری ہو۔ لیکن وہ لوگ اس کیفیت کو الفاظ کے ذریعہ سے اس طرح ادا نہیں کر سکتے۔ جس طرح شاعر کر سکتا ہے۔ حاصل یہ کہ جو شخص واقعات اور مظاہر قدرت سے تمام لوگوں کی بہ نسبت زیادہ متاثر ہو۔ اور اس اثر کو الفاظ کے ذریعہ سے پورا پورا ادا بھی کر سکتا ہو۔ وہی شاعر ہے +

شاعری کی حقیقت میں یورپ کے محققین کے نزدیک وزن کا ہونا ضرور نہیں۔ لیکن عرب و عجم کے نزدیک ضروری ہے۔ اہل عرب خطبہ اور شعر کو دو مختلف چیز خیال کرتے تھے۔ حالانکہ خطبہ اور شعر میں تخیل اور معنی کے لحاظ سے کچھ فرق نہ تھا۔ ارسطو نے بھی کتاب الشعر میں وزن کو شعر کا ایک ضروری جزو قرار دیا ہے۔ محقق طوسی نے لکھا ہے کہ یونانیوں کے نزدیک شعر کے لئے وزن کی ضرورت نہیں لیکن یہ غلطی ہے

ارسطو کی کتاب الشعر آج موجود ہے۔ اور اس میں صراحتہً اس کے خلاف ہے محقق طوسی کو اس وجہ سے دھوکا ہوا کہ ارسطو نے منطق میں قیاساتِ شعری کا جو ذکر کیا ہے۔ اس میں وزن کو غیر ضروری قرار دیا ہے۔ لیکن قیاس شعری اور چیز ہے اور شعر اور چیز۔ دونوں میں عام و خاص کی نسبت ہے +

شعر کا طبیعت پر اثر کرنا ایک فطری بات ہے۔ شعر در اصل دو چیزوں کا نام ہے۔ مصوّری اور موسیقی۔ اور یہ دونوں چیزیں فطرةً انسان کے دل پر اثر کرتی ہیں۔ قدرت نے انسان میں یہ مادہ رکھا ہے کہ اُس کو تصویر اور نقل سے اس قدر مزہ آتا ہے کہ خود اصل شئے سے نہیں آتا۔ ایک چھپکلی یا کھنکھجورے کو تم دیکھو۔ تو تم کو نفرت ہوگی۔ لیکن اگر کوئی شخص کھنکھجورے کی ایسی تصویر کھینچدے کہ اصل کا دھوکا ہو۔ تو تم کو خواہ مخواہ لُطف آئیگا۔ اسی طرح موسیقی اور راگ کا اثر ہے جو فطرةً طبیعت پر ہوتا ہے۔ یہاں تک کہ جانور بھی اس اثر سے خالی نہیں۔ چونکہ شعر انہی دونوں چیزوں یعنی مصوری اور موسیقی کا مجموعہ ہے اس لئے اس کا دل پر اثر ہونا ایک فطرتی امر ہے۔ اِس سے یہ نکتہ بھی ثابت ہوا کہ شعر میں یہ دونوں باتیں کمال کے جس درجہ پر ہونگی اسی نسبت سے دِل پر اس کا اثر ہوگا +

گناہ

اِک مغربی مہذّب کا مقولہ ہے جس کے معنے ہماری زبان میں یہ ہیں کہ گناہ برائی کا بادل ہے جو بربادیوں سے لبریز ہے۔ الحفیظ! الامان اگر ان لفظوں میں کچھ سچائی ہے اگر اس فقرے میں کوئی حقیقی خوفناک اثر ہے اگر دیکھنے سننے والے کی نگاہیں اور کان واقعی طور سے غور و فکر سے ادھر متوجہ ہیں تو اس میں ذرا شک نہیں کہ ضرور رونگٹے کھڑے ہو جاوینگے۔ دِل لرز جائیگا۔ کلیجہ کانپنے لگیگا اور ندامت کا پسینہ ماتھے پر ہوگا۔ اے گنہگار دل! میں تجھ سے پوچھتا ہوں کیا تو ماں کے پیٹ سے ایسا ہی پیدا ہوا تھا؟ نہیں نہیں اُس عالم کا مجھے یُوں ہی سا خیال کبھی کبھی آجاتا ہے تو اک نورانی آئینہ تھا تو اِک لہلہاتا ہوا کنول تھا۔ تجھ میں سیاہی کا نام ونشان بھی نہ تھا۔ تو پنکھڑی سے زیادہ ہلکا۔ حباب سے زیادہ نازک تھا اور تجھ میں سے بہشت کے پھولوں کی خوشبو آتی تھی۔ ہائے جب میں پنگورے میں لیٹا ہوا انگوٹھا چوسا کرتا تھا۔ وہ گھر کی انگنائی گرمیوں کی راتیں۔ اور وہ کسی ٹھنڈی ٹھنڈی روشنی (چاندنی) کا آپ ہی آپ میری ایک ہی جگہ تک جانیوالی نگاہوں میں گھل مِل جاتا۔ میرے سر پر جو ایک نیلی سی چھت (آسمان) ہوتی تھی اُس میں سفید سفید ہزاروں لاکھوں بلکہ ان گنت چمکتی ہوئی چیزیں (تارے) ابھرا کرتی تھیں۔ وہی ٹھنڈی ٹھنڈی سنہری چیز جو ایک گول گول زرد زرد گل تکئے (چاند) میں سے آتی تھی اُس سے میں پہروں کھیلا کرتا تھا۔ میں بہتیرا ٹھمک ٹھمک کر اپنے ننھے

ہاتھ بڑھاتا کہ کسی نہ کسی طرح اُسے بھی کھینچکر اپنے چھوٹے چھوٹے تکیوں میں ڈالوں لیکن نہیں وہ مجھ سے بہت دور ہوتا تھا اور میرے ہاتھ نہ آتا تھا۔ کبھی کبھی کوئی نرم نرم چیز (ہوا) ایکا ایکی میرے پاس آجاتی تھی میرے جھنڈولے بالوں کو پریشان کردیتی تھی میرا ننھا سا کرتا اُڑنے لگتا تھا اور بے اختیار میری آنکھیں بند ہوجاتی تھیں۔ بہت سی آوازیں میرے کانوں میں آیا کرتی تھیں مگر میں اپنی دھن میں ایسا ہوتا تھا کہ کسی کی ایک نہ سنتا تھا۔ میری پاک دنیا وہی تھی میری سچی خوشی کا وہی زمانہ تھا میری بادشاہت کی وہی گھڑیاں تھیں اور اس زمانے میں اوآستین کے سانپ (دل)، تو مجھے کیا بھلا معلوم ہوتا تھا؟ اس کے بعد میرا دودھ بڑھا میں گھٹنوں چلنے لگا اور مجھے ضدیں کرنی آگئیں۔ آہ اے کافر (دل) بس یہ ابتدا تھی میرے گناہ کی۔ پہلا گناہ جس کی مجھے عادت پڑنی شروع ہوئی وہ میری پیاری ماں کی نافرمانی تھی۔ وہ مادرِ مہربان جو ہمیشہ آپ گیلے میں سوتی اور مجھے سوکھے میں سلاتی تھی۔ کڑوی کسیلی ثقیل چیزیں کھانے پینے کو منع کرتی تھی اور میں ضدیں کرتا تھا۔ مچلتا تھا۔ روتا تھا کہ نہیں میں تو یہی کھاؤں گا۔ وہ عفیفہ مکرمہ مجھ کو بیاری کے خوف ہوا زدگی کے خیال سے پانی سے نہیں کھیلنے دیتی تھی۔ گود سے نیچے نہیں اُتارتی تھی اور میں بے شرم بے حیا نافرمان اس کی ایک نہ سنتا تھا۔ اُسکے حقوق سب بھلا دئے تھے۔ زبردستی اُترتا تھا کیچڑ میں کھیلتا تھا۔ کپڑے سان لیتا تھا اور جو چیز پاتا تھا منھ میں ڈال لیتا تھا۔ رفتہ رفتہ وہ ممنوع باتیں میری عادت بنگئیں اور شفیق ماں باپ نے لاڈلے بچے کی ہر تقصیر سے چشم پوشی کی۔ افسوس صد افسوس یہ چشم پوشی کرنی

عین نقصان بھی وہی عادتیں بڑھتے بڑھتے گناہوں کی شکل پیدا کرنے لگیں۔ ایک سے دو اور دو میں سے چار شاخسانے پیدا ہوئے اور اس شفاف دل پر جو فطرت نے اپنے نور سے مجلّا کر کے مجھے دیا تھا بدنما سیاہی کی جھلکیاں بھی نمودار ہونے لگیں۔ گو اس وقت اس تغیر کے سمجھنے کی قدرت نہیں رکھتا تھا مگر رفتہ رفتہ محسوس کرنے لگا کہ کبھی قدر بڑا ہوا تو مجھے ادب اداب کی تربیت ہونے لگی لکھنا پڑھنا شروع ہوا زینت مرادوں کی بھرمار تو پہلے ہی سے تھی اللہ آمی (آمین) پیر سلامی تو ایک مدت سے ہو رہی تھی اب اُستاد رکھے جانے لگے نئے نئے چاؤ نئے نئے ارمان۔ دو سے چار آنکھیں ہو گئیں۔ اور ان مدارج نے مجھے اور بھی شہ دینی شروع کی۔ مجھ پر اس پیار اخلاص اور دھوم دھام نے اُلٹا اثر کیا۔ اب میں ضرورتاً اپنی جان چھڑانے کے لئے چغلیاں کھانے لگا۔ جھوٹ بولنا آ گیا۔ ایک کی دو اور دو کی چار اِدھر کی اُدھر لگانی سیکھیں اور آئے دن نئے سبق کے بدلے مختلف چھوٹے بڑے چھوٹے گناہوں کے سبق حفظ یاد کر لئے۔ بُرے کھیلوں کی طرف رغبت۔ اچھی باتوں سے نفرت۔ محلے کے رذیل بچوں سے گالی گلوچ۔ اپنی بریت کے لئے چھوٹی جھوٹی قسمیں۔ حیلے بہانے پہروں گھر سے غیر حاضر رہنا سیکھا۔ بزرگوں نے گو اس پر اکثر توجہ کی۔ سزائیں بھی دیں۔ نیک صحبت نیک راہ چلانا چاہا مگر ابتدا بگڑ چکی تھی ؎

خوئے بد در طبیعتے کہ نشست
نرود جز بوقتِ مرگ از دست

گناہ کی لت جو خمیر میں سرائیت کر گئی تھی اب کب چھٹتی تھی۔ پہلے

روپیہ پیسہ خاطر خواہ ملتا تھا اب تا دیاگا ہاتھ کھینچا جانے لگا۔ یہ دیکھ کر میں نے قرض چوری دغا بازی فریب کے آگے ہاتھ پھیلا دیا۔ اسی طرح جوان ہوا تو بے ایمانی ظلم ناعاقبت اندیشی نخوت شرارتیں میرے ساتھ جوان ہوئیں۔ بے ادبی جہالت پرستی اور بُری صحبتوں سے تو دلی لگاؤ تھا ہی۔ تھوڑے ہی دن میں پنج عیب شرعی کے علاوہ دنیا بھر کے بُرے فعلوں میں طاق ہو گیا اور ہر گناہ کے لئے مجھ میں ایسی حیرت ناک جرأت خود بخود پیدا ہو گئی کہ ایسی کبھی میرے خیال میں بھی نہیں آسکتی تھی +

محنت مشقت کس جانور کا نام تھا۔ آپ سے آپ موٹا مشٹنڈا ہونا چاہیئے تھا۔ چنانچہ جوانی کے زور بل کو حظِ نفس۔ مطلب براری۔ دھینگا مشتی اور ہشت مشت میں صرف کیا۔ رفتہ رفتہ شورہ پشتی اختیار کی اور اک اچھے خاصے جتھے کا سرغنہ بنگیا۔ اب کیا تھا کڑوا کریلا نیم چڑھا وہ اور بھی کڑوا ہو گیا۔ اب گناہوں کی کیا کمی تھی جس وقت چاہتا تھا اور جو چاہتا کر بیٹھتا تھا۔ خوف خدا میرے دل میں سے اس طرح اُڑ گیا جس طرح منافق کے دل میں سے نور ایمان۔ اپنی کوئی چیز میری نظر میں اچھی نہیں معلوم ہوتی تھی یہانتک کہ میری بیوی مجھے بُری معلوم ہونے لگی۔ میری نگاہیں بالکل ناپاک ہو گئیں۔ حظ نفس کے لئے بڑے بڑے گناہ۔ مثلاً چوری ڈاکہ اور قتل انسان میرے لئے کھیل ہو گئے۔ سینکڑوں دل میں نے دکھائے۔ جھوٹی گواہیاں میں نے دیں۔ آپس میں لڑائیاں میں نے ڈلوائیں۔ حلال حرام میں مجھے تمیز نہ رہی۔ لوگوں کے حق میں نے چھین لئے جن سے شرم کو بھی شرم آئے وہ وہ ناجائز ظالمانہ برتاؤ میں نے کئے حتےٰ کہ غریبوں کے گلے کاٹ ڈالے۔ عورتوں کو بیوہ۔ بچوں کو یتیم

بیکس اور بے خانماں بنادیا۔ ان مظالم اور شرمناک واقعات سے کیا ہُوا؟ یہ ہوا کہ وہ محبت بھری نگاہیں جو بچپن میں میری بھولی بھالی صورت پر اکثر قربان ہوا کرتی تھیں اب ان میں زہر بھر گیا تھا اور جب کوئی مجھے دیکھتا تھا تو گویا اُن آنکھوں میں خون اتر آتا تھا۔ رات دن اپنے سامنے میں دنیا کو مرتے دیکھتا مگر اپنی موت کا مجھے کبھی خیال بھی نہ آتا تھا گویا موت اوروں ہی کے لئے بنائی گئی تھی اور میں اُس سے بالکل آزاد تھا۔ میں خدا کے بندوں کو اپنا محکوم بادشاہ وقت کو اپنا ہمعصر اور پرائے مال کو اپنی ہی ملکیت سمجھتا تھا اُن طاقت ور ہاتھ پاؤں پر مجھے بڑا ناز تھا جو فطرتی طور سے قوی اور میرے سب گناہوں میں شریک رہا کرتے تھے مگر خدا جانے یہ کیا بات تھی کہ باوجود تمام بے باکیوں کے میرا ہزار دفعہ کا تجربہ ہے کہ میں جب کبھی کسی چھوٹے سے چھوٹے یا بڑے سے بڑے گناہ کا قصد کرتا تھا تو میرے اسی دل میں سے جواب کثرت جرائم سے بالکل سیاہ ناکارہ۔ فولاد سے زیادہ سخت اور گندہ ہو گیا تھا خود بخود یہ لفظ کوئی کہتا ہوا سنائی دیتا تھا کہ او روسیاہ! بدبخت کیوں اپنی جان پر ظلم کرتا ہے۔ کیوں جہنم میں گھر بناتا ہے ظالم خدا کے غضب سے ڈر اور پہلے اس بوجھ کو ہلکا کرلے جواب کوئی دم جاتا ہے تیری گردن توڑ ڈالیگا۔ آہ اس وقت میں سخت پریشان ہو جاتا تھا۔ بھونچکا ہو کر ادھر اُدھر دیکھنے لگتا تھا کہ یہ کس کی آواز ہے مگر کوئی کہنے والا انسانی صورت میں نہیں دکھائی دیتا تھا اور میں پھر اپنی عادت کے موافق گناہوں کی لمبی چوڑی فہرست میں جسے لکھتے لکھتے لکھنے والا بھی عاجز آگیا ہوگا اک اور اضافہ کرنا چاہتا تھا اور پھر مجھے وہی صدائے مہیب آنے لگتی تھی جس کو کبھی کبھی

میرے تن بدن میں رعشہ بھی ہو جاتا تھا مگر افسوس ہے کہ کہنے والا تو گناہ کے اختتام تک برابر اسی لب ولہجہ میں مجھے ملامت کیئے جاتا تھا اور میں مساوات میں پڑ کر اس کی پروا نہیں کرتا تھا۔ یہاں تک کہ آخر وہ ٹلنے والی گھڑی وہ اٹمنسٹ ہونی شدنی۔ وہ جس سے ہر منٹ ہر ثانیہ کے بعد دنیا میں ایک بڑی تعداد جانداروں کی اپنے قالب چھوڑ دیتی ہے گدا سے لیکر شہنشاہ تک جس سے عاجز ہیں اور جس نے گذشتہ ۱۹۰۱ء میں جنوری کی ۲۲ ویں کو شام کے سات بجے کچھ منٹ پر قیصرہ ہند ملکہ معظمہ کو باوجود کروڑہا جانوں پر قابض ہونے۔ دنیوی اعتبار سے جواہرات میں تُلنے ہزارہا میل مربع تر و خشک پر حکمران کہلانے اور منتخب روزگار ڈاکٹروں کی موجودگی کے بھی ایک پلک مارنے نہ دی (موت) میرے سر پر بھی آ گئی۔ اب میری آنکھیں کھلیں کہ میں کون تھا کس لیئے بنایا گیا تھا اور میں نے یہاں آکر کیا کیا۔ آہ! میرے دوستو! یہ آخری لفظ اب میری زبان سے نہیں ادا ہوتے میرے وہ عمر بھر کے رفیق جن کے بھروسے اور قوت پر جن کے خوش رکھنے اور آرام دینے کے لئے جن کی زیبائش کے واسطے جنہیں تر و تازہ رکھنے کی غرض سے تمام بداعمالیوں کی پوٹ میں نے اپنے سر پر رکھ لی تھی ایک ایک کر کے مجھ سے جدا ہونے لگے اور مجھے یاداشش اعمال کے لیئے تنہا چھوڑ دیا آنکھیں بے نور ہو گئیں کان بہرے ہو گئے ہاتھ پاؤں سست پڑ گئے۔ حواس جاتے رہے دم رکنے لگا اور کسی نے سر سے لیکر پاؤں تک رگ رگ میں سے سانس نکال لیا۔ اب وہ ظالم اور وہ میرے اپنے ہاتھوں کے بوئے ہوئے کانٹے لینے وہی شرمناک عبرت انگیز واقعات جو

میری ساری ناپاک زندگی میں ظہور پذیر ہوئے تھے سب یکے بعد دیگرے میرے سامنے آنے لگے۔ دنیا کا وہ تمام مال جو میں نے ہزار جھوٹ - پیچ - پھند - فریب اور خون ریزیوں سے جمع کیا تھا سب کا سب نہائیت حسرت کے ساتھ دوسروں کے لئے چھوڑنا پڑا - ان ستم رسیدوں کے مُردہ جسم جنکے گلوں میں پھانسیاں ڈال ڈال کر میں نے زبردستی لٹکا دیا تھا - اڑیاں رگڑتے دم توڑتے جنہیں دیکھا تھا پھر انہیں مہیب صورتوں میں گویا میری چھاتی پر چڑھے آتے تھے۔ وہ عورتیں جن کو میں نے ستایا تھا وہ معصوم بچے جنہیں میں نے یتیم بنایا تھا انتقام کی تیز چھُریاں لئے ہوئے میری آنکھوں میرے پہلوؤں میں بھونکنے کے لئے دوڑے چلے آتے تھے۔ بیسیوں ہاتھ تھے جو میری طرف بڑھ رہے تھے - سینکڑوں کرخت اور ہولناک آوازیں تھیں جو مجھ پر یورش کر رہی تھیں ان سب پر طرّہ سب سے زیادہ خطرناک جو نظارہ تھا جسے دیکھتے ہی میرے پاؤں کے نیچے کی زمین نکل گئی - میرا کلیجہ شق ہو گیا اور میرے سخت دل کے ٹکڑے ٹکڑے ہو گئے وہ یہ تھا کہ ملک الموت کا زبردست ہاتھ میری گردن پر تھا - فرشتگان عذاب مجھ پر مسلط تھے قہر خدائے قہار جوش زن تھا اور دوزخ میرے لئے منہ کھولے ہوئے تھا۔ آہ آہ! کاش اس سے پہلے چلتے ہاتھوں میں کوئی نیک کام کر گذرتا - او ظالم خود بخود برباد ہو جانے والے! او اپنے ہاتھوں اپنے پاؤں میں کلہاڑی مارنے والے! او غرور کے پتلے! او خود غرضیوں کے دیوانے او لالچ کے دیوتا! او بے بنیاد کائنات! اسوقت تو اس رحمت العالمین کی خدمت میں سر نیاز جھکا دے - اس وقت تو رجوع قلب سے دو آنسو نکال کر نجات کا

طالب ہو جا۔ آہ آہ تو تو سب کچھ کرے مگر افسوس ہے کہ اب وقت نہین رہا۔ گناہوں کی دلچسپی نے تجھے کہیں کا نہیں رکھا۔ اے بدنصیب بندے اب کچھ نہیں ہو سکتا +

شیلی

روم مٹ گیا۔ لیکن اس کی عظمت و شان کی یادگاریں باقی ہیں۔ پرانے رومیوں کی وسیع فتوحات کے نشان۔ اور ان کی تہذیب کے مٹے مٹے آثار چپے چپے پر سیاح کی توجہ کو اپنی طرف منعطف کر لیتے ہیں۔ اور ایک سرد آہ یا ایک ہمدردی کے آنسو کا خراج طلب کرتے ہیں۔ ان یادگاروں میں شاید سب سے زیادہ قابلِ ذکر ان بہادروں کی قبرین ہیں۔ جنہوں نے اپنا خون پانی ایک کر کے روم کو رومتہ الکبریٰ بنایا تھا اور اس کی رفعت و شان کو ساری دنیا سے منوایا تھا۔ روم کے قبرستان ایسے لوگوں کی نعشوں سے پر ہیں۔ جن میں سے ہر ایک بجائے خود اپنے ملک کے لئے سرمایۂ ناز تھا۔ اور جن کے نام اس وقت صرف اس وجہ سے مٹ گئے ہیں۔ کہ انکی شہرت کو چند بزرگتر ناموں نے اسی طرح گہنا دیا ہے۔ جس طرح کہ چھوٹے چھوٹے ستارے آفتاب کی شعاعوں کے سامنے ماند پڑ جاتے ہیں۔ اسی مردم خیز شہر کے ایک مشہور قبرستان میں جس میں اہرام کائس سٹس واقع ہے۔ ایک شمالی گلشن کے بھی دو دو در افتادہ پھول دفن ہیں۔ جنکی مہک اس وقت تعلیم یافتہ دنیا میں ہر طرف

پھیل رہی ہے۔ان میں سے ایک تو انگلستان کا ہونہار شاعر کیٹس ہے۔جس کی شاخ زندگی کو پھل لانے سے پہلے ہی موت کے تیز و بیرحم چاقو نے قطع کر دیا۔اور دوسرا وہ شاعر عندلیب عفت ہے جس کا نام زیبِ عنوان ہے۔وہ مقام جہان ایک پتھر کی قبر پر لاطینی میں لفظ "کارِ کارڈیم" یعنے "دلِ دلہا" کندہ ہیں۔ہر ایک شاعری کے دلدادہ کے لئے متبرک مقام ہے۔کیونکہ اس قبر میں اس شخص کی خاک دفن ہے۔جسے اگر فخر روزگار کہیں تو بجا ہے۔وہ ان لوگوں میں سے ہے جنکو روم کی پاک سرزمین میں دفن ہونے سے کوئی فخر نہیں بلکہ جن کی خاک پر خود روم کو بھی ناز ہونا چاہیئے۔ہم جرأت اور یقین کے ساتھ روم سے سوال کر سکتے ہیں کہ یوں تو تیری خاک میں لاکھوں ہی گہر نہاں ہیں۔لیکن تو ہی بتلا۔کہ

دفن تجھ میں کوئی فخرِ روزگار ایسا بھی ہے
تجھ میں پنہاں کوئی موتی آبدار ایسا بھی ہے

پرسی بشی شیلے۔انگلستان کے ایک پرانے امیرانہ گھرانے میں ۱۷۹۲ء میں پیدا ہوا۔اس کے آباواجداد طبقہ شرفا میں شمار کئے جاتے تھے۔اور اکثر اعلیٰ اعلیٰ عہدوں پر ممتاز رہے تھے۔شیلے کی پیدائش کے وقت اس کا دادا جیشئے بیرونٹ کا خطاب حاصل تھا۔خاندان کا سرپرست تھا اور اس کا باپ پارلیمنٹ کا ایک سربرآوردہ ممبر تھا۔شیلے کو شروع سے تعلیم و تربیت کے عمدہ مواقع حاصل تھے۔لیکن بچپن ہی سے اس کی بیچین طبیعت ہر قسم کی قیود سے اپنے تئیں آزاد کرنے کی خواہشمند تھی اس کا رنگ ڈھنگ گھر میں بالکل نرالا تھا۔لوگ کہتے ہیں کہ اُولڈ [illegible]

مگر یہاں معاملہ برعکس تھا۔ مسٹر سٹیمو تھی شیلے (پرسی کے باپ) اور پرسی کی اپنی طبیعت میں بُعدالمشرقین تھا۔ پرسی کا باپ ایک معمولی عقل کا بھاری بھرکم۔ مالدار آدمی تھا۔ لیکن پرسی کے دل میں وہ شعلہ نہاں تھا۔ جو خاص آسمانی نور کا ایک ٹکڑا ہوتا ہے۔ اُس نے قدرت سے شاعرانہ طبیعت پائی تھی۔ اور علاوہ شاعرانہ طبیعت کے اپنی بنی نوع کی ہمدردی اس کے رگ وپے میں سرائت کیئے ہوئے تھے۔ جسمانی خوبصورتی اُس نے اپنی ماں سے ورثے میں پائی تھی۔ جو غالباً ایک ذہین اور قابل عورت تھی۔ اس کے خدوخال نازک تھے۔ اس کی آنکھیں غیر معمولی طور پر روشن اور چمکدار تھیں اور اُس کے اعصاب نہائیت کمزور اثرپذیر تھے۔ اس کی آواز البتہ نہائت تیز اور مہین تھی۔ اور بسا اوقات کانوں کو ناگوار گذرتی تھی +

شیلے کی انسانی ہمدردی کچھ ابناءالسبیل تک ہی محدود نہ تھی۔ بلکہ اس کے اپنے خویش واقارب بھی اس میں حصّہ لیتے تھے۔ اس کو اپنے سب عزیزوں سے محبت تھی۔ اپنے باپ سے اوائل عمر میں خاصی مولانست تھی۔ ایک مرتبہ جب سٹیمو تھی شیلے سخت بیمار ہوئے تو پرسی رات کو اپنے بچھونے میں سے نکل کر اکثر انکی خبر لینے جاتا تھا۔ اور گھنٹوں اُن کے کمرے کے دروازے سے لگا کھڑا رہتا تھا۔ لیکن سب سے زیادہ شفقت اسے اپنی بہنوں سے تھی۔ اور اس کا اکثر وقت انہیں کی ہمراہی میں کٹتا تھا۔ انہیں آرام دینے کے لئے وہ خود تکلیف کا متحمل ہو جاتا تھا۔ اور جس طرح بھی بن پڑتا تھا۔ انہیں خوش رکھنے کی کوشش کرتا تھا۔ اس برادرانہ محبت کا اس کی شاعری پر بہت بڑا اثر پڑا۔ اور جس عزت و وقعت کی نگاہ سے وہ طبقہ اناث کو دیکھتا تھا

اس کا پتہ لگانے کے لئے ہمیں اس کے شروع کے حالات پر نظر ڈالنی چاہیئے۔ اس میں کچھ شبہ نہیں کہ اپنی بہنوں کی بڑھی ہوئی محبت نے ہی اس کو عورتوں کی عزت کرنے کا پاک اصول سکھلایا تھا +

شیلے کی ابتدائی تعلیم برانٹ فورڈ۔ اور بعد ازاں ایٹن کے مشہور آفاق سکول میں ہوئی۔ دونوں جگہ اُس کے ساتھ اچھا سلوک نہیں کیا گیا۔ کیونکہ اُستاد اور ہم مکتب دونوں اس پُراسرار لڑکے کو سمجھنے اور سمجھ کر ہمدردی کرنے سے قاصر تھے۔ شیلے کی عادات اور خصائل عجیب وغریب تھیں۔ اور خواہ مخواہ اُسے ہر کہ ومہ کی نظروں میں مشتبہ اور حقیر بنائے دیتی تھیں۔ مدرسے کی باقاعدہ تعلیم سے اُسے مطلق ہمدردی نہ تھی گو لاطینی اور یونانی خصوصاً موخرالذکر زبان کے علم ادب کا اسے بے انتہا شوق تھا۔ اور یونانی شعرا کا کلام اکثر زیر مطالعہ رہتا تھا۔ شیلے کو بعید از قیاس افسانوں۔ اور سحر وطلسمات کی داستانوں سے بھی بہت دل لگی تھی۔ اور اس میں شبہ نہیں کہ اس قسم کی کتابوں کے مطالعہ سے اسے اپنی قوتِ متخیلہ کی ترقی میں بہت مدد ملی۔ لیکن ان کا ایک بڑا نتیجہ یہ بھی ہوا کہ وہ ان میں سے اکثر لچر باتوں پر یقین کرنے لگا اور کیمیاگری اور ساحری کا شوق ہو گیا۔ اس کا اکثر وقت علم کیمیا کے خطرناک تجربوں میں گذرتا تھا جن کی وجہ سے وہ اضحوکۂ روزگار بن گیا۔ اس کے ہم مکتب اسے حقارت بلکہ نفرت کی نگاہ سے دیکھنے لگے۔ اور آزار دینے پر کمربستہ ہو گئے۔ سارا مدرسہ ایک طرف تھا اور بیچارہ شیلے ایک طرف مجنون شیلے کے نام سے اسے خطاب کرتے تھے۔ اور رنج دینے میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہ کرتے تھے۔ یہانتک کہ بسا اوقات مارپیٹ سے بھی نہ چوکتے

تھے۔ اس قسم کے سلوک اور برتاؤ کا جو اثر شیلے جیسی نازک طبیعت کے لڑکے پر ہو سکتا ہے وہ واضح ہے۔ ہم کہہ چکے ہیں کہ ابتدا ہی سے اسے ہر قسم کی قیود سے نفرت تھی۔ اب وہ ہر ایک قسم کی حکومت اور افسری کو ظلم اور غضب سے تعبیر کرنے لگا اور با اختیار لوگوں کے جبر و تعدی اور ناانصافی کا نقش اس کے دل پر خوب جم گیا۔ انسانی آزادی اور ہمسری کے تکلیف وہ خیالات اس کے دل میں جوش مارنے لگے۔ اس زمانے کی ہوا ہی میں کچھ یہ تاثیر تھی۔ ہر طرف انسانی ہمدردی کی صدائیں بلند تھیں۔ اور ہر ایک فرد بشر کو مساوات اور برابری کی نگاہ سے دیکھنے کا سبق یورپ کے ہر ملک میں پڑھایا جارہا تھا۔ فرانس کی بغاوت اسی فلسفے کا نتیجہ تھی۔ بلکہ یوں کہنا چاہیے۔ کہ یہ فلسفہ ہی خود ایک بغاوت کے آنے کی خبر دیتا تھا۔ جس میں کہ یہ اصول زبان اور قلم کے ذریعہ سے نہیں۔ بلکہ زبان تیغ اور دہن توپ کے ذریعہ سے دنیا کو تعلیم کئے جائینگے۔ شیلے کی اس زمانے کی تحریروں سے پتہ چلتا ہے کہ اس کی زندگی تلخ ہوگئی تھی۔ اور دنیوی مظالم و مصائب کا خیال ہر وقت اس کی طبیعت میں خلش پیدا کرتا رہتا تھا۔ ہر قسم کی انسانی قیود یہانتک کہ مذہب اور رسم و رواج کی کڑی زنجیر بھی اُس کی نظروں میں انسانی ترقی کی سد راہ معلوم ہوتی تھی۔ اور اُس نے اپنے دل سے عہد کر لیا۔ کہ میں اُن میں سے کبھی کسی قید کا نہ تو پابند ہونگا اور نہ انکی عزت کروں گا۔ کیونکہ یہ سب انسان نے خود اپنی نوع پر بیجا تشدد اور تحکم کی غرض سے قائم کر رکھی ہیں اور خدا کی ذات والا صفات سے انہیں کچھ تعلق نہیں ہے۔ اس قسم کا خیال بیجا جرأت سے

مبرا نہیں بلکہ یوں کہنا چاہئے کہ یہ بجائے خود ایک مجرمانہ خیال ہے۔ لیکن شیلے کے حق میں جو نتائج اس سے مرتب ہوئے اُن کے سامنے ہم تھوڑی سی کم فہمی اور کوتاہ نظری کو بہ آسانی معاف کر سکتے ہیں +

سکول کی ابتدائی تعلیم سے فارغ ہو کر۔ یونیورسٹی کا ارادہ ہوا۔ اکسفورڈ کے یونیورسٹی کالج میں شیلے کے اکثر بزرگوں نے تعلیم پائی تھی۔ چنانچہ وہ بھی اسی کالج میں داخل کیا گیا۔ اور بطور ایک انڈر گریجوایٹ کے یونیورسٹی کی ابتدائی تعلیم پانے لگا۔ یونیورسٹی میں آنے سے اُسے دو فوائد حاصل ہوئے ایک تو یہ کہ چند ہم مذاق احباب مل گئے۔ اور دوسرے پہلے کی نسبت زیادہ آزادی اور تنہائی میسر آگئی +

لیکن شیلے جیسی طبیعت کو کہاں چین پڑتا ہے۔ انہیں تو ع بہر زمیں کہ رسیدیم آسماں پیداست۔ ہر جگہ کہنا پڑتا ہے۔ اکسفورڈ میں جبر و تشدد مفقود نہ تھا۔ اور اکثر پروفیسر سکول کے اُستادوں کی نسبت کچھ چنداں سلیم الطبع یا خوش مزاج نہ تھے۔ اس پر طرفہ یہ ہوا کہ شیلے صاحب کو اپنی ایک رشتہ دار لڑکی ہیریٹ گرو نامی سے بہت کچھ انس ہو گیا تھا۔ لیکن اس کے والدین کو ان دونوں کی شادی منظور نہ ہوئی اور اس کی نسبت ایک اور جگہ ٹھہر گئی۔ شیلے کی طبیعت پر اس واقعہ سے بہت صدمہ ہوا۔ اور ذی اختیار لوگوں کی ناانصافی کا اور بھی زیادہ یقین ہو گیا۔ ان دنوں طبیعت مذہب کے الجھیڑوں کی طرف زیادہ مائل تھی۔ ایک رسالہ خدا کو نہ ماننے کی ضرورت پر لکھ مارا۔ اور اس کی ایک ایک جلد سب یونیورسٹی کے عہدے داروں کے پاس تبلیغ حق کی نیت سے بھیج دی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ یونیورسٹی سے بیک بینی و دوگوش نکالے گئے۔ اس حرکت کو ہم صرف

کم عمری اور حماقت پر ہی محمول کر سکتے ہیں۔ خصوصاً اس وجہ سے کہ شیلے
دراصل ایک اعلیٰ وارفع ذات کا قائل اور خدا کی ہستی کو ماننے والا تھا۔ اُسے
اگر کچھ پرخاش تھی تو عیسائیوں اور یہودیوں کے خدا سے۔ جس پر (اس کے
خیال کے بموجب) ظالم وجابر ہونے کا احتمال ہو سکتا ہے لیکن ایسے باریک
وفلسفیانہ نکتے۔ اکثر یونیورسٹیوں کے انتظام میں خلل ڈالتے ہیں۔ اور
ہمارے خیال میں جو سزا شیلے کو ملی وہ کچھ بیجا نہ تھی۔ تاہم ہمیں اس کی اخلاقی
جرأت کی تعریف کرتے ہی بن پڑتی ہے +

یونیورسٹی سے نکلتے ہی باپ بیٹوں میں ناچاقی ہو گئی۔ مسٹر ٹیموتھی شیلے
چاہتے تھے کہ شیلے نادم ہو کر اپنے کئے سے تائب وپشیمان اور یونیورسٹی کے
افسروں سے معافی کا خواستگار ہو۔ لیکن شیلے کا یہ زعم تھا کہ ع یہ وہ
نشے نہیں جنہیں ترشی اُتار دے۔ دونوں میں ایک عرصے تک
خط وکتابت کے ذریعے سے بحث ہوتی رہی کیونکہ شیلے ان دنوں
اپنے ایک دوست کے ہمراہ گھر سے دور لنڈن میں براج رہے تھے۔
لیکن نتیجہ کچھ نہ ہوا۔ وہ اپنی ضد پر قائم یہ اپنی ہٹ پر تلے رہے ہمیں
اس انیس سالہ لڑکے پر حیرت ہوتی ہے جو اتنی سی عمر میں یہ دم داعیہ
رکھتا تھا کہ ع سارے جہان کا درد ہمارے جگر میں ہو +

لنڈن میں ایک نیا گل کھلا۔ شیلے کی بہنیں لنڈن کے ایک زنانہ
سکول میں تعلیم پاتی تھیں۔ اور انکا بھائی اکثر ان سے ملنے جایا کرتا تھا
اسی سکول میں ایک اور شانزدہ سالہ لڑکی ہیریٹ وسٹ برک نامی
بھی پڑھتی تھی۔ جس کا شیلے کی بہنوں سے بہت کچھ ارتباط واتحاد تھا۔
قدرتی طور پر شیلے اور ہیریٹ کو اکثر ایک دوسرے سے ملنے کا اتفاق

پیش آتا رہتا تھا۔ بلکہ بسا اوقات ایسا ہوتا تھا کہ ہیریٹ شیلے کے پاس اس کی بہنوں کی طرف سے پیغامبر بنکر آتی تھی۔ ہیریٹ کا باپ ایک سخت گیر اور بد مزاج آدمی تھا۔ اور وہ بیچاری اکثر اس کے ہاتھوں سے نالاں رہتی تھی۔ شیلے کو اس بدنصیب لڑکی سے ہمدردی سی ہو گئی اور رفتہ رفتہ اس ہمدردی نے محبت کی صورت اختیار کر لی۔ ہیریٹ کے باپ کو بھی اس شادی میں کوئی اعتراض نہ ہو سکتا تھا۔ کیونکہ وہ ایک اونے درجے کا آدمی تھا۔ اور شیلے جیسے عالی نسب کے ساتھ رشتہ ناطہ کرنا اس کے لئے عین عزت و افتخار کا باعث تھا۔ لیکن ان دونوں نے مسٹر ویسٹ برک کی اجازت کا بھی انتظار نہ کیا اور چپکے چپکے شادی کر لی۔ یہاں اتنا بیان کر دینا ضروری ہے کہ شیلے کو اس وقت تک ہیریٹ کی طرف سے بالکل اطمینان نہ تھا۔ اور اتنی جلدی شادی کرنے کی محض یہ وجہ ہوئی کہ ہیریٹ نے ایک دن اپنے باپ کی بدسلوکی کی بہت شکائیت کی اور یہ کہا کہ میں سخت مصیبت میں گرفتار ہوں شیلے کا شاعرانہ دل موم ہو گیا۔ اور وہ حبالۂ ازدواج میں بندھ گیا۔ شادی کی خبر سنکر مسٹر ٹیموتھی شیلے اپنے بیٹے سے بالکل دست بردار ہو گئے اور نو کتخدا میاں بی بی کو مفلسی کا سامنا کرنا پڑا۔ کچھ عرصے تک اِدھر اُدھر پھرتے رہے۔ اس کے بعد آئرلینڈ میں ناراض رعایا کی گورمنٹ کے خلاف مدد کرنے کی غرض سے چلے گئے۔ وہاں کچھ عرصے تک مقیم رہے۔ اور شیلے آزادی کے حامیوں کی دامے درمے قدمے سخنے مدد کرتے رہے۔ اور بالآخر اپنے تئیں گورمنٹ کی نظروں میں مشتبہ بنا کر بمجبوری واپس ہوئے اور اگر دوبارہ

لنڈن میں رہائش اختیار کرلی۔

اثنائے سفر ہی میں میاں بی بی میں کچھ نا اتفاقیاں شروع ہوگئی تھیں خصوصاً اس وجہ سے کہ ہیریٹ کی ایک بہن الا نزا ہر وقت سر پر مسلّط رہتی تھی۔ اور شیلے کو یہ دخل در معقولات نہائت ناگوار گذرتا تھا۔ لندن پہونچتے پہونچتے شیلے کے دل میں ہیریٹ کی طرف سے کچھ بے لطفی سی پیدا ہوگئی اور اس کے خیالات میں بہت کچھ تغیر ہوگیا۔ لندن میں آکر ایسے سامان پیش آئے جن کی وجہ سے یہ بے لطفی رفتہ رفتہ اپرواہی بلکہ نفرت سے مُبدّل ہوگئی۔ شیلے کے دل میں ہیریٹ کے سوا ایک اور نے گھر کر لیا جو ہیریٹ کے برابر حسین اور ہیریٹ سے بدرجہا زیادہ لایق اور ذہین لڑکی تھی +

لندن میں ان دنوں ایک شخص ولیم گاڈون نامی رہتا تھا جسکی زندگی دوکانداری اور فلسفے جیسے دو مخالف و متباعد مشاغل میں گذرتی تھی۔ اس دوکاندار فیلسوف کی کتابیں آزادی کی کچھ بیجا اور بجا چیخ پکار کی وجہ سے بہت مقبول اور ہر دل عزیز بن رہی تھیں۔ شیلے کو بھی اس سے زیادہ عقیدت تھی۔ اور خط وکتابت کے ذریعہ سے عقیدت کا اظہار بھی ہوچکا تھا۔ پہلا کام جو شیلے نے لندن میں آکر کیا وہ یہ تھا کہ تقدّس مآب حضرت گاڈون کی زیارت سے مشرّف ہوا۔ اس گاڈون کی ایک نوجوان بیٹی میری نامی بھی تھی جس نے ذہانت اور حسن اپنی ماں سے اور فلسفہ اپنے باپ سے میراث میں پایا تھا۔ میری گاڈون کے خیالات انسانی تعلقات کے بارے میں بہت کچھ اپنے باپ سے ملتے جلتے تھے۔ دونوں رسم و رواج کی قیود کو

انسانی ترقّی کے سدِ راہ تصور کرتے تھے۔ شیلے کو اس لڑکی کی گفتگو اور صحبت میں وہ دنیا نظر آئی جس کی اُسکی آنکھوں نے کبھی پیشتر سیر نہ کی تھی۔ دونوں خودبخود ایک دوسرے کی طرف کھچنے لگے۔ اور دونوں نے ایک دوسرے میں اپنا سچا مشیر مددگار پالیا۔ میری شیلے کا اجتماع دو روحوں کا اجتماع تھا۔ اور ایسے ہی اجتماع کو ہم سچی شادی کہ سکتے ہیں شادی کی رسم کو دونوں فضول بلکہ مضر خیال کرتے تھے۔ خود گاڈون ہی کی یہ تعلیم تھی۔ اس لئے کسی سے کچھ کہے سُنے بغیر دونوں ایک دن بوئے گل کی طرح فرار ہو گئے۔ اور اُدھر گاڈون اور ادھر ہیریٹ ہاتھ ملتے رہگئے۔ شیلے کا یہ فعل ہم لوگوں کی نظروں میں کس قدر معیوب کیوں نہ ہو۔ اس میں کلام نہیں کہ اس جیسی طبیعت اور اس جیسے خیالات والے شخص سے ایسے حالات میں محصور ہو کر یہی توقع ہو سکتی تھی۔ ہیریٹ کی طرف سے اسے پہلے ہی بیزاری پیدا ہو گئی تھی۔ دُنیا کی نفرین اور تعریف کی اسے چنداں پروا نہ تھی۔ اس پر یہ بات مزید ہوئی کہ ایک ہم خیال اور ہمدرد رفیق مل گئی جو ساری عمر اس کا ساتھ دینے پر تیار تھی۔ دونوں نے دنیا کی رائے کو بالائے طاق رکھدیا اور جو اپنے جی میں آیا کر گذرے۔

شیلے کی زندگی کے اس واقعہ پر مخالف و موافق تحریروں سے دفتر کے دفتر سیاہ کئے گئے ہیں اور بعض معتبر سوانح نویسوں نے ہیریٹ کے چال چلن پر بھی حرف رکھا ہے۔ ہم لوگ جو ان سب معاملات کو دوسروں کی آنکھوں سے دیکھتے ہیں صرف یہی کہ سکتے ہیں کہ واللہ اعلم بالصّواب۔ لیکن اس میں کلام نہیں کہ میری کے نمودار ہونے سے پہلے ہی ہیریٹ اور شیلے کا نباہ مشکل ہو گیا تھا۔ اور ان دونوں میں

علیحدگی کا ہونا لازمی اور لابدی تھا۔ اس ناگوار تذکرے کو ہم یہیں ختم کرنا مناسب سمجھتے ہیں۔ صرف اتنا اور بتا دینا ضروری ہے کہ ہیریٹ نے سال کے اندر اندر ہی کوئیں میں ڈوب کر خودکشی کر لی۔ اس وقوعہ کا شیلے کے دل پر بہت بڑا اثر ہوا۔ اور اس کی آئندہ زندگی کو ہیریٹ کا خیال اکثر تلخ کر دیتا تھا۔

دوسری شادی کے بعد شیلے نے انگلستان کو خیرباد کہا اور اٹلی میں (جو اکثر انگریز شاعروں کا دوسرا وطن رہا ہے) رہائش اختیار کر لی۔ اس عرصے میں اس کی شاعری کو اکثر لوگ مان گئے تھے۔

میری جیسی مونس و دمساز کے ملجانے سے شیلے کی شاعرانہ طبیعت اور بھی چمک گئی۔ وہ بات جو مضمون سجھاتی اور دل کو گرماتی ہے سب اسے حاصل ہو گئی تھی۔ دونوں میاں بی بی ہم مذاق تھے۔ دونوں کو علمی ذوق تھا۔ دونوں کے دل میں اپنی بنی نوع کا درد جاگزین تھا ان حالات میں تو کوئی معمولی شخص بھی آدھا پونا شاعر بنجاتا پھر شیلے کا تو کیا مذکور جسے خدا نے پیدائش ہی سے حلیہ شاعری عطا فرمایا تھا۔ ایک سے ایک بڑھ چڑھ کر نظم شایع ہونے لگی۔ اور شائقین کے ہاتھوں میں گردش کھانے لگی۔ تنقیدی دنیا کے کان کھڑے ہوئے۔ کہ دنیا کا ایک سب سے بڑا شاعر انگلستان میں نمودار ہوا ہے۔ شیلے کی نظموں میں جو بات خصوصیت سے قابلِ ذکر ہے وہ یہ ہے کہ ان میں ایک قسم کا قدرتی ترانہ اور شیرینی پائی جاتی ہے جسکی مثال دنیا کی شاعری میں اور کہیں نہیں مل سکتی۔ اس کی نظموں کے سننے سے کان کبھی سیر نہیں ہوتے بلکہ ہمیشہ ھل من مزید کی تمنا رہتی ہے۔ بجائے شاعری کے انہیں

اگر موسیقی کہا جائے تو بجا ہوگا۔ کیونکہ شاعری اور موسیقی کا اجتماع جس قدر شیلے کی نظموں میں پایا جاتا ہے۔ اس قدر اور کسی شاعر کے کلام میں نہیں پایا جاتا۔ علاوہ اس ترانے کے اس کا بڑھا ہوا تخیل خاص اسی کے ساتھ مخصوص ہے۔ شیلے جس دُنیا کی سیر کرتا تھا وہ خلد برین کی طرح خوبصورت تھی۔ اس میں ہر ایک چیز قوس قزح کے رنگوں سے مزین نظر آتی ہے۔ اس کا پتہ پتہ صنعت کردگار کا ایک اعلےٰ نمونہ ہے۔ اس کا آسمان نیلم کو شرماتا ہے۔ اس کی زمین ہمسر فلک ہے۔ اس کا سمندر آبی پریوں کا مسکن ہے۔ جس کی ہر ایک موج بجائے خود ایک مہ جبین ہے جو اپنے سیمیں بازو پھیلا کر ہمیں اپنی آغوش میں بلاتی ہے۔ اس کے طیور خوش الحان کی موسیقی ستاروں کو وجد میں لاتی ہے۔ اور اس کے باشندے ہم جیسے خطا ونسیان سے مرتب۔ گناہوں سے ملوث آدمی نہیں۔ بلکہ خوبصورت اور خوب سیرت لوگ ہیں جو فرشتوں کی ہمسری کا دعویٰ کر سکتے ہیں اور جنہیں اشرف المخلوقات کہلانے کا پورا پورا حق حاصل ہے اس میں کلام نہیں کہ اس خیالی دنیا کی سیر میں شیلے اکثر واقعیت کو ہاتھ سے دیدیتا ہے۔ لیکن شاعری کا صرف یہی منشا نہیں کہ واقعات کو پیش کرے بلکہ ہر ایک شے میں حسن کا مطالعہ کرے۔ اور اس منشا میں جس قدر کامیابی شیلے کو ہوئی ہے۔ اس قدر اور کسی شاعر کو نہیں ہوئی کیونکہ وہ خدا کو بھی حسن ازلی ہی سے تعبیر کرتا تھا اور کل کائنات کو حسن مجسم خیال کرتا تھا *

شیلے نے جو حصہ عمر اٹلی میں گذارا۔ اس میں دو واقعات قابل ذکر ہیں ایک تو لارڈ بائرن اور شیلے کی پہلی مرتبہ ملاقات ہوئی اور بہت گہری

ملاقات ہوئی کیونکہ دونوں ایک عرصہ تک ساتھ رہے۔ اس ملاقات کا اثر دونوں کی شاعری پر پڑا۔ چنانچہ شیلے نے ایک نظم موسومہ بہ "جولین اینڈ میڈالو" اسی تقریب پر لکھی ہے۔ دُوسرا امر جو ہمارے لئے دلچسپی کا موجب ہے وہ یہ ہے کہ شیلے کی ملاقات ایک عجیب و غریب عورت امیلیا ویویانی نامی سے ہوئی۔ جو اپنی مذہبی آرائے کی وجہ سے خانقاہ پیسا میں نظر بند تھی شیلے جیسے آزاد خیال شخص کو ایسی عورت سے ہمدردی پیدا ہونی ضرور تھی۔ اور اس پر یہ بات مزید تھی کہ امیلیا ویویانی واقعی نہائیت ذہین اور قابل عورت تھی۔ شیلے۔ اس کی بیوی میری اور امیلیا تینوں میں بہت دلی دوستی ہو گئی اور یہ دونوں میاں بیوی اکثر اس سے ملنے جایا کرتے تھے۔ ہمارے شاعر کی ایک مشہور نظم "ے پی سائی کڈیاں" اسی امیلیا ویویانی ہی کے شوق میں لکھی گئی ہے +

جو زمانہ اٹلی میں گذرا اس کو ہم شیلے کی عمر کا بہترین حصہ کہ سکتے ہیں لیکن افسوس یہ کچھ بہت لمبا نہ تھا۔ انگریزی میں ایک مثل ہے کہ "وہ جسے دیوتا محبت کرتے ہیں۔ جوان ہی مر جاتے ہیں"۔ شیلے بھی انہیں منتخب چند میں سے ایک تھا۔ ایک روز کشتی میں سوار ہو کر لک ہارن کے قریب سمندر کی سیر کر رہا تھا کہ طوفان نے آلیا۔ شیلے کی کشتی میں صرف ایک شخص مسٹر ولیم نامی اور تھا باقی سب دوست اور کشتیوں میں تھے۔ طوفان کی تاریکی میں کچھ پتہ نہ چلا کہ کون کدھر جاتا ہے۔ آخر جب طوفان گذر گیا تو معلوم ہوا کہ شیلے کی کشتی کا پتہ نہیں بڑی تلاش سے دو تین دن کے بعد اس جوانمرگ کی نعش ساحل سمندر پر ریت میں دبی ہوئی ملی +

اٹلی کا ایک قانون تھا کہ جو نعش وغیرہ ریت میں دبی ہوئی ملے اسے

وہاں سے اُٹھایا نہ جائے۔ اس لئے لارڈ بائرن اور شیلے کے دیگر دوستوں کی یہ صلاح ہوئی کہ پہلے نعش کو جلایا جائے اور پھر راکھ کو دفن کر دیا جائے۔

لاشے کو جلانے کا نظارہ نہائت عبرت خیز اور دردانگیز تھا۔ شیلے کے ایک دوست (لیہ ہنٹ)، نے اسوقت کی چشمدید کیفیت مندرجہ ذیل الفاظ میں قلمبند کی ہے "بحیرہ روم جواب بالکل باامن اور صاف تھا۔ ساحل کے بوسے لے رہا تھا گویا کہ اُسے صلح کا پیام دیتا تھا۔ زردریت اور نیلا آسمان عجب انداز سے ایک دوسرے کے مقابل نظر آرہے تھے ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا پہاڑوں کی چوٹیوں کو چھوتی ہوئی گذر جاتی تھی۔ آگ کے شعلے آسمان کی طرف زور وشور سے بلند ہورہے تھے اور اور انکے کپکپانے اور ہلنے سے ایک عجیب ناقابل بیان چمک پیدا ہوتی تھی۔"

ایک بات جو خصوصاً اس واقعہ کے متعلق قابل ذکر ہے وہ یہ ہے کہ شیلے کا دل شعلوں کی دستبرد سے محفوظ رہا اور راکھ میں سے صحیح وسالم نکالا گیا +

آہ! آگ کے بے رحم شعلے بھی شاعر کے نازک دل کی قدر کرتے ہیں۔ لیکن اے موت! تیرا تبر کسی کو نہیں چھوڑتا +

اعراف کی ایک رُوح

فرشتے آسمان پر اپنے اپنے عود بجا رہے تھے۔ اور انکی سُریلی آوازیں مثل خوشبو کی لپٹوں کے خدائے بلند کے عرش تک پہنچتی تھیں۔ مگر

سرآلیم کا راگ اپنے سب ساتھیوں سے شیریں اور دلفریب تھا۔ اور اُس خدائے غائب کی آواز اس طرح آتی ہوئی سنی جاتی تھی "اے سرالیم اس آتشِ محبت کے صلے میں جو تیرے راگ سے نکلتی ہے مانگ کیا مانگتا ہے؟ جو تو مانگے تجھے مل جائے"۔ سیر آلیم بولا۔ سنا ہے کہ کوئی جگہ ایسی ہے جو اعراف کہلاتی ہے۔ جہاں دوزخ سے تو امن ہے مگر جو بہشت کے مقابلے میں تکالیف کا گھر ہے۔ وہاں بہت سی روحیں تیری عبادت کرتی ہیں۔ مگر اپنے گناہوں کی سزا پوری پوری پاتی ہیں۔ اے خدا مجھے اجازت دے کہ کبھی کبھی میں اُن کے پاس ہو آیا کروں اور اپنے عود کے راگ سے جس کو تیری تعریف نے مقدس بنایا ہے اُن کی تکالیف کو تسکین دیا کروں"۔

آواز آئی کہ ہاں! اے فرشتوں میں سب سے زیادہ رحمدل! تیری دعا مقبول ہوئی اور اُسے بہت بھلی معلوم ہوئی جو سزا و جزا دیتا ہے مگر محبت سے۔ تیری تمنا بر آئی گا

سرالیم نے پھر تو خوب حمد گائی۔ اور جب راگ ختم ہو چکا تو اپنے زمردین تخت پر سے اُٹھا اور اپنے رنگا رنگ کے پروں کو پھیلا کر اس غمناک مقام پر جو زمین کے بہت ہی قریب ہے پہنچا۔ یہ مقام اُن روحوں کی چیخوں سے گونج رہا تھا جو تکلیف اُٹھانے کے بعد پاک ہو جاتی تھیں۔ یہ بدنصیب روحیں یہاں سے اُن عالیشان مکانات کو دیکھتی تھیں جو انہیں بعد میں ملنے والے تھے۔ اور اس بلند مرتبہ مخلوق پر حسرت سے نگاہ کرتی تھیں جو بقا کے چشمے سے سیراب ہو کر بہشت کے باغوں میں چہل قدمی کرتی پھرتی تھی اور خیال کرتی تھی

کہ اُن کی خوشی غیر متناہی ہے۔ یہ خیال تکالیف میں اُن کو تسلّی دیتا تھا اور اعراف اور دوزخ میں جو صحیح فرق ہے وہ یہی ہے +

پھر سرآلیم نے اپنے پروں کو سمیٹا۔ اور بلّوری دروازوں میں داخل ہوکر ایک ویران چٹان پر بیٹھ گیا اور اپنا مقدّس راگ چھیڑا۔ فوراً ہی بدنصیب روحوں کو راحت سی محسوس ہونے لگی۔ اور عذاب کے فرشتے ایذادہی سے باز رہ گئے۔ اور گنہگار روحوں نے چلّانا موقوف کر دیا۔ دنیا کے زخم رسیدوں کے لئے جیسی نیند مرہم ہے ایسا ہی سرآلیم کا راگ اُن روحوں کے لئے تسکین بخش تھا۔ اس عالم خاموشی میں سرآلیم کو معلوم ہوا کہ صرف ایک آواز ایسی ہے جو اس کے راگ سے خاموش نہیں ہوئی یہ ایک عورت کی آواز تھی اور وہ نہائیت زور سے چنگھاڑیں مارتی تھی اور کہتی تھی +

"اے ادن ہیم۔ ادن ہیم۔ مجھ کھوئی ہوئی کا تو رنج نہ کر" +

نیک فرشتے نے راگ پر راگ بجایا۔ یہاں تک کہ اس کا موسیقی کا علم ختم ہو گیا۔ لیکن اس چیخنے والی کو اس نہائت ہی شیریں اور دلفریب راگ کی خبر بھی نہ ہوئی اور اس کی طرف دھیان بھی نہ کیا۔ اور چلّاتی رہی +

"اے ادن ہیم۔ ادن ہیم۔ مجھ کھوئی ہوئی کا تو رنج نہ کر" +

اس پر سرآلیم کو بہت زیادہ خیال ہوا اور اس جگہ پہنچا جہاں سے وہ آواز آرہی تھی۔ دیکھتا کیا ہے کہ ایک نوجوان حسین لڑکی کی روح ایک چٹان سے زنجیروں میں جکڑی ہوئی ہے اور عذاب کے فرشتے اُس کے نزدیک آرام سے پڑے ہیں۔ سرآلیم نے اُن سے کہا "کیا میرے راگ نے تمہیں ایسی لوری دی کہ تم یوں مدہوش ہو گئے"؟

اُنہوں نے کہا "اس لڑکی کو ایک شخص کی یاد زیادہ تکلیف دہ اور تلخ ہے ہمارے عذاب سے۔ اور اسی لئے ہم نکمے پڑے ہیں "

تب وہ نیک فرشتہ اُس روح کے پاس پہنچا اور ایک ایسے لہجے میں اس سے مخاطب ہوا کہ وہ چلانے سے خاموش ہو گئی (اور کیوں نہ ہو ہمدردی سے ہم کسی حالت میں لاپرواہ نہیں ہو سکتے۔ کس لئے! اے لڑکی! کس لئے تو اسی ایک غمناک لہجے میں روئی جاتی ہے؟ اور کیوں میرا راگ تجھے تسکین دینے میں ناکامیاب رہا؟ حالانکہ تیرے ساتھیوں میں سے بڑے سے بڑا مجرم بھی اس سے تسلی پاتا ہے "

اس غریب روح نے جواب دیا۔ "اے روشن چہرے والے اجنبی! کیا تو مجھ سے مخاطب ہے؟ مجھ سے؟ جس نے خدا سے زیادہ خدا کے ایک بندے سے محبت کی۔ اور اسی لئے یہ بھگت رہی ہوں۔ لیکن مجھے معلوم ہے کہ میرا غریب آدم میرے لئے دن رات روتا ہے۔ اور اس کے رنج کا خیال میرے لئے زیادہ ناقابل برداشت ہے ان تکالیف سے جو یہ عذاب کے فرشتے مجھ پر ڈال سکتے ہیں "

نیک فرشتے نے پوچھا "اے! تجھے کس طرح معلوم ہے کہ وہ تیرے لئے نالہ وزاری کرتا ہے"؟

روح نے نہایت سادگی سے جواب دیا۔ اس طرح! کہ میں جانتی ہوں کہ میں اُس حالت میں اس کے لئے کس جانکنی سے تڑپتی "۔ اس نیک طبیعت فرشتے پر اس کا بڑا اثر ہوا کیونکہ خدا نے اپنی مخلوق کی طبیعتوں میں قدرتاً محبت رکھی ہے اور اُس نے کہا "میں تیرے غم کا کس طرح مداوا کر سکتا ہوں"؟

رُوح اس یکایک خوشی سے بیتاب ہوئی اور اپنے غیر محسوس ہاتھوں کو پھیلا کر بولی :-

"اے مجھے اجازت دے ۔ اے مجھے اجازت دے کہ میں زمین پر ہو آؤں ۔ صرف ایک ہی گھنٹے کے لئے ۔ تاکہ میں اپنے اڈن ہاہیم کو ایک نظر دیکھ لوں ۔ اور اپنی موجودہ تکالیف کو اُس سے چھپا کر اس کے رنج وغم میں اُس کی تسلّی کروں !"

نیک فرشتے نے کہا "افسوس" اور اپنی آنکھیں اُس سے پھیر لیں کیونکہ فرشتے دوسروں کے سامنے نہیں روتے ۔ "افسوس ! میں بیشک تیری یہ آرزو پوری کر دیتا ۔ مگر تجھے نہیں معلوم کیا تاوان تجھے اُس کے عوض میں دینا پڑیگا ۔ اعراف کی روحیں زمین پر جا سکتی ہیں مگر اُن کی واپسی پر انہیں ایک گران تاوان دینا پڑتا ہے ۔ غرض اگر تو ایک گھنٹے کے لئے زمین پر جانا چاہتی ہے تو تیری یہ عذاب کی قید یہاں ایک ہزار برس اور زیادہ ہو جائیگی" +

رُوح نے چلّا کر کہا ۔ "بس صرف یہی نا ؟ میں تو نہائت خوشی سے اس کے لئے آمادہ ہوں ۔ آہ ۔ یقیناً آسمان والوں میں محبّت جاری نہیں ہے ؟ ورنہ تجھے معلوم ہوتا اے آسمانی ملاقی ! کہ وہ ایک ساعت جو ہمارے محبوب کی تسکین اور تسلّی میں ہم صرف کریں قیمت میں اُن ہزار برس کے برابر ہے جو ہمیں عذاب و تکلیف میں کٹیں ۔ اے ! تو مجھے اپنے اڈن ہاہیم کو تسلّی اور تشفی دینے دے ۔ اس کا مضائقہ نہ کر کہ مجھ پر کیا گذرے گی" +

نیک فرشتے نے آنکھ اُٹھا کر اوپر کی طرف دیکھا اور اُسے دُور سے

وہ شعاعیں نظر پڑیں جو خدا کی عالم بین آنکھ سے نکلتی تھیں اور جنکے دیکھنے کی تاب کوئی اور نہ لا سکتا تھا۔ اُس نے خدا لئے لا یزال کی یہ آواز سُنی۔ جو تجھے تیرا رحم کہتا ہے وہ کر ؛

اُس نے پھر اُس روح کی طرف نظر کی اور دیکھا کہ اُس کے ہاتھ اُس کی طرف التجاءً پھیلے ہوئے ہیں۔ پس اُس نے وہ الفاظ پڑھے جن سے اعراف کے دروازے کی کُنڈیاں کُھل گئیں۔ اور لو۔ وہ روح انسانی دنیا میں داخل ہو گئی +

اس وقت رات تھی اور لارڈ اڈن ہیم اپنے محلوں میں اپنے جگمگاتے تخت کے صدر پر بیٹھا ہوا تھا۔ لمبے لمبے قہقہے باواز بلند لگتے تھے اور مذاق اور جہل کی آوازیں گونج رہی تھیں۔ لارڈ اڈن ہیم کا قہقہہ اور مذاق سب سے زیادہ بلند اور سب سے زیادہ خرم تھا۔ اسکے دائیں پہلو پر ایک حسین لڑکی بیٹھی تھی اور وہ بار بار اوروں کی طرف سے منہ پھیر پھیر کر اسکی کان میں کچھ کہتا تھا

اُس حسین اور نازک بیگم نے کہا۔ اُو۔ تیرے لفظوں کا کون شریف عورت اعتبار کرے۔ کیا تو نے حسین آئیڈا سے یہی قسمیں نہ کھائی تھیں اور ایسا ہی اظہارِ محبت نہ کیا تھا؟ اُسے تو مرے ہوئے بھی صرف تین ہی مہینے ہوئے ہیں !+

نوجوان لارڈ اڈن ہیم نے جواب دیا۔ "خدائے پاک کی قسم تو اپنے لاجواب حسن سے سخت ناانصافی کرتی ہے۔ نہیں۔ تو میرا مضحکہ اُڑاتی ہے۔ آئیڈا۔ آئیڈا سے میں اور محبت کروں !!! تو پھر میں تیرے قابل کیوں کر ہوں؟ اڈن ہیم کو جو کچھ محبت آئیڈا سے تھی وہ اتنی ہی تھی کہ چند مزاح انگیز الفاظ اور چند مرتبہ کے تبسم میں محدود ہو سکتی ہے!

اور بس! کیا یہ میرا قصور تھا اگر اُس بیوقوف نے اس عام خُلق کے معنے غلط سمجھے - نہیں - میری پیاری - یہ دِل صرف تیرا ہی ہے" حسین بیگم بولی - "تو کیا تجھے اُس کے مرنے کا افسوس نہیں ہوا" اُس نے کہا - "ہاں ضرور ہوا - مگر صرف ایک ہفتہ تک - اب تو میں تیری دل کش نگاہوں میں فوری تسکین پاتا ہوں"۔

اس وقت لارڈ ادن ہیم نے ایک سرد آہ اپنے پیچھے سے سُنی - مُنہ پھیرا مگر کچھ نہ دیکھا بجز ایک دھوئیں کے جو فوراً ہی اُڑ گیا اور غائب ہو گیا۔

جب وہ دھوکہ کھانے والی ایڈا کی رُوح اعراف میں واپس پہنچی تو سر ایلیم نے پُوچھا - کیا تو اپنے محبوب سے نہیں ملی؟ اور اس کام کو انجام نہیں دیا جس کے لئے تو گئی تھی؟

غریب ایڈا نے جواب دیا - "عذاب کے فرشتوں سے کہدو کہ اپنا عذاب شروع کریں"۔

"تو کیا صرف اسی بات کے واسطے تو نے ہزار برس اپنی قید میں بڑھوائی ہیں؟"

"افسوس" - ایڈا نے جواب دیا - اس ایک واحد گھنٹے میں زمین پر جو کچھ مجھ پر بیتی - اس کے مقابلے میں یہ ہزار برس کی اعراف کی تازہ تکلیف کچھ بھی نہیں"

سر ایلیم نے کہا "تو کیا بس یہی محبت ہے جس کا دعویٰ زمین والے کیا کرتے ہیں؟؟؟"

عروس البلاد

لندن

میرے ایک مہربان بزرگ نے مجھے ہندوستان سے چلتے وقت خط لکھا۔ کہ لندن جاتے ہو۔ آخر عروس البلاد" کا جادو تم پر بھی چل گیا اور تم بھی اس کی طرف کھنیچ گئے۔ خدا جانے اس شہر میں کس بلا کی کشش ہے۔ معلوم نہیں۔ یہ خطاب لنڈن کو پہلے بھی دیا جاچکا ہے۔ یا ہمارے فاضل دوست کی طبع ایجاد پسند کا نتیجہ ہے۔ مگر مجھے یہ مناسب معلوم ہوا۔ کہ لنڈن کے متعلق مضمون لکھنے کے لئے یہ عنوان اختیار کرلیا جائے کیونکہ نرا "لنڈن" تو کچھ روکھا پھیکا سا عنوان ہے۔ گو میں نہیں کہ سکتا کہ دارالسلطنت انگلستان کس حد تک اس خطاب کا مستحق ہے۔ عروس کے لفظ سے جو پہلا خیال آدمی کے دل میں پیدا ہوتا ہے۔ وہ خوبصورتی یا آراستگی ہے اور اگر اس اعتبار سے دیکھا جائے تو شائد پیرس اس خطاب کا سب سے زیادہ مستحق ہے۔ یہ مسلمہ بات ہے۔ کہ دنیا میں اس سے بڑھ کر آراستہ۔ بانکا اور طرحدار شہر نہیں ہے۔ اور جو ایک اُڑتی سی جھلک پیرس کی ادھر آتے ہوئے ہمیں نظر آئی ہے۔ وہ نہائت دلکش تھی۔ لندن اس کے مقابلہ میں خوبی اور بانکپن میں نہیں جنچتا۔ ہاں لندن باعتبار اپنی عظمت وشان اور کثرتِ کاروبار وتجارت کے ایک حیرت انگیز ہے اور اس حیثیت سے جو نام بھی اسے دید یا جائے سزاوار

ہے۔ ایک نصف کروڑ کی آبادی ۔جس میں زن و مرد لڑکے لڑکیاں سب باہر چلنے پھرنے والے ہیں ۔جس قدر ہجوم کوچہ و بازار میں پیدا کر سکتی ہے ظاہر ہے۔ اور اس انبوہ کثیر کے ادھر اُدھر آنے جانے کے لیئے جتنی ضرورت سواری کے سامان کی ہوگی۔ وہ بھی محتاجِ بیان نہیں۔ اور یہ سب اہتمام اس عمدگی اور ارزانی سے کیا گیا ہے کہ بیساختہ حُسنِ انتظام کی داد دینی پڑتی ہے۔ اتنی آبادی کے لئے مکان بہم پہنچانا ایک اہم مسئلہ ہے اور حقیقت یہ کہ اسے انگلستان بھی باوجود اپنی بیشمار دولت کے پوری طرح حل نہیں کر سکا۔ مکان کے جو معنے مشرق میں لئے جاتے ہیں اُس معنے میں سوائے امرا کے یہاں بہت کم لوگ مکان رکھتے ہیں۔ ایک ایک گھر میں کئی کُنبے بستے ہیں۔ اکثر کے پاس تو ایک کمرہ ہوتا ہے۔ اور بہت سے ایسے بھی بدقسمت ہیں جو اتنا بھی آسرا نہیں رکھتے جہاں رات ہوگئی۔ وہاں ہی گھر ہے۔ جابجا کمرے رات بھر کے لئے کرایہ پر ملتے ہیں جنمیں بستر مل جاتا ہے۔ کرایہ دیا۔ پڑ رہے۔ اور صبح ہوتے ہی پھر چل کھڑے ہوئے۔ اِنکے سوا ایک اور جماعت اُن سے بھی زیادہ بدنصیب ہے۔ ان کے پاس اس طرح بستر کرایہ پر لینے کی بھی توفیق نہیں۔ اور وہ رات یونہی چل پھر کر کاٹ دیتے ہیں اور دن کو بنچ وغیرہ پر جو کہیں کہیں رہگذروں کے آرام کے لئے رکھے رہتے ہیں پڑے اونگھتے ہیں گرمی کے دن تو اِنکے خیر کٹ جاتے ہیں۔ جاڑا آتا ہے تو بلا آتی ہے۔ بیسیوں ٹھٹھر کے رہ جاتے ہیں اور قیدِ زیست سے آزاد ہو جاتے ہیں۔ اور سینکڑوں کی جان یوں بچتی ہے۔ کہ سرکاری طور پر انتظام کیا جاتا ہے۔ کہ ہر محلے میں ایک بڑا کمرہ گرم کیا جائے۔ سلا زمان

پولیس انہیں گھیر گھار کے آگ کے گرد لیجا بٹھاتے ہیں اور آگ تاپتے ہوئے یہ لوگ رات بھر بیٹھے رہتے ہیں اور دن ہوتے ہی پھر یہ ہوتے ہیں اور اِن کی آوارہ گردی اور بیکاری۔ دولت اور جاہ وحشمت کا جو نظارہ لنڈن کے مغربی حصے میں نظر آتا ہے۔ وہ بھی دو تین اور مغربی شہروں کے سوا کہیں دنیا بھر میں نظر نہیں آسکتا۔ لیکن تنگدستی۔ افلاس اور بد قسمتی کی جو دلخراش تصویر لنڈن کا مشرقی حصہ پیش کرتا ہے اس کا بھی نظیر دنیا میں ملنا محال ہے۔ ہمارا ملک بہ حیثیت مجموعی بیشک مفلسی کا شکار ہے اور ہماری قوم دولتمند نہیں۔ مگر نہائت مالدار لوگوں کی ہمسائیگی میں اس درجہ کی بیکسی اور بے بسی ہمارے ہاں نہیں۔ اور اگر اس زمانہ میں جاہ و ثروت کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ قوم کا ایک حصہ بالکل خوار خستہ ہو جائے تو ہم ایسی ثروت سے باز آئے +

لنڈن دن کے وقت۔ میں یہاں ۲۹۔ مئی کی رات کو پہنچا تھا۔ اُس وقت تو سفر کی ماندگی غالب تھی اور ٹھکانے کی فکر تھی۔ کیا دیکھ سکتے تھے۔ قریب ترین ہوٹل میں پڑ رہے۔ صبح ہوتے ہی شوقِ سیر نے گدگدی کی اور میں باہر نکلا۔ کرایہ پر جو یہاں گاڑیاں چلتی ہیں۔ اُن میں سب سے مقبول اور پُرانی چیز ایک ہے جسے امنی بس یا صرف بس کہتے ہیں۔ اُنکی بدولت یہاں بڑا آرام ہے ورنہ ایک حصّہ شہر میں اور دوسرے میں میلوں کا فاصلہ ہے پیاؤ پیادہ چلو تو دن ختم ہو جائے اور معمولی اکیلی سواری کی گاڑی ڈھونڈ ھو تو جیب خالی ہو جائے۔ انکا یہ ہے کہ آنہ دو آنے دیئے اور جا پہنچے۔

بارہ آدمی اندر اور چودہ آدمی چھت پر بیٹھ سکتے ہیں۔ اور صبح سے لیکر رات کے گیارہ بارہ بجے تک بھری ہوئی نظر آتی ہیں۔ سب سے پہلے جو بس ملی۔ اُس پر سوار ہولیا اور لندن پر ایک سرسری نظر ڈالنی شروع کی۔ پہلا نقش جو میرے دل پر ہوا۔ وہ کسی قدر مایوس کرنے والا تھا۔ میں نے کہا یہی لندن ہے۔ جسکی اتنی تعریفیں سُنتے تھے اور یہی ہے۔ جس کا نام ہمارے عنائت فرماتے عروس البلاد رکھا تھا۔ ان کے خیال میں عروس ہو تو معلوم نہیں۔ ہمیں تو عجوز البلاد کی پھبتی زیادہ موزوں معلوم ہوتی ہے جدہر نظر جائے اونچی اونچی عمارتیں دھوئیں اور کثرتِ نم سے سیاہ۔ سڑکیں سیاہ ہوا میں سیاہ ذرات۔ سانس لو تو سیاہی حلق اور نتھنوں میں گھس جائے۔ رومال سے صاف کرنا چاہو تو رومال سیاہ ہو جائے۔ بعض عمارتیں جو نئی تھیں وہ بھی اس رُوسیاہی کے دھبے سے خالی نہ تھیں۔ پرانی تعمیروں کا تو کیا کہنا۔ پرانی تاریخی عمارتیں۔ جیسے سینٹ پال کا گرجا۔ وسٹ منسٹر کا قبرستان۔ پارلیمنٹ قصر بکنگھم سب سیاہ نظر آئے۔ اوپر سے مطلع بھی ابر آلود تھا اور ترشح بھی جاری تھا۔ ظاہر ہے کہ ایک مشرقی آنکھ پر جو سنگ سرخ اور سنگ سفید کی صدیوں میں رنگ نہ بدلنے والی عمارات کے نظارہ کی عادی ہو۔ ایسے اسباب کا سوائے مایوسی کے اور کیا اثر ہو سکتا تھا یہ نہیں کہ میں ان عمارات کی ساخت اور ان کے نقشے کی عمدگی یا ان کی غیر معمولی بلندی کی تحسین نہیں کرتا تھا۔ لیکن چونکہ میرا علم تصاویر پر مبنی تھا۔ اور تصاویر عمارات کی خوبی کو دکھاتی تھیں اور سیاہی کے بدنما داغ کو چھپاتی تھیں۔ اس لئے میرا دل یہ کہہ رہا تھا کہ ان چیزوں کو

جیسا سنتے تھے نہ پایا ۔ بعد غور حقیقت یہ کھلی ۔ کہ لندن اس بارہ میں معذور
و مجبور رہا ہے ۔ اگر لندن کو لندن بننا تھا تو اسے عمارات کے ظاہری حسن سے
بے پرواہ ہونا بھی لازم تھا ۔ اس شہر کی بڑائی منحصر ہے ۔ اس کے مرکز
تجارت ہونے پر اور تجارت یہاں منحصر ہے صنعت پر اور صنعت کلوں
پر اور کلیں دخان پر ۔ ہزاروں لاکھوں چھوٹے بڑے انجن ہیں جو شب و روز
چل رہے ہیں ۔ اور دھواں اُن کی چمنیوں سے نکل کر ہوا میں مل رہا ہے
اس کے علاوہ گھر گھر میں ایک دود کش ہے ۔ اور باورچی خانہ یا انگیٹھی
کا دھواں دود کش کے ذریعے سے اوپر جا رہا ہے ۔ یہ نہیں کہ ہندوستان
کے عام گھروں کی طرح چھتیں اور کڑیاں دھوئیں کے مارے سیاہ روغن
سے رنگی جا رہی ہیں ۔ یہاں گھروں میں جالے اور دھوئیں کا نشان
نہیں ۔ ہر کمرہ میں فرش ہے ۔ ہر دیوار پر کاغذ منڈھا ہوا ہے ۔ چھت
اندر کی طرف سفید کپڑے سے ڈھپنی ہے ۔ زینوں میں بانات وغیرہ
لگی ہے ۔ دروازہ میں فرش ہے ۔ غرض صفائی کو درجۂ کمال تک پہنچا
دیا گیا ہے ۔ پس جب کارخانوں سے بھی اور گھروں سے بھی ہر وقت
دھوئیں کے بادل اٹھتے رہتے ہیں ۔ تو ہوا کیا رہے ۔ کیونکر صاف
رہے ۔ اور جب ترشح شروع ہوتا ہے یہ کالے ذرات بھاری ہو کر
مکانات اور زمین پر بیٹھنے لگتے ہیں اور مکانات کو بارہا دونوں
میں سیاہ کر دیتے ہیں ۔ نتیجہ یہ ہے کہ جتنی پرانی کوئی عمارت ہے
اتنا ہی گہرا پردہ سیاہی کا اس پر پڑا ہوا ہے اور جو نگاہ رنگ کی
خوبصورتی کو ڈھونڈھتی ہے ۔ ایسے یہاں کے باشندوں کے سرخ
و سپید چہروں کے غازے سے تازگی حاصل کرنی چاہئے نہ کہ عمارات سے

ایک نقش تو لندن کو دن کے وقت دیکھنے سے یہ ہوا۔ کہ یہ کچھ کالا کلوٹا سا شہر ہے۔ اور دوسرا یہ کہ نہائت مصروف شہر ہے۔ جس شخص کو دیکھو دوڑا جاتا ہے۔ دوپہر کے قریب کاروبار کا زور ہوتا ہے۔ اسوقت کسی بازار میں ایک آدمی بھی مشکل سے ایسا نظر آتا ہے جو آہستہ چل رہا ہو۔ کیونکہ سب تیز چلتے ہیں اور جو آہستہ چلنا چاہے اس کے لئے یہاں کوئی جگہ نہیں۔ ضرور دھکے کھائیگا۔ یہاں تو یہی ہے کہ راستہ لیتا جائے اور راستہ دیتا جائے۔ آہستہ خرامی کا یہاں ٹھکانا نہیں۔ تیز روی کی زبردست رو اسکو یوں بہا لیجائے گی۔ جیسے خس و خاشاک سیلاب کے آگے آگے چل پڑتے ہیں روز محشر کی نفسا نفسی تو مدتوں سے سنتے تھے۔ یہاں ہر روز قیامت کی گرم بازاری ہے۔ عجب سبق حاصل ہوتا ہے۔ ع رہا جو پس کارواں رہ گیا +

علاوہ بریں لندن دن میں نہائت بھلا مانس شہر ہے۔ کسی کو کسی سے مطلب نہیں۔ ہر ایک کو اپنے کام سے کام ہے۔ بازاروں میں نہ صرف کاروباری لوگوں کا ہجوم ہوتا ہے بلکہ اُمرا اور شرفا اور انکی بیبیاں اور بچے سب اپنا سامان خریدنے کے لئے نکلتے ہیں۔ ہر شخص دوسرے سے اخلاق سے گفتگو کرتا ہے۔ خواہ اجنبی ہو۔ اور لوگ مسافر کو بہت توجہ سے راستہ بتاتے ہیں۔ دنیا کے ہر حصے کے لوگ فرانسیسی۔ ارمنی۔ جرمنی۔ گبر و ترسا و یہود۔ ہندی۔ چینی۔ جاپانی ترک و عرب و حبش۔ غرض ہر رنگ کے لوگ اور ہر زبان کے بولنے والے اس زمانۂ جدید کے بابل کے گلی کوچوں کی رونق کو بڑھاتے ہیں۔ شہر کے باغات اور پارک دن کے وقت دسوائے تعطیل کے اوقات کے کس مپرسی

کی حالت میں ہوتے ہیں۔ البتہ شام ہوتے ہی اُدھر رجوع خلائق ہوتا ہے اور ہر باغ میں ہزارہا لوگوں کا مجمع ہو جاتا ہے۔ کوئی وعظ سُنتے ہیں۔ کوئی مذہبی گیت گاتے ہیں۔ کوئی گھاس پر لیٹتے ہیں۔ کوئی بنچوں پر بیٹھے ہوئے دن کی کوفت ہٹاتے ہیں اور کوئی ورزش کے لئے چکر لگاتے ہیں۔ مگر شام کے بعد کا نقشہ ہی اور ہے*

لندن رات کے وقت - رات کو وہ دن کا کالا کلوٹا لندن ہی نہیں رہتا۔ سیاہی کو تو سیاہی شب ڈھانپ لیتی ہے۔ اور روشنی تاریکی شب سے فائدہ اُٹھا کر دُگنی آب و تاب سے چمکتی ہے ہر ہوٹل۔ ہر تھیٹر۔ ہر میخانہ ایک بقعۂ نور نظر آتا ہے۔ ان مقامات کو روز ایسی ایسی ترکیبوں سے روشن کیا جاتا ہے۔ جیسے ہم کبھی کبھی دیوالی یا شب برات کی تقریبوں یا جشن شاہی وغیرہ کے لئے چراغان کرتے ہیں۔ قطار در قطار چراغاں کوئی لال۔ کوئی ہرے۔ کوئی پیلے شیشوں کے پیچھے رکھے ہوئے عجب بہار دکھاتے ہیں۔ بعض جگہ ایسے انداز سے روشنی کیجاتی ہے کہ دوکان کا نام نشان آتشیں حروف میں دور سے نظر آئے۔ بعض اور بھی ستم کرتے ہیں۔ ایسی کل رکھ دیتے ہیں کہ حروف دم بدم بدلتے رہیں اور اس طرح ہر وقت انکے کارخانہ کا اشتہار ہوتا ہے۔ آدھی آبادی ہوٹلوں میں کھانا کھاتی ہے۔ بعض مجبور ہیں کہ اُور سامان نہیں رکھتے اور بعض شوقیہ جاتے ہیں۔ جو شوقین ہیں۔ وہ ایسے ہوٹلوں میں جاتے ہیں۔ جہاں پندرہ بیس روپئے ایک وقت کے کھانے میں اُڑ جاویں۔ نو بجے تک سب لوگ ہوٹلوں سے فارغ ہو کر نکلتے ہیں اور اسوقت سے تھیٹروں کا بازار

گرم ہوتا ہے۔ یہاں ایک بجے تک تھیٹر میں نہیں بٹھا رکھتے۔ گیارہ بجے سب ختم کر دیتے ہیں۔ یہ وقت لنڈن کی عیاشی اور آوارگی کا ہے۔ جو لوگ دن کو نہائیت مصروف نظر آتے تھے۔ ان میں سے اکثر اسوقت فارغ البال دکھائی دیتے ہیں۔ رفتار میں اٹکھیلیاں ہیں نظر میں بیقراری اور جستجو ہے۔ دل میں شوق اور بدن میں مصنوعی حرارت جو آتش سیال سے پیدا کی گئی ہے۔ اسوقت ان سے ذرا بچ کر نکلنا چاہئے پولیس کو بھی اسوقت ہوشیار رہنا پڑتا ہے۔ طرح طرح کے کیسہ بُر اسوقت اپنے شکار کے لئے نکلتے ہیں۔ چند بازار دنیا بھر کے بدمعاشوں کا مرجع ہیں۔ اور وہاں جو اکیلا دُکیلا مسافر انکے ہاتھ چڑھ جائے تو انکی چاندی ہے۔ اسوقت جو لنڈن کی ظاہری خوشنما زینت ہے اس کو دیکھ کر بیشک اسے عروس کا خطاب دیا جا سکتا ہے۔ مگر اس کے ساتھ جو آوارگی لگی ہوئی ہے۔ اس کے باعث اسے ایک اصلی اور باعصمت عروس نہیں کہہ سکتے۔ بلکہ وہ عروس جس کی شان میں یہ کہا جا سکے۔

ع کہ ہر بامدادش بود شوہرے ٭

لنڈن کے ذرائع سفر۔ لنڈن کے مختلف حصوں کے درمیان جو مسافت ہے۔ اس کے بُعد کا ذکر میں کر چکا ہوں۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ وہ ذرائع کون کون سے ہیں جن سے لوگ اِدھر اُدھر سفر کرتے رہتے ہیں۔ کوئی کاروبار والا آدمی یہاں ایسا نہیں جو دن میں تیس۳۰ چالیس میل کا سفر شہر کے اندر اندر ہی نہ کرتا ہو۔ اس کے لئے کیا بندوبست ہے۔ ایک ذریعہ کا تو ذکر آچکا ہے۔ یعنے بس یہ گاڑیاں چار ہزار کے قریب ہیں۔ جن کے لئے تیس ہزار گھوڑے

کمپنیوں کو رکھنے پڑتے ہیں۔ اور انکی اوسط آمد اڑھائی سو روپیہ فی ہفتہ ہے۔ اِن کے سوا گاڑیاں ہیں۔ جن کی تعداد پچھلے سال کے شمار کے مطابق بارہ ہزار کے قریب تھی۔ آٹھ ہزار دوپیہ اور چار ہزار چوپیہ ان پر تیرہ چودہ ہزار کوچوان مقرر ہیں۔ جن کی اوسط آمدنی روزانہ پندرہ روپیہ فی کس ہے۔ ان کے علاوہ کئی ریلیں ہیں۔ بعض زمین کے اوپر چلتی ہیں اور بعض نیچے +

ہر دس دس پندرہ پندرہ منٹ کے بعد گاڑی چھوٹتی ہے۔ اور اس پر بھی بعض اوقات جگہ پانی مشکل ہوتی ہے۔ ریلوں کے سوا ایک اور تہ زمینی گاڑی ہے۔ جو بجلی کے زور سے چلتی ہے۔ یہ سارے شہر میں تو نہیں جاتی لیکن شہر کے آباد ترین حصّوں کے نیچے پھر نکلی ہے۔ اور ہر دو تین منٹ کے بعد اس کی بھری ہوئی ٹرین چلتی رہتی ہے۔ کئی دفعہ ایسا ہوا ہے کہ ہم زینے سے اُتر کر نیچے جا رہے ہیں کہ گاڑی آئی اور نکل گئی۔ مگر تین چار منٹ سے کبھی زیادہ انتظار نہیں کرنا پڑا کہ دوسری گاڑی آگئی۔ اب موٹر گاڑیاں بھی کرایہ پر ملنے لگی ہیں اور کئی حصّوں میں ٹریم بھی زور شور سے چلتی ہے۔ ٹریم بجلی سے چلنے والی بھی ہے اور وہ بھی ہے جسے گھوڑے کھینچتے ہیں۔ اور ابھی شکایت ہے کہ سامان سواری کا کم ہے۔ ٹریم کی اور بجلی والی تہ زمینی ریل کی توسیع ہونی چاہیئے۔ مگر یہ سارا اہتمام تو عوام کے لئے ہے۔ خواص کی جو اپنی دو اسپہ اور چار اسپہ بگھیاں۔ اور بانکی موٹر گاڑیاں ہیں اُن کا تو کچھ شمار ہی نہیں +

لندن کا طریق دُکانداری ۔ حرکت اور برکت کا یہ در شور

جس کا ذکر اوپر ہُوا۔ سب تجارت کے باعث ہے۔ اور تجارت ہی میں انگلستان کی بڑائی کا راز نہاں ہے۔ تجارت کے اُن شعبوں کا ذکر جن سے یہاں کے بڑے کارخانے اور جہازوں کے قیام گاہ آباد ہیں تو علیحدہ مضمون چاہتا ہے۔ سر دست اس کے ایک چھوٹے سے صیغے کو لیتا ہوں۔ یعنی دُکانداری۔ جوُں جوُں یہاں کے کاروبار کے اس حصے کو دیکھتا ہوں۔ دِل میں یہ خواہش پیدا ہوتی ہے کہ کوئی ایسا ذریعہ ہو کہ اپنے ملک کے دُوکانداروں کی ایک جماعت کو یہاں لاکر یہ نمونہ دکھاؤں۔ کہ اس طرح کام کرنا چاہیئے۔ پہلے چیز جو دیکھنے اور اخذ کرنے کے قابل ہے وہ دُکان سجانے کا طریق ہے۔ ہر دکان کے باہر ایک بڑا دروازہ شیشہ کا لگا ہوا ہے۔ جس میں تمام اُن چیزوں کے نمونے جو دُکان کے اندر مل سکتی ہیں۔ قرینے سے سجے ہیں اور ہر جنس پر قیمت لکھی ہوئی ہے۔ ہر شخص جو گذرتا ہے۔ دیکھنے کو ٹھہر جاتا ہے۔ گو یا ہر دوکان بجائے خود ایک اشتہار مجسّم ہے۔ گو وہ اس اشتہار پر قناعت نہیں کرتے۔ اشتہار کے اور وسائل بھی بکثرت استعمال کرتے ہیں۔ اکثر ایسا ہوتا ہے کہ جو شخص یونہی سجاوٹ کی کشش سے دیکھنے کھڑا ہوتا ہے۔ اس کی نظر میں کوئی چیز کھُب جاتی ہے یا اُس کی قیمت جنچ جاتی ہے اور وہ اندر جا کر اسے خرید لیتا ہے۔ اس صفائی کے شوق سے بازار کی خوبصورتی میں ترقی ہوتی ہے۔ چیزیں خراب نہیں ہوتیں اور دکان کی رونق بڑھتی ہے اگر ہمارے ہاں بڑے شہروں کے بڑے بازاروں میں ہر شخص جو نئی دوکان بنائے اُس میں اس خوبی کا التزام کرلے جیسا کہ وہاں بھی بعض دوکانوں

کی ساخت میں کیا جاتا ہے تو کرایہ دار کو بھی فائدہ ہو اور مالک دوکان کو بھی - مگر جو بات اس سے بہت بڑھ کر ضروری یہاں کی دکانداری میں ہے - وہ اِن دکانداروں کی تربیت ہے اُن کو یہ سکھایا گیا ہے کہ گاہک کا دل خلق اور تواضع سے موم کرلو - گاہک دکان میں گھُسے تو فوراً دکاندار اُس کی طرف دوڑا آئیگا - اور لفظ "سر" کا جس کے معنے جناب یا حضور ہیں - ایک تار باندہ دیگا - چاہے گاہک پھٹے کپڑے پہنے ہوئے ہو - میں نے بعض دفعہ ہندوستان میں دیکھا ہے - کہ سفید پوش گاہک کی تو عزت کیجاتی ہے چاہے دو پیسے بھی نہ ٹکھواٗ اور غریب الحال گاہک کو خواہ وہ سفید ہی کیوں نہ ثابت ہو کم نگاہی سے دیکھا جاتا ہے - ہر چند کہ یہاں کپڑوں سے انسان کی بابت رائے لگانے کا بڑا ہی رواج ہے - مگر دکاندار کو اس سے کچھ واسطہ نہیں اس کے لئے ہر گاہک "سر" ہے - اور بات بات میں یہ لفظ ڈالا جاتا ہے اگر آپ بوٹ والے کے ہاں جا دیں تو وہ اپنے ہاتھ سے آپ کا جوتا اُتاریگا اور پھر اپنے ہاتھ سے دوسرا جوڑا پہنائیگا - اگر آپ کئی جوڑے ناپسند کردیں تو وہ اور لیتا آئیگا اور تیوری پر بل نہ لائیگا - اگر آپ دیکھ بھال کر بغیر سودا لئے اُٹھ آئینگے تو بھی آپ کو "تھینک یُو" کہے گا - یعنی میں آپکی تشریف آوری کا مشکور ہوں - آپ کو جوڑا پہنا کر شکریہ وہ ادا کرتا ہے - پیسے لے کر وہ ادا کرتا ہے - باقی واپس دیکر وہ ادا کرتا ہے اور دُکان کے دروازہ تک آپ کو چھوڑتے وقت شکریہ اور سلام وہ عرض کرتا ہے - اور یہ نہیں کہ کوئی ایسے ہیں اور کوئی ویسے - ہر دکاندار میں یہ عادت پائیگا - اب فرمایئے یہ لوگ کیوں کامیاب نہ ہوں -

میں ایک بہت بڑے چھاپہ خانہ میں تصویروں کی چھپائی کا نرخ دریافت
کرنے گیا۔ بہت سا کام وہاں بجلی کی طاقت سے ہوتا تھا اور وہ کمپنی
اس درجہ کی ہے کہ ہمارے ہاں کے سب بڑے بڑے کارخانوں کو
ملا کر سول لے لے تو اسے کچھ معلوم نہیں۔ اُن کا مینجر اس توجہ سے ملا
کہ کیا بیان کروں۔ حالانکہ اسے یہ معلوم بھی ہو گیا۔ کہ جو کام اس سے
ملنے کی اُمید ہے وہ بہت قلیل ہے۔ جتنے سوال میں نے کیئے سب
کا خوشی سے جواب دیا اور سب جوابوں میں وہی "سر" اور "تھینک یُو"
موجود تھا۔ یہ ایک نہایت خفیف سی بات معلوم ہوتی ہے مگر کامیابی
کے لئے ایک نادر چٹکلا ہے۔ ایک اور خصوصیت یہاں کی دوکانداری
میں ہے۔ کہ آپ سوداگر کے ذمے چھوڑ دیجئے اور اپنا پتہ لکھوا دیجے
آپ کا مال نہایت حفاظت اور احتیاط سے شام کو آپ کے گھر پہنچا
دیا جائیگا۔ یہ بھی ایک ایسا طریق ہے جو قابل تقلید ہے۔ اس میں گاہکوں
کو نہایت سہولت ہوتی ہے۔ اور بہ حیثیت مجموعی دوکاندار کو کچھ بڑا خرچ نہیں
اُٹھانا پڑتا۔ مگر گاہک اس سے ممنون بہت ہو جاتے ہیں +

لنڈن کی پولیس - یہ تمام رونق یہ تمام گرم بازاری۔ یہ تمام دلچسپی
کے سامان جنکی طرف اوپر اشارہ ہُوا ہے۔ ہیچ ہوتے اور مسافروں کو
لنڈن میں رہنا اور چلنا پھرنا محال ہوتا۔ اگر لنڈن کو خوش قسمتی سے ایسے
عمدہ ملازمانِ پولیس میسر نہ ہوتے۔ اکثر کہا جاتا ہے۔ کہ لنڈن کی پولیس دنیا
بھر میں بہترین ہے۔ اور گو ایسے فقرات انگریزوں کی زبان سے عموماً اس
مبالغہ کا ایک جزو کثیر رکھتے ہیں جو حبِ وطن کے جوش سے پیدا ہوتا ہے۔
اور میں اُنہیں بالتمام کم باور کرتا ہُوں۔ لیکن میرا خیال ہے کہ اس میں

مبالغہ کی آمیزش نہیں - پولیس کا سپاہی لندن میں ایک نعمت ہے - اپنے فرائض کا نہائت پابند - حلم اور نرمی کا پتلا - اور انتظام کی جان ہے - اس کے فرائض یہاں نہائت مشکل ہیں - ایک بڑا کام تو اس کی سپردیہ ہے - کہ وہ یہاں کی بیشمار آمد و رفت کو باترتیب رکھے - چنانچہ اسے وہ نمایاں خوبی سے انجام دیتا ہے - ہر موڑ پر اور ہر چوک میں دن میں بیسیوں دفعہ یہ ہوتا ہے کہ ایک طرف سے بس - ایک طرف سے ٹریم - کسی طرف سے گھوڑے گاڑیاں - کسی طرف سے اسباب کے چھکڑے اور سب طرف سے آدمی آرہے ہیں اور خطرہ ہے کہ گاڑیاں ایک دوسرے سے ٹکرا جاویں - یا آدمی کسی گاڑی کے نیچے آ کر کچلے جاویں - مگر پولیس والا ان تمام خطرات کو روکتا رہتا ہے - جو اختیار اسے حاصل ہیں وہ بھی قابل غور ہیں اور جس عمدگی سے وہ انہیں برتتا اور لوگ مانتے ہیں وہ بھی قابل داد ہے پولیس والے کی ایک انگلی کا اٹھ جانا علامت ہے کہ اس طرف کے آدمی - گاڑیاں وغیرہ سب یکبارگی رک جاوین - اور وہ رک جاتے ہیں - تب وہ دوسری طرف کی گاڑیوں کو اشارہ کرتا ہے کہ جلدی سے گزر جاؤ - پھر آدمیوں کو اشارہ کرتا ہے کہ دوڑ کر نکل جاویں اور پھر رکی ہوئی گاڑیونکو چلتا کر دیتا ہے - دن بھر سڑک کے مرکز میں یا موڑ پر یا چوک میں وردی پہنے سیدھا بت بنا کھڑا رہتا ہے - دھوپ ہو تو سوائے ٹوپی کے کوئی حفاظت نہیں - اسے اپنی جگہ سے ہٹنا نہیں - اور بارش ہو تو باران کوٹ اور بارانی ٹوپی ہر وقت ساتھ ہے - پہن لی اور بارش میں کھڑا ہے اس کے علاوہ اس کی معلومات راستوں اور سڑکوں کی نسبت بہت وسیع ہیں اور ہر مسافر کو لازم ہے کہ جہاں ذرا بھی شبہ ہو

اُس سے پوچھ لے۔ وہ نہائت کشادہ پیشانی سے سب کچھ بتاتا ہے کاش ہماری سرکار ہندوستان کی پولیس کو اس نمونہ پر ڈھال لے۔ کہ وہ حقیقت میں رعیّت کے پاسبان بن جاویں۔ اگر لندن پولیس کے تجربہ کار افسروں کو کسی ترغیب سے اور زیادہ تنخواہ پر وہاں کی پولیس میں لیا جائے اور انہیں یہ ہدایت کیجاوے۔ کہ وہ اپنے ہاں کے طازموں کا نمونہ وہاں داخل کر دیں۔ تو غالباً اچھا نتیجہ ہو مگر یہ تحریک اخبارات کا حصہ ہے

لندن کے میلے۔ لندن میں مہذّب میلے روز رہتے ہیں۔ دو تین جگہ کسی نہ کسی قسم کی نمائش جاری رہتی ہے۔ جس میں ہزار ہا لوگ ہر روز شام کو جمع ہوتے ہیں اور تفریح اور تعلیم دونو مطلب ان سے نکلتے ہیں۔ ہر شنبہ کے روز دو بجے کے بعد تمام باغات میں گویا زور ہوتا ہے۔ اور اتوار کو خصوصاً گرما میں بہت سے لوگ کشتیوں میں بیٹھ کر دریا کی سیر کو گروہ درگروہ جاتے ہیں اور وہاں کھانے پینے کا سامان ساتھ لے جاتے ہیں۔ کہیں جو دریا میں جزیرہ سا آجاتا ہے تو وہاں ہجوم ہو جاتا ہے۔ یہاں یہ رنگ میلوں کا ہے۔ مگر ہمارے ہندوستان کی طرح کے میلے اب یہاں ناپیدا ہیں +

✓ **لندن اتوار کو**۔ یکشنبہ کا دن شہر میں عجب سناٹے کا ہوتا ہے۔ اتوار کو کام نہ کرنے کا جو مسئلہ عیسائی مذہب میں ہے۔ اگر اس کی پابندی ہندوستان میں کسی دن کے متعلق اس تشدد سے ممکن ہو جائے اوائل میں تو لوگوں کو زندگی وبال معلوم ہونے لگے۔ جب عادی ہو جاویں تو اور بات ہے۔ پوری ہڑتال ہوتی ہے۔ تمام دُکانیں بند ہوتی ہیں اور بازار سنسان۔ کچھ لوگ باہر نکل جاتے ہیں۔ کچھ گھروں میں پڑے رہتے ہیں

کچھ گرجاؤں میں جاتے ہیں۔ مگر وہ چہل پہل سب بند ہوتے ہیں کھانے پینے کے سامان عموماً ہفتہ کی رات کو اتوار کے لئے بھی ذخیرہ کر لیا جاتا ہے اور مسافروں کے لئے بھی ہوٹل وغیرہ اتوار کو ۶ بجے شام کے بعد کھلتے ہیں۔ نہائت بے رونقی ہوتی ہے۔ اور نئے آدمی کو شہر کا یہ رنگ دیکھ کر بہت تعجب ہوتا ہے۔ ڈاک بالکل بند ہوتی ہے۔ نہ کسی کو خط جا سکتا ہے نہ آسکتا ہے۔ اتوار کو لنڈن آرام کرنے پر مجبور کیا جاتا ہے۔ اور ہفتہ بھر کا تھکا ماندہ اس آرام کا حقیقت میں مستحق بھی ہے۔ ہمیں بھی اس کے آرام میں مخل نہیں ہونا چاہیئے۔ اب پھر کسی دن جب کاروبار رونق پر ہوگا تو سیر کو نکلینگے +

اکتوبر ۱۸۲۸ء۔ میری ایک معزز دوست جو آجکل لکھنؤ میں مقیم ہیں بادشاہ کے جشن تخت نشینی کی کیفیت اس طرح لکھتی ہیں:۔ اٹھارہ اکتوبر کو بادشاہ کی تخت نشینی کی سالگرہ تھی اور میں بھی اس مبارک رسم میں شریک ہوئی تھی۔ اس تقریب کے اختتام کے بعد ہم سب بادشاہ کی والدہ کے محل میں گئے۔ جہاں تمام بیگمات اور شاہزادیاں آج مدعو تھیں۔ کہاریاں ہمارا تام جھام اٹھا کر محل میں لیگئیں۔ دروازہ کے قریب اردا بیگنیوں اور مغلانیوں کی ایک چھوٹی سی پلٹن مردانہ لباس پہنے ہاتھوں میں سونے اور چاندی کے عصا لئے ہماری تعظیم کے لئے صف بستہ کھڑی ہوئی تھی۔

بادشاہ بیگم صاحبہ (نصیر الدین حیدر کی والدہ) بہت سادہ پوشاک پہنے تھیں اور کسی قسم کا زیور بھی ان کے بدن پر نہ تھا۔ شاہ متوفی کی ایک اور بیگم جو بہت کم سن اور خوبصورت تھی انکے پاس بیٹھی ہوئی تھی۔ مگر اس کا لباس بھی بہت سادہ تھا۔ کیونکہ یہاں کے دستور کے مطابق بیوہ عورتیں مکلف پوشاک اور زیورات سے احتراز کرتی ہیں۔ بادشاہِ حال کی بیگمات نہایت قیمتی اور نفیس پوشاکیں زیب بدن کئے ہوئے تھیں۔ اور بیش بہا جڑاؤ زیورات سے لدی ہوئی تھیں۔ ان میں سے ایک بیگم بالخصوص ایسی حسین تھیں کہ میں نے اپنی یاد میں ہندوستان میں کہیں ان سے زیادہ خوبصورت عورت نہیں دیکھی۔ بادشاہ آجکل انپر بہت فریفتہ ہیں اور ان کی شادی بھی حال ہی میں ہوئی ہے۔ ان کا سن قریب ۱۴ برس کے ہوگا ہاتھ پاؤں بہت چھوٹے چھوٹے اور نازک ہیں۔ اعضا کے تناسب کے علاوہ نقشہ ایسا سڈول ہے کہ میں نے اس سے زیادہ دلاویز اور دلکش چہرہ کبھی نہیں دیکھا۔ اور ان کو دیکھ کر بار بار میرا خیال مور شاعر کی مشہور ہیروانِ "لالہ رخ" کی طرف جاتا تھا۔ ان کی حرکات اور طرز نشست سے غایت درجہ کی مسکینی۔ حیا پروری اور حجاب مترشح تھا۔ پوشاک سرخ کمخواب کی تھی اور بال بال میں موتی پردئے ہوئے تھے۔ زلفیں شانوں پر بکھری ہوئی تھیں اور پیشانی پر ایک چھوٹا سا جھومر آویزاں تھا۔ جس میں بڑے بڑے موتی اور زمرد جڑے ہوئے تھے۔ کانوں میں بہت سی بالیاں تھیں۔ جس میں بیشمار زمرد۔ لعل اور موتی جڑے ہوئے تھے۔ گلے میں متعدد موتیوں کی مالاؤں کے علاوہ ہار اور کنٹھے تھے جو ان کے حسن کو دوبالا کرتے تھے۔ نتھ میں دو بڑے بڑے موتی اور ان کے بیچ میں ایک بیش

قیمت زمرد آویزاں تھا +

پشواز اس قدر بھاری تھی کہ کئی پیش خدمتیں اُسے سنبھالے ہُوئے تھیں۔ جس کو بیچ پر یہ بیگم صاحبہ متمکن تھیں۔ اُس کے گرد کئی خواصیں اس غرض سے استادہ تھیں کہ دوپٹہ کو درست کرتی رہیں۔ کیونکہ ذرا سی حرکت سے موتی کمخواب کے بھاری دوپٹے میں اُلجھ جاتے تھے۔ ان سے اور بیگمات بہت حسد کرتی ہیں۔ جس کا سبب یہ ہے کہ بادشاہ اور انکی والدہ دونوں ان پر از بس مہربان ہیں۔ بادشاہ نے انہیں نواب تاج محل بیگم کا خطاب عنایت کیا ہے اور اس میں شک نہیں کہ خود نورجہان بھی اس سے زیادہ حسین اور جمیل نہ ہوگی +

ایک اور نئی بیاہی ہُوئی بیگم بھی اُن کے قریب ہی بیٹھی ہوئی تھی۔ یہ ایک انگریزی سوداگر کی بیٹی ہے اس کی شکل صورت بہت معمولی ہے مگر یہاں کی مستورات اُسے بہت خوبصورت تصوّر کرتی ہیں۔ اس کی پوشاک سے بھی زیادہ پر تکلف تھی۔ اور اس کی پیشانی پر بھی ایک بہت بیش قیمت مرصّع جھومر الماس کا تھا۔ اس زیور کی شکل ہلال سے بہت مشابہت رکھتی ہے۔ یہ بیگم خاص تعلیم یافتہ ہے۔ اپنی مادری زبان انگریزی کے علاوہ اُردو فارسی بھی اچھی طرح لکھ پڑھ لیتی ہے

۱۷؎ - یہ بیگم دراصل ایک انگریزی افسر کی بیٹی ایک دوغلی عورت کے بطن سے ہے۔ بعد میں اسکی ماں نے ایک دولتمند مہاجن سے تعلق پیدا کر لیا۔ اسکی ایک اور بہن بھی ہے۔ یہ دونوں بہنیں جب اپنی ماں کے پاس رہتی تھیں تو اپنے گذارہ کیلئے دولتمند شرفا کے گھوڑوں کیلئے زین پوش کاڑھا کرتی تھیں۔ شکل صورت دونوں کی واجبی تھی لیکن ان میں سے ایک نے اپنی تصویر بادشاہ کو بھیجی جس نے فریفتہ ہو کر اس سے شادی کر لی۔ پھر تو روپیہ کی ریل پیل ہو گئی۔ اور اس نئی بیگم نے اپنے سوتیلے باپ یعنی اس مہاجن کو خزانچی مقرر کر لیا۔ اور اپنی ماں اور بہن کی خاطر خواہ پنشن مقرر کر دی

لیکن جب ہم نے اس سے انگریزی میں ہمکلام ہونا چاہا تو اس نے جواب دیا کہ میں اب انگریزی بھول گئی ہوں۔ سنا جاتا ہے کہ بادشاہ اس سے انگریزی پڑھتے ہیں۔ تاج محل سے شادی ہونے سے پیشتر بادشاہ اسے نہیں چاہتے تھے۔ باوجودیکہ یہ دونوں بیگمیں برابر ایک ہی کوچ پر بیٹھی ہوئی تھیں جوش رقابت ان دونوں میں اس درجہ بڑھا ہوا ہے کہ مطلقاً آپس میں بول چال نہیں ہوئی۔ نواب ملکہ زمانی بیگم جو صاحب اولاد ہونے کی وجہ سے بہت اقتدار رکھتی ہیں اس صحبت میں شریک نہ تھیں۔ ہم خود انکے محل میں ملاقات کے لئے گئے۔ خاندان مغلیہ کی شاہزادی جس سے کہ شاہ متوفی نے بادشاہ حال کی بچپن میں شادی کی تھی اپنے محل میں نظر بند ہے۔ بادشاہ ان سے بہت کشیدہ خاطر بھی سنا جاتا ہے کہ ان کے حسن وجمال کو ان میں سے کوئی بیگم نہیں پہنچتی +

نواب وزیرادوہ کے بادشاہ ہونے کی اصلی کیفیت یہ ہے کہ نواب سعادت علی خان کے انتقال کے بعد ان کے بیٹے مرزا غازی الدین حیدر نے اپنے نائب آغا میر کے صلاح ومشورہ سے شاہ دہلی کی اطاعت سے انحراف کیا اور سرکار انگلشیہ کی اجازت لیکر اپنی قلمرو میں سونے اور چاندی کا سکہ اپنے نام سے جاری کیا۔ غازی الدین حیدر کے درالصل کوئی لڑکا نہ تھا صرف ایک بیٹی تھی جو اپنے چچازاد بھائی سے منسوب ہوئی۔ اس کے لڑکے کا نام محسن الدولہ ہے اور وہی در اصل اصلی وارث تاج وتخت ہے۔ بادشاہ نے بجائے اس کے کہ اپنے نواسے کو اپنا جانشین مقرر کرے یہ ظاہر کیا کہ نصیر الدین حیدر جو ایک حرم کا لڑکا تھا ان کا اصلی لڑکا ہے۔ یہ شخص آجکل بادشاہ ہے۔ انگریزی حکام اس کی حسب دستے

اچھی طرح واقف ہیں۔ شاہ حال کی وفات پر جانشینی کا ضرور تنازع ہوگا۔ کیونکہ بجائے اصلی وارث فریدوں بخت مناجان کے ایک لڑکے کو جسے کیواں جاہ کا خطاب دیا ہے وارث مقرر کرنا چاہتا ہے۔ نواب منتظم الدولہ حکیم مہدی علی خاں آج کل وزیر اعظم ہیں۔ حاضری کے وقت بھی اُن کے ہاتھ میں تسبیح تھی۔ حاضری کے بعد بادشاہ کا پیچوان نواب کے سامنے لایا گیا۔ یہ بڑی بھاری عزت تصور کیجاتی ہے۔ کیونکہ رعایا میں سے کوئی شخص بادشاہ کے سامنے حقہ نہیں پی سکتا۔ حاضری کے بعد بادشاہ دوسرے کمرے میں گئے۔ یہاں پر ریزیڈنٹ نے حسب دستور بادشاہ کی دستار اُتار کر تاج شاہی ان کے سر پر رکھا اور بادشاہ تخت پر جلوس فرما ہوئے۔ آج تاریخ جلوس کی سالگرہ ہے۔ کیواں جاہ بڑا لڑکا جس کی عمر ۱۴ برس کی ہے۔ ایک بدشکل نیچ قوم کا لڑکا معلوم ہوتا ہے۔ اس کے حرکات وسکنات سے بھی کم اصل ہونے کا ثبوت ملتا ہے۔ اس نے سب سے پہلے بادشاہ کو نذر دی اور چار پانچ خلعت رقوم جواہر مرصع تلوار ڈھال اور خنجر ہاتھی پالکی وغیرہ اُسے عنایت ہوئے اس کے بعد فریدوں بخت جو ایک شکیل تیز طبع ہونہار لڑکا معلوم ہوتا ہے نذر لیکر گیا۔ اس کو بھی اسی طرح کا سامان خلعت میں مرحمت ہوا اب نواب حکیم مہدی پیش ہوئے دستار مع سرپیچ مرصع شال و خلعت عطا ہوا۔ انہوں نے نہایت ادب سے جھک کر تسلیمات عرض کی۔ تب محسن الدولہ وارثِ حقیقی نذر دینے کے لئے آگے بڑھے تو بادشاہ کا چہرہ مکدر معلوم ہوتا تھا اور اُس کے چہرہ پر افسوس و رنج کی علامت نمایاں تھی۔ محسن الدولہ بہت وجیہ خوبصورت جوان ہے اور نہائت ذکی

اور تیز فہم ہے سب مجھے یہ امر بہت ناگوار معلوم ہوا کہ اصلی وارث ایک نامنصفانہ
رواج کی پابندی کے سبب سے غیر مستحق شخص کو نذر دے اور اپنا بادشاہ
تسلیم کرے۔ اور اس رسم کے اختتام کے وقت جواہرات کی بوچھاڑ
ہوئی۔ رزیڈنٹ کی اور میری آستین پر چند جواہر آ پڑے تھے۔ میں
نے رزیڈنٹ کو آستین جھٹکتے ہوئے دیکھ کر اس کی تقلید کی اور جواہرات
زمین پر پھینک دئے۔ شاہی خواصوں نے سب جواہرات سمیٹ کر
باہم تقسیم کر لئے۔ اس بوچھاڑ میں زمرد پکھراج نیلم اور ہیرے تھے کیسی
قیمتی اور تعجب خیز بخشش ہے +

دستار

ٹوپی پر جو مضمون لکھا جا چکا ہے۔ اُسے پڑھ کر ایک نقادِ سخن نے
یہ رائے لکھی ہے:۔ بہت سی ٹوپیاں ملاحظہ سے رہ گئیں۔ عمامے پر بھی
نظر ہونی چاہئے تھی"۔ بیشک کئی ٹوپیاں ابھی منتظرِ توجہ ہیں۔ اور کیا عجب
ہے کہ اُنکی پرسش کا بھی کوئی دن آجائے۔ سردست۔ دستار سے دو دو
باتیں ہو جائیں۔ خدا جانے الفاظ میں تاثیر کہاں سے آجاتی ہے۔ ممکن
ہے بعض لوگ اس سے آگاہ نہ ہوں۔ لیکن میرا یہ ایمان ہے کہ بعض لفظ
بنے ہی ایسے ہوتے ہیں۔ کہ معزز معلوم ہوں۔ اور بعض ایسے خفیف ہوتے
ہیں۔ کہ نظر میں نہ جچیں۔ شاید کوئی صاحب کہیں کہ محض پرانے اور دیر
سے ذہن نشین شدہ خیالات سے کہتے ہو۔ مگر میرے ذہن میں۔ لفظِ دستار

باوجود زمانہ کی ناقدر شناسی کے کانوں کو معزز معلوم ہوتا ہے اور ٹوپی باوجودیکہ قبول عام کا طرہ اس کے سر پر ہے۔ کچھ ہلکی سی چیز نظر آتی ہے۔ دستار کسی زبان میں اس کا نام لو۔ ایک متانت اور ثقاہت کا بوجھ سنبھالے ہوئے معلوم ہوتی ہے۔ پگڑی ہی کو دیکھئے۔ تعدادِ حروف اور وزن تو وہی ہے۔ جو ٹوپی کا۔ مگر اس سے کسی قدر بھاری بھرکم ہے۔ اس کے تلفظ میں بھی ایک قسم کی گرانی ہے۔ اور یہ گرانی کچھ لفظی ہی نہیں۔ قیمت میں بھی پگڑی ٹوپی سے گراں قدر ہے۔ ململ کی سادی یا بیلدار ٹوپی چند آنوں میں ملے۔ تو پگڑی چند روپیوں میں۔ ٹوپی اگر طلائی کام کی۔ یا سلمے کی یا لیسدار لو تو معمولی پانچ سات روپئے میں۔ لیکن پگڑی اگر ریشمی یا زرکار یا اور کسی طرح کے تکلف والی ڈھونڈو تو بیس روپئے سے لیکر سو روپیہ تک کی۔ کسی بامذاق آدمی کے سامنے اس کا عربی نام لیجئے "عمامہ"۔ دیکھئے کتنی وقعت اُس کے دل میں پیدا ہوتی ہے۔ اول تو عمامہ خود معتبر چیز ہے۔ دوسرے معتبروں کی صحبت میں معتبر بنگیا ہے۔ جب اس کا ذکر سنو۔ کسی بزرگ کے نام کے ساتھ آتا ہے۔ کچھ نہ ہو تو زاہد یا شیخ گویا اُن کے ساتھ مخصوص ہو گیا ہے۔ مثلاً کہتے ہیں ؎

دیکھنا محفلِ رنداں میں نہ آنا اے شیخ

یہ وہ محفل ہے۔ کہ عمامہ اچھل جاتا ہے

اس شعر سے دو مطلب نکلتے ہیں۔ ایک تو یہ کہ شیخ صاحب عمامہ ہے۔ دوسرے یہ کہ اس کے نزدیک عمامہ عزیز ترین مقبوضاتِ ذاتی ہے۔ جس کے متعلق خوف دلانے سے گویا اس کے شریکِ محفل ہونے کا احتمال بھی نہیں رہیگا۔ اسی طرح ایک اور رند مشرب حضرت ناسی

میں فرماتے ہیں۔ ؎

در کوئے مغاں زاہد رہ نیست تکلف را
گیرم کہ تو گنجیدی عمامہ نمے گنجد

یہاں عمامہ زاہد کا ملک قرار دیا گیا ہے اور اس کا رعب اس درجہ ہے کہ مجمع رندان اس سے گھبراتا ہے۔ اور اس لئے چاہتا ہے کہ عمامہ اُن کے تخلیہ میں خلل انداز نہ ہو۔ اور اس کو ایک ایسی بڑی چیز قرار دیتا ہے کہ خود زاہد سما جائے تو سما جائے مگر عمامہ کے لئے گنجائش کہاں۔ دستار کی فضیلت اسی سے ظاہر ہے کہ دستارِ فضیلت کا یہ ایک جزو ہے پگڑی کی توقیر میں اتنا کہنا کافی ہے۔ کہ اب تک ہمارے دیہات میں سر پہ پگڑی ہونا سرداری کی علامت ہے۔ یہ نہ سمجھنا کہ یہ محض پرانے توہمات اور قدیم رواج ہیں۔ بلکہ ٹوپی پوش حکمران خود پگڑی کے قدردان ہیں۔ عدالتوں اور دفاتر سرکاری کا ایک اَن لکھا قانون ہے۔ کہ لوگ پگڑی باندھ کر آئیں۔ کلکتہ میں بنگالی لوگ جو ٹوپی اور پگڑی دونوں کی قید سے آزاد ہیں۔ اور قدرت کی بنائی ہوئی کھوپری اور اس پر روغن نارجیل سے تر بتر کنگھی کئے ہوئے بالوں کو کافی زینت سمجھتے ہیں۔ عدالت کی کرسی پر بیٹھتے وقت ایک گول سی بندھی بندھائی پگڑی سر پر دھر لیتے ہیں۔ وہی نشانِ حکومت ہے اور وہی تمغائے لیاقت۔ گھر گئے اور پگڑی اُتار کر رکھدی۔ گویا جج یا منصفی سے سبکدوش ہوئے اور گھر پر سیدھے سادے نرے پُرے بنگالی بن کے آرام اور بیفکری سے بیٹھ گئے۔ ادھر صوبجات متحدہ کی جانب چلے آؤ اور آپ دیکھینگے کہ پنڈت جی ہیں تو اپنی گھٹی ہوئی پگڑی پر نازاں ہیں۔ اور سیٹھ جی مہاراج کو اگر کچھ

چپڑ گماشتوں۔ دلالوں اور عام بیوپاریوں سے ممتاز کرتی ہے تو گلابی رنگ کی ایک ذراسی پگڑی ہے جسے کالبوت پر رکھ کر باندھتے رہنا بعض غریب لوگوں کا ذریعۂ معاش ہے۔ اور مولوی صاحب کا تو کیا ہی کہنا۔ انکا عمامہ تو مولویت کا ایک جزو ضروری ہے۔ جنوب ہو یا شمال۔ ہند ہو یا سندھ کشمیر ہو یا میسور۔ مولوی صاحب کا عمامہ موجود ہے۔ تھوڑے تھوڑے فرق سے یہ دو شعر اکثر مولوی صاحبان کے لئے موزوں معلوم ہوتے ہیں:۔

دیتا جارو ب سر خاک ہے جامہ اُن کا ۔۔۔ چھتریاں سر پہ لگائے ہی عمامہ اُن کا
سر پہ دستار فضیلت کی بہت بھاری ہے ۔۔۔ پیٹ اُن کا تو کتب خانہ کی الماری ہے

جنوبی ہندوستان کو دیکھو۔ تو اہل مدراس نے پگڑی کی قدر پہچانی ہے یعنی اس درجہ تک کہ جوتے کو بھی اُتار پھینکا ہے۔ عجب مزا آتا ہے جب کسی پرانے ڈھنگ کے مدراسی کو دیکھیں کوٹ بھی ہے۔ پتلون بھی۔ کالر بھی۔ ٹائی بھی۔ سر پر دوپٹہ بنارسی تیس چالیس روپیہ کا بندھا ہوا ہے۔ مگر پاؤں پر نظر ڈالو تو جرابوں کے تکلّف سے بھی فارغ ہیں۔ اچھے اچھے معزز ننگے پاؤں ریت پر یوں دوڑے پھرتے ہیں۔ کہ دیکھنے سے تعلق رکھتا ہے۔ اہلِ بمبئی کا تو کیا کہنا۔ انہوں نے تو عمامہ کو اپنی اصلی خوبی کے ساتھ قائم رکھا ہے۔ مرہٹوں کی پگڑی بھی ایک خاص بانکپن رکھتی ہے۔ مگر اس کے نیچے منڈے ہوئے سر کی نمائش اسے کسی قدر بدزیب بنا دیتی ہے۔ گر بمبئی کے مسلمانوں کی خوبصورت عبائیں۔ ان پر لمبی لمبی قبائیں اور سروں پر خوشنما اور قیمتی عربی عمامے۔ انکے تموّل اعتبار اور اعزاز کی مجازی علامتیں ہیں۔ کاش یہ عمامے ساتھ علمی فضیلت بھی لئے ہوتے۔ پھر تو ہم مسلمانانِ بمبئی کو دوسرے مقامات کے لوگوں کے لئے نمونے کے طور پر پیش

کر دیتے - پارسیوں کا لباس سر بھی درحقیقت ایک قسم کی بندھی بندھائی پگڑی ہے۔ اور وہ اس قدر بلند - دیرپا اور مضبوط ہوتی ہے - کہ زبانِ حال سے یہ کہتی ہے کہ اس زمانہ میں ہندوستان کی قوموں کی لاج اسی پگڑی نے رکھی ہوئی ہے۔ وسط ہند اور راجپوتانہ کی ریاستوں میں آئیں تو پگڑی ایک خاص سپاہیانہ ٹھاٹھ بدلتی ہے۔ تصویریں ہوں تو دکھائیں - کہ فوجی جوان کس آن بان سے پیچدار دوپٹے زیبِ سر کر کے اتراتے پھرتے ہیں کجکلاہی کی بجائے کج دستاری سے کام لیا جاتا ہے - ایک طرف پگڑی کے پیچ کان سے دُور اُوپر کی طرف بھاگتے جاتے ہیں اور دوسری طرف کان کو ڈھانک کر رخسار کے ایک حصّے کو بھی گھیرے ہوئے ہیں۔ ایک طرف پہاڑ کی چوٹی ہے تو دوسری طرف وادی - غرض پگڑی کیا ہے نشیب و فرازِ عالم کی تصویر ہے - اس پگڑی میں ایک چیز اور ہے جس کے دکھانے سے عکسی تصویر بھی قاصر ہے - یعنی اس کے خوشنما رنگ - معلوم ہوتا ہے - وردی میجر صاحب نے قوسِ قزح آسمان سے چھین کر سر پر لپیٹ لی ہے +

یُوں تو ہندوستان کے ہر حصّے میں دستار کسی نہ کسی صورت میں موجود ہے مگر ہمارا پنجاب تو اس کا گھر ہے - یہاں اس کی بن آئی ہے۔ جتنی بڑی ہو اتنے ہی آپ امیر - اتنے ہی معتبر - چھوٹی سی پگڑی باندھ کر کوئی باہر نکلے تو کہتے ہیں - ارے میاں یہ کیا لنگوٹی سی سر پر باندھ رکھی ہے بہاولپور - ملتان - ڈیرہ جات - ان اطراف میں تو پورا تھان سر پر دھر لیتے ہیں - اور اس پر کچھ قانع نہیں - اگر اور بڑے تھان ولایت سے بنکر آنے لگیں تو اس نواح میں بڑے گاہک ہیں - ان پگڑیوں میں ایک خوبی ہے - ان کے پیچ ایسے عجیب ہوتے ہیں کہ گویا بیقاعدگی میں باقاعدگی

لپٹی ہوئی ہے۔ بظاہر کوئی کدھر گیا ہے اور کوئی کدھر۔ اور ایک شخص کی بندش دوسرے سے نہیں ملتی۔ پیچ دیوالئے معلوم ہوتے ہیں۔ مگر ان کی دیوانگی میں بھی ایک ترتیب" ہوتی ہے۔ بڑے شہروں میں اور خصوصاً پنجاب کی ریاستوں کے دارالخلافوں میں زنگارنگ کی پگڑیاں عجب بہار دکھاتی ہیں۔ سرحد پنجاب میں پگڑی کو زیادہ وزن دار بنانے کے لئے ایک خاصہ بوجھل کلہ (جو چھوٹے پیمانے پر ایک مصر کا مینار ہوتا ہے مخروطی) جزوِ دستار قرار دیا گیا ہے اور اس کی ساخت میں بہت محنت صرف کی جاتی ہے۔ اس زمانہ میں زندگی کے مختلف صیغوں میں ان دستاربند پنجابیوں نے نام پیدا کیا ہے اور اس ناموری کے ساتھ باہم دستار کی بھی ناموری بڑھ چلی ہے۔ کیا ہوا اگر بنگالہ کے لوگ اسے آتار کر پھینکنے پر آمادہ رہتے ہیں اور صوبجات متحدہ کے لوگوں نے ٹوپی کو ترجیح دے رکھی ہے اور بمبئی مدراس والے دستار وقت ضرورت پہنتے ہیں۔ جب تک پنجاب کے دم میں دم ہے۔ پگڑی کا بھرم کھلنے نہیں پائیگا۔ بلکہ اور لوگ بھی اس کا دم بھرنے لگیں تو عجب نہیں۔ کیا انہیں معلوم نہیں۔ کہ پنجاب میں سب سے زیادہ خصوصیت ایسے سکھوں کی قوم سے ہے (انکے لمبے بال کسی اور لباس میں سنبھالے ہی نہیں جا سکتے) اور سرکار دولتمدار کی نظر میں سب سے منظور نظر قوم اس وقت سکھوں کی ہے۔ جو دستار کی فضیلت سے اب تک منکر تھے اور اس کی بزرگی میں شک رکھتے تھے۔ انکے لئے یہ دلیل قطعی ہونی چاہئے۔ کہ سکھوں کے سر پر پگڑی ہے اور اس پگڑی پر لاٹ کرزن بہادر کا ہاتھ ہے +

ناکتخدا لڑکی

اے معزز خاندان کی کم سن پیاری لڑکی تیرے خوبصورت چہرہ سے عالی خاندانی کے آثار نمایاں ہیں۔ شریف والدین کے تعلیمی اثر نے تجھے چھوٹی سی عمر میں بُردبار اور متین بنا دیا ہے۔ لیکن تقاضائے عمر کی بچپنیاں تیری صورت سے ٹپک رہی ہیں۔ تیری بھولی بھالی باتیں پتہ بتا رہی ہیں کہ بامِ عمر کی صرف دسویں سیڑھی تک تیرا قدم پہنچا ہے۔ بس اب دو تین زینوں پر قدم رکھنے کے بعد تیری زندگی کا ایک نیا مرحلہ شروع ہوگا۔ کیا تجھے یہ لاؤبالی زمانہ یاد رہیگا؟ نہیں۔ پھر تو کسی اور دنیا میں چلی جائیگی۔ تیرے اس مکان کی چار دیواری جو اس وقت تیری دنیا ہے اور تیرے مکان کی چند گز زمین جو تیری سیر گاہ ہے پھر تو اسے کہاں پائے گی۔ عیش و آرام کی گودیوں میں پلی ہوئی دوشیزہ لڑکی خدا کرے۔ تو جیسی خوبصورت ہے ویسی ہی خوش نصیب بھی ہو۔ تیرا نیک شوہر کسی شریف خاندان کا سعید اور تعلیم یافتہ نوجوان ہو اور یہ خدا کی دی ہوئی نعمت تیرے لئے سرمایۂ ناز ہو تو اپنے ہمجنسوں میں فخر و مباہات کرے اور وہ تیری عصمت اور سلیقہ شعاری کا قدردان ہو۔ بھولی ناسمجھ لڑکی ابھی تو تو گڑیوں سے کھیل رہی ہے۔ انہیں سے تیرا دل بہلتا ہے اور انہیں کو تو پیار کرتی ہے ان ہی کو تو اپنے ہاتھ سے سی سی کر عمدہ کپڑے پہناتی ہے اور انہیں کو تو اپنے ہاتھ سے بنائی ہوئی گروندی طاق میں بٹھا کر اپنی صناعی کا تماشہ دیکھتی ہے اور دل ہی دل میں شاد ہوتی ہے۔ اللہ اللہ تو اس عالم

کے مزے لوٹ رہی ہے۔ جس کو دنیا اور افکار دنیا سے کوئی تعلق نہیں
تیرا چھوٹا بھائی تجھ کو ستانے کے لئے تیری گڑیوں کو تتر بتر کر دیتا ہے
اور انہیں نوچ کھسوٹ ڈالتا ہے تو تو کبھی رونے لگتی ہے اور کبھی
فریاد کرتی ہے کبھی اُس شوخ لڑکے کو کوستی ہے اور اگر زیادہ غصہ
آتا ہے تو اُس کے دونوں ہاتھ پکڑ کر زمین پر گرا دیتی ہے۔ وہ
چالاک لڑکا کیا صفائی سے ہاتھ چھڑا کر نکل جاتا ہے اور تو منہ دیکھ
کر رہ جاتی ہے۔ پھر تو آنسو پونچھ کر اپنی چیزوں کو ٹھکانے سے رکھتی
ہے۔ پیاری زہرہ (ہاں یہی تیرا نام ہے) جب تو نے اپنے ہمسائے
کی لڑکی رشیدہ سے اپنے گڑیا کی شادی کی اور تیری ساری سہیلیوں
نے خدائی رات میں ڈھول بجا بجا کر شادیانے گائے۔ کیا اس وقت
تجھے یہ خیال آیا تھا کہ تیرا دولہا بھی آخر کوئی ہوگا جو کسی روز اس گڑیا کی
طرح تجھے بھی بیاہ لیجائیگا جس کو تو نے بنا سنوار کر بٹھایا ہے۔ نہیں تجھے
یہ خیال کیوں آنے لگا۔ شرافت کا خون جو تیری رگوں میں شرم و حیا
بنکر دورہ کر رہا ہے وہ ایسے معاملوں کی طرف تیرے ذہن کو منتقل
ہونے نہ دیگا تیری بھولی صورت کہ رہی ہے کہ تو شرم والی لڑکی ہے
تو میلے کچیلے کپڑے پہنے ہوئے ہے تیری چھوٹی سی چوٹی جو شفیق ماں
نے اپنے ہاتھ سے گوندھ دی ہے اُس کو بھی تیری بے پرواہی سنبھال
نہیں سکتی۔ آگے کے چھوٹے چھوٹے بال چوٹی سے کھل کر لچھے دار ہو گئے
ہیں اور چاند سی پیشانی پر لہرا رہے ہیں تو گھبرا گھبرا کر انکو پیشانی سے
ہٹاتی ہے مگر وہ حسین چہرہ کی بلائیں لینے کو جھکے پڑتے ہیں ظاہری نمائش
اور مصنوعی آرائش سے تیری مستغنی طبیعت کو کس قدر نفرت ہے

قدرت کے پاک ہاتھوں کی بنائی ہوئی تصویر عصمت کا فرشتہ تجکو اپنے
پردوں میں چھپائے ہے کہ تیرے خدا داد حسن کو کسی کی نظر نہ لگ جائے
بے مسی کے چمکتے ہوئے خوشنما دانتوں کا سلسلہ سلک مروارید کو
شرمارہا ہے بغیر کاجل کے شرم وحیا بھری ہوئی آنکھوں کا جادو
مہربان والدین کا دل لبھارہا ہے۔ مگر ہاں اے نیکبخت زہرہ آج
تیری ماں کے کلیجہ میں پنکھے کیوں لگے ہیں؟ تو اپنی ہم عمر سہیلیوں
کے ساتھ ہنڈ کلھیا پکارہی ہے اور وہاں گھر کے بڑے بوڑھوں میں
سرگوشیاں ہورہی ہیں +

ناسمجھ لڑکی تو جس گھر میں پلی ہے اس کے درودیوار پر اک حسرت
بھری نظر ڈال کے الوداع کہے اور اپنی پیاری پیاری گڑیوں سے
بھی رخصت ہولے۔ اب تو ان سے چھوٹ جائیگی اور دنیا داری کے
کام تیرے گلے پڑیں گے۔ تجھے ایک نئے گھر میں جانا ہے جہاں کا آسمان
وزمین بھی تیرے لئے بیگانہ ہے۔ نئے نئے لوگ ہونگے نئی نئی صورتیں
دیکھنے میں آئینگی تو اپنے گھونگھٹ کے اندر ہی اندر حسرت بھری نظریں
دوڑائیگی۔ مگر تیری پیاری سہیلیاں تجھے نظر نہ آئینگی۔ بہت دن تیرا
دم گھبرائیگا۔ جس نے تجھے اپنی گود میں پالا جس نے تیری ضد پوری
کرنے کے لئے ہزاروں مصیبتیں جھیلیں۔ وہ عاشق زار ماں چھوٹ
جائیگی۔ تیرے چاہنے والے رَضِینَا بِاَمرِ اللہِ کہکر تجھے اک ایسے اجنبی
کے سپرد کردینگے کہ جس کی صورت بھی آج کے سوا تو نے کبھی نہ دیکھی
ہوگی۔ اب وہ ہمیشہ کے لئے تیرا چاہنے والا دولہا تیری نیک مزاجی
اور سلیقہ شعاری کا قدردان ہوگا۔ تیری ماں نے اپنے کلیجہ پر پتھر رکھ لیا

تو ایک غیر شخص مگر وارث شرعی کے پہلو میں ہے اپنے بھولے چہرہ سی ہاتھ اُٹھا کر دیکھ۔ اُس کی مانوس نگاہیں محبت میں ڈوبی ہوئی تیرے دریائے حسن کی موجوں میں غوطہ کھا رہی ہیں۔ کیا تو اس بات سے خوش ہے کہ اک حسین نوجوان کے پہلو میں بیٹھی ہے؟ نہیں۔ تو ابھی خوش نہیں مگر آئندہ خوشی کی اُمید رکھ۔ ناسمجھ لڑکی تیرے آنسو کیوں ڈبڈبائے ہوئے ہیں تو ہچکیاں لے لے کر کیوں رو رہی ہے۔ اب اپنا گھر کیوں یاد کرتی ہے۔ آنکھیں کھول اور دیکھ کہ اب یہی ہمیشہ کے لئے تیرا گھر ہے۔ اور یہ اجنبی جوان تیرا شوہر ہے۔ ذرا اپنے متصل گریہ کو روک کر ہچکی تھمے۔ دل کو ٹھہرا۔ اور سُن۔ دکھیا ماں تجھے دُعا دیتی ہے اور تجھ سے رخصت ہوتی ہے۔ میری پیاری بچی میری نادان زہرہ خدا تیرے خاوند کو نیک ہدایت دے وہ تیرا آنلوا دیکھ کر کسی کا منہہ نہ دیکھے تیرا گھر آباد رہے تو پھلے پھولے سات بچوں کی ماں ہو۔

بدنصیب کا لال

مصیبت کا زمانہ پریشانی کے دن رات کا وقت برسات کا موسم مفلسی بیکسی بےبسی ماں باپ بھائی بند دیور جیٹھ ساس نند کچھ مر کر چھوٹے کچھ جیتے جی چھوٹے دو دن کی بیاہی چوتھی کھیل سُسرال آئی ادھر بیٹھی سوار ہوی اُدھر ماکو نجار چڑھا ہر چند ٹالا مگر کچھ ایسی گھڑی کا چڑھا کہ جان ہی لیکے ٹلا! دن بھر لوتھ پڑی رہی شام کو سرسام رات کو سکرات صبح

ہوتے ہوتے رخصت +

چوتھی کی دولہن گم سم سسرال سے چلی اور روتی بلکتی میکے آئی بہیج کو پھول ہوئے گھر میں مہمان بھرے تھے باہر ابا جان کا نکاح ہو رہا تھا۔ قصہ مختصر اماں یوں گئیں ابا یوں گئے! اور کوئی اول تو تھا ہی نہیں اور جو تھیں بھی تو ایک رشتے کی نانی وہ آپ جٹھانی کے ٹکڑوں پر تھیں ساٹھ پینسٹھ برس کی بڑھیا پھوس بھری بھنڈ منہہ میں دانت نہ پیٹ میں آنت بات کی نہ چیت کی کام کی نہ کاج کی ہونا نہ ہونا دونوں یکساں +

بھائی جس کے دم سے میکا ہے بدنصیب دولہن کا کوئی نہ تھا بہنیں کہنے کو تو ماشاءاللہ ایک چھوڑ دو دو مگر دونو اپنے اپنے گھر بار کی ایک خوشحال وہ پردیس دوسری شہر میں وہ کنگال بھی کیسی کہ اناج تک کو محتاج غرض میکے میں تو نہ کوئی نام لیوا نہ پانی دیوالے دے کر ایک باپ کا دم سمجھ لو وہ کہیں بیٹی کل کی مرتی آج ہی مرجائے رہیں سوتیلی اماں وہ ایک دفعہ کیا کئی دفعہ اور اپنوں میں نہیں محلے والوں تک کے آگے اور چوری چھپے نہیں ہانکے پکارے او کھلے خزانے کہتی تھی زندہ کو روٹی کیسی اللہ کرے مردے کو کفن بھی میسّر نہ ہو +

ساس جب تک زندہ رہیں بہو کے قدموں کے نیچے آنکھیں بچھاتی رہیں امیری نہیں غریبی اور غریبی کیسی کہ فقیری چھ ساڑھے چھ روپیہ کی آمدنی خرچ پورا کال پڑا ہو مگر صبح کا ناشتہ مرتے دم تک ناغہ نہ کیا! وہ جیتی ہوتیں تو حمیدہ کو یہ دن نہ دیکھنا پڑتا پیٹ بھر کر نہ ہوتی آدھا پیٹ! سالن نہ سہی روکھی۔ روکھی نہ ہوتی سوکھی! دو وقت نہیں ایک

وقت! تازی نہیں! باسی! گھر کی نہیں بازار کی! بازار کی نہیں محلہ کی! غرض پوری آدھی! ادنی پونی! اچھی بری لشٹم پشٹم کسی نہ کسی طرح پیٹ میں پڑجاتی یہ نہ ہوتا کہ صاف بتیس وقت کا کڑاکا گذر گیا اور چوتھے وقت بھی اللہ ہی اللہ ہے +

ساس کا مرنا بہو کے سر پر دنیا بھر کی تکلیفوں کا دھرنا تھا کچھ ایسی ہوا چلی اور ایسا نصیبہ پھوٹا کہ چاروں طرف سے مصیبت کا پہاڑ ٹوٹ پڑا برس کے اندر ہی اندر گھر بھر کی صفائی ہو گئی! میراں جی میں ساس بدر میں دونوں نندیں رجب میں دیور غرض تین مہینے میں چار جنازے ایک گھر سے نکل گئے! ساری کائنات دو باپ بیٹے باقی رہے۔ شبرات کا چاند ایسا بھاگوان آیا کہ اباجان بھی چل بسے ٹٹر دں لوٹں ایک میاں ہی میاں رہ گئے۔ پانچ روپیہ باپ کی پنشن کے تھے وہ بند ہوئے ایک روپیہ ماں کے دم تک تھا وہ بھی ختم ہوا۔ آٹھ آنہ چاہے کھاؤ چاہو پیو چاہے اوڑھو چاہو بچھاؤ کچھ دن یوں بھی گذرے مگر کہاں تک اور کب تک کچھ نہ ہو تو دو میاں بیوی میں سیر بھر آٹا روز تو ہو مگر ہو کہاں سے۔ بیوی معذور میاں مجبور اس پر طرہ یہ کہ ادھر آیا زچہ خانہ اُدھر آیا رمضان دونوں کے چھکے چھوٹ گئے زچہ خانہ کا تو ایک بہانہ تھا۔ دلوں میں غبار بھرے ہوئے تھے! میاں بیوی کو دیکھ دیکھ کر جلتے تھے۔ بیوی میاں کو دیکھ دیکھ کر کلستی تھیں۔ اٹھائیسواں روزہ ہوگا چار بجے کے قریب بیوی کو بخار چڑھا۔ میاں سے کہنے لگی:۔

ایک روزہ اور رہ گیا ہے اللہ یہ بھی پورا کرا دے! +

(میاں) ایک ہویا دو ہیں تو جیسا پریشان اب کے رمضان بھر رہا میرا ہی دل جانتا ہے! اماں جان کے سامنے میرے تیسوں روزے ہوتے تھے اب کے ایک پہلا اور ایک منجھلا کل دو ہوئے! کیا کھا کے رکھوں اور کیا دیکھ کے کھولوں +

(بیوی) مجھ سے پہلے رکھتے ہو تو خبر نہیں اگلے برس تو تم نے ایک بھی نہیں رکھا تم کیا اللہ بخشے خود اباجان ہی گنڈے دار رکھتے تھے گھر بھر میں ایک اماں جان البتہ روزے کی پابند تھیں باقی تو سب چھوڑ اور بڑے دن دہاڑے دھڑلے سے کھاتے تھے +

(میاں) تم ایسی بیہودہ باتیں کیوں کرتی ہو پندرہ دن کی بیاہی چالوں کی دُلہن تم کو کیا معلوم کس کو روزہ ہے کس کو نہیں یا جو دل میں آیا کہہ دیا جو منہہ میں آیا بکدیا۔ رو میں آئیں تو چھوٹے بڑے مُردے زندے سب کو اُکھاڑ پھینکا +

(بیوی) سبحان اللہ! دولہن تھی اندھی تو نہ تھی! منہہ پر گھونگھٹ تھا یا کانوں میں ٹیٹیاں! دیکھتی نہ تھی سنتی تو تھی! پکتا تھا اور میں جانتی نہ تھی کھاتے تھے اور مجھے خبر نہ ہوتی تھی +

(میاں) جب کیا میں تو اب بھی اور فقط اندھی ہی نہیں اس کے ساتھ بدتمیز بے ڈھنگی پھوڑ بدسلیقہ بلکہ اس سے بھی بدتر سمجھتا ہوں ایسی نیک قدم آئیں کہ سب ختم ہو گئے۔

(بیوی) میں منحوس تھی کہ گھر بھر کو بوس لیا! ساٹھ برس کے بڈھے پھوس میں کھا گئی! تم تو بھاگوان تھے کہ میری جوان اماں کو نوش جان کر گئے! تقدیر پھوٹنی تھی پھوٹ گئی۔ پیٹ بھرنے کو ٹکڑا نہ تن ڈھکنے کو چیتھڑا

فاقوں تک کی تو نوبت آگئی اور کیا ہو گیا +

(میاں) ہم نے تو چڑھاوے ہی کے وقت کہہ دیا تھا کہ روکھی بلکہ سوکھی روٹی ہے اماں کی قبر پر جاکر جوتیاں مارو اندھی تھوڑی تھیں! کیا دیکھ کر کیا تھا! ہاتھی جھوم رہے تھے؟

(بیوی)، کیوں مرے ہوؤں کا صبر سمیٹتے ہو! خیر اس تُو تُو میں میں سے کیا حاصل میں تو ڈیڑھ کلام جانتی ہوں ہاتھ پکڑ کر نکال باہر کرو۔ تم کو سلام تمہارے گھر کو سلام میں ایسے گھر سے باز آئی! اشراف ہونگی تو پھر نام نہ لونگی +

(میاں)، شرافت کیا ہوئی ایک آفت ہو گئی میری طرف سے تم ابھی بسم اللہ کرو تم نام نہ لوگی تو میرا بھی کوئی پیغام نہ جائیگا! بس اب منہہ سے کہا ہے تو کرکے دکھاؤ۔

(بیوی) آگ لگے ایسے بیاہ کو اور بھاڑ میں جائے ایسا سہاگ اذان کی آواز کان میں آرہی ہے روزہ نماز سب گیا گذرا ہوا +

دن بھر کا روزہ رات بھر کا فاقہ مٹکے پاس گئی تو پانی کی بوند نہیں انجورے میں لون ڈھونڈھا وہ نہ ملا کٹورے میں دودھ ہارے رکھے تھے وہ چوہا لے گیا چولہے کے پاس یہ کہتی ہوئی آئی! +

! خاک میں ملوں میں رکھتی جو راکھ سے روزہ کھولوں!

چوبیس پچیس گھنٹے کی بھوکی پیاسی بخار چڑھا ہوا آنکھوں میں حلقے زبان پر کانٹے ہاتھ میں طاقت نہ پاؤں میں سکت روزہ کھول کر نماز کو چلی! چکر آیا اور چکر کے ساتھ ہی دیوار کی ٹکر اس زور سے لگی کہ سر پکڑ کر بیٹھ گئی! رو کر کہا!

"بس میں بہت جی اب خدا مجھ کو موت دے"۔

بیوی نماز کو کھڑی ہوئیں میاں نے اپنا اسباب باندھنا شروع کیا وہ اسباب ہی کیا تھا پرانے تین جوڑوں کی ایک گٹھڑی ٹوٹا ہوا حقہ پھٹی ہوئی رضائی چوہا تکئے ایک چیتھڑا دری! بیوی کھڑی دیکھتی کی دیکھتی ہی رہی اور میاں اپنا اختر بختر لے لوا یہ جا وہ جا +

گئے اور ایسے گئے کہ بچہ تک ہو گیا اور بچے کے باپ نہ پلٹے۔

اچھے برے امیر فقیر کما ؤ نکھٹو شریف رذیل معزز ذلیل ہندو اور مسلمان بڈھے اور جوان شیخ سید مغل پٹھان پنجابی اور بنگالی سیری درستم اور دل والے کچھ دیکھے کچھ برتے مگر یہ اندھیر نہ کہیں دیکھا نہ سنا پورے دن بیوی پہلونٹی کا زچہ خانہ سر پر ساس نہ آدھی پاس تانبے کا برتن نہ گھنے کا تار ماں سوتیلی باپ بیزار اور میاں کو گھر میں قدم رکھنا حرام! کمبخت صورت شکل کا اچھا جوان تندرست پڑھا لکھا موٹا تازہ کچھ نہ ہوتا تو چپڑاسی تو ہو جاتا مگر کون ہوتا اور کیوں ہوتا! بری صحبت نے عزت اور حمیت سب غارت کروا دی! مزے سے تاش پچیسی اور چین سے سلھنی کھیتیں! دن بھر بھڑوں میں رہے رات کو جہاں جگہ ملی پڑ رہے!

تکلیف ہو خواہ آرام عمریں ختم ہو رہی ہیں اور زمانہ اڑا چلا جا رہا ہے! وہ وقت آن بھی پہنچا اور نکل بھی گیا۔ کسی کا کام اٹکا نہیں رہتا ہا خدا اس کی بیوی کا بھلا کرے ساس سے زیادہ اور ماں سے بڑھ کر خدمت کی۔ بچہ! ہوا! پلا! بڑھا! جس رات کا یہ ذکر ہے ماشاءاللہ برس سوا برس کا تھا +

برسات کے دن تو تھے ہی مینہہ کا برسنا کوئی نئی بات نہ تھی

مگر خرابی یہ ہوئی اِدھر تو پڑا مینھ اور مینھ بھی کیسا کہ موسلا دھار اور گھنٹہ نہ آدھ گھنٹہ بلکہ پورا چار پہر اوپر سے چلی ہُوا اور وہ بھی پوروا۔ ہوا کیا ایک طوفان تھا کہ مکان اور دوکان دَرے اور دالان اڑا اُڑ کر کے آرہے تھے۔ نہ اندھیاؤ کم ہوتا تھا نہ جھکڑ تھمتا تھا رات کا سناٹا! ہوا کا فرّاٹا! کڑک! چمک! مردوں تک کے کلیجے دہل رہے تھے! بارش کیا ایک آفت بلکہ قیامت تھی کہ جانوں کے لالے پڑ گئے عورتیں اور مرد بڈھے اور جوان! گھر بار کمرے دالان! کپڑے لتے اوڑھنا بچھونا! روپیہ پیسہ چاندی سونا! گھنا پاتا برتن بھانڈا پلنگ چارپائی سب چھوڑ چھاڑ انگنائی میں آبیٹھے! بھیگیں گے تو بلا سے جان تو بچیگی۔ ہر طرف آفت بپا تھی! مکان گرا! دیوار آئی! سائبان اُڑا! چھل نکلی! چھجہ پھولا! زینہ پھٹا! آدھی رات اور خلق خدا کی گریہ وزاری! مینھ کیا ایک چاندماری تھی کہ چاروں طرف سے دھواں دھوں آوازیں آرہی تھیں +

حمیدہ غریب بدقسمت بدنصیب عورت ذات نہ کوئی سنگ نہ ساتھ اس قیامت کی گھڑی کو اکیلی کھڑی گذار رہی تھی! قدرت کے کھیل تھے۔ چراغ تھا نہ تیل! اندھیرا گھپ اور اس آفت کا سامنا! بدقسمتی سے دروازہ میں کواڑ بھی ایک تھا! ہوا کا جھکڑ کواڑ کی دھڑ دھڑ ادم پر بنی ہوئی تھی ذرا کھٹکا ہوا اور جان نکلی! عالیشان محل بڑی بڑی حویلیاں پکی پکی محلسرا ہیں! کوئی گر رہا تھا کوئی جھٹک رہا تھا کوئی بیٹھ رہا تھا! حمیدہ مظلوم کا مکان تو کس گنتی میں تھا لمبی کوٹھڑی چھوٹا در اجام والی دیوار شام ہی کو بیٹھ چکے تھے پاخانہ اور پاخانے کے ساتھ ہی باورچیخانہ اب آئے!

مینھ کی جھڑی لگی ہوئی تھی اور حمیدہ کھڑی اللہ اللہ کر رہی تھی

آسمان پر نگاہ اور بچہ میں جان دروازے پر وصیان اور ورے کی طرف کان! ایک آفت ہو تو کہی جائے ہر طرف مصیبت ہی مصیبت تھی حمیدہ اکیلی کا اللہ ہی بیلی تھا چھت کہتی تھی اب گری درہ کہتا تھا اب بیٹھا! پہاڑ سی رات ایک کواڑ کا گھر جان کا خوف چور چکار کا ڈر جن بھوت کا اندیشہ! دل ہوا ہو رہا تھا! مٹی تو دو پہر ہی سے جھڑ رہی تھی اب منڈیر کی اینٹیں بھی شروع ہو گئیں! اینٹوں کا گرنا تھا کہ حمیدہ بالکل ہی بے آس ہو گئی بدحواس ہو کر بچہ کو گود میں اٹھا لیا اور انگنائی میں آن کھڑی ہوئی بچہ کا اٹھانا تھا کہ اس اللہ کے بندے نے بلکنا شروع کیا بہتیرا ہی بہلایا مگر تو یہ کس باپ کا بچہ تھا جو چمکارتی تھی اور یہ دگنا ہوتا تھا تھپکا دودھ دیا بہلایا پھسلایا ٹہلی کلیجہ سے لگایا سب ہی کچھ کیا مگر اس کی چیخ دھاڑ نہ تھمی! ہائے ماما اس برس بھر کی جان پر اپنی جوان جان قربان تھی اس بھول کے رونے میں سب بھول گئی خدا خدا کر کے صبح ہونے ادھر منہہ تھا ادھر ہوا کم ہوئی بچے نے بھی دم لیا تو ذرا جان میں جان آئی۔ ایک ٹوٹی ہوئی کھٹولی اندر سے لائی پھٹی ہوئی رضائی اس پر بچھائی اور بچے کو کلیجے سے لگا کر انگنائی میں لیٹ رہی! بچہ ابلکا ہو کر جو پڑا ادھر ہلی لوری ادھر کا کھوا دودھ منہہ میں لیتے ہی گلے میں ہاتھ ڈال کر سو رہا! اللہ اللہ! بچہ کا کلیجے سے لگ کر سونا تھا کہ وہ رات بھر کی مصیبت و پریشانی کچھ بھی یاد نہ رہی۔ میاں کی بے اعتنائی باپ کی لاپروائی اپنی تنہائی سب بھول گئی! ماما کے جوش میں زور زور سے بھینچتی تھی اور کہتی تھی:

"میں کیا کسی کی پروا کرتی ہوں اللہ میرے بچے کی عمر میں برکت دے

میرا میاں تو یہ ہے"۔

زندگی کی تمام خوشیاں اور جوانی کی بہاریں اس ننھی سی جان پر نثار تھیں! اس ہی دم کے ساتھ عمر کی تمام آرزوئیں اور ارمان لگے ہوئے تھے! لیٹ رہی تھی اور لپٹا رہی تھی چمٹ رہی تھی اور چمٹا رہی تھی۔ حمیدہ مظلوم اسی طرح قربان ہو رہی تھی کہ برابر کی مسجد سے اذان کی آواز آئی! اٹھی درود شریف کا جزدان بچے کے پاس لا کر رکھا! وضو کیا اور نماز پڑھنے کھڑی ہو گئی +

مقیاس الروح کا تعلق تصوف کے ساتھ

بمے سجادہ رنگین کن گرت پیر مغان گوید
کہ سالک بیخبر نبود ز راہ رسم منزلہا

اس شعر کے حقیقی مفہوم کی تہ کو تو وہی شخص پہنچ سکتا ہے جو یا تو خود سلوک کے کوچہ کی خاک مدتوں چھانتا پھرا ہو اور یا درسگاہ تصوف میں کسی مرشد کامل سے سبق پڑھ چکا ہو لیکن معمولی سمجھ کے دنیادار طالب علم کے سامنے دیوان حافظ کے اس مقام کی شرح مکتبوں کے ملا ذیل کی تمثیل کی مدد سے کیا کرتے ہیں +

کسی شہر میں ایک شخص اور اس کی بی بی رہتے تھے جن کی گذران نہایت عسرت اور تنگدستی کے ساتھ ہوتی تھی۔ جب نوبت فاقوں تک پہنچ گئی تو بی بی نے خاوند سے کہا کہ میاں اس شہر میں تو گذارے کی

کوئی صورت نظر نہیں آتی۔ کسی دوسرے شہر ہی میں جاکر قسمت آزمائی
کیجئے۔ چلنے کو میں بھی آپ کے ساتھ چلوں اور دل نہیں چاہتا کہ دم
بھر کو بھی آپ سے جدا ہوں۔ لیکن پھر سوچتی ہوں کہ سائیں کے سو کھیل
ہیں۔ ممکن ہے کہ باہر اس سے بھی زیادہ مصیبت کا سامنا ہو۔ اس وقت
میں آپ کے لئے وبال جان ہو جاؤنگی اور غریب الوطنی اور بھی ستم
ڈھائیگی۔ اس لئے آپ کا اکیلے جانا ہی اچھا ہے۔ میں یہ بُرے دن
جُوں توں کرکے کاٹونگی اور خدا سے دعا کرونگی کہ ہمارے دن جلد پھریں
خاوند نے جسے اپنی بی بی سے بہت محبت تھی ایک آہ سرد بھری اور کہا کہ
اگر ہماری قسمت میں افلاس اور تہیدستی ہی لکھی ہے تو سفر اختیار کرنے
سے حالت کچھ بدل تھوڑی ہی جائیگی۔ اس میں شک نہیں کہ یہاں عسرت
اور ناداری کا سامنا ہے۔ مگر پھر بھی یہ تسکین کیا کم ہے کہ تم ہر وقت میری
آنکھوں کے سامنے ہو۔ دن پھرنے ہونگے تو یہیں پھر جائینگے۔ اس کے
جواب میں بی بی نے کہا کہ وطن میں انسان کی قدر نہیں ہوتی۔ گھر سے باہر نکلیئے گا
تو ممکن ہے کہ ہمارا سویا ہوا نصیب جاگے میری رائے میں آپ خدا کا
نام لے کر سدھارئیے اور مجھے میرے حال پر چھوڑتے جائیے۔ محنت مزدوری
کرکے۔ چکی پیس کر۔ چرخا کات کر۔ جس طرح بن پڑیگا آپ کی واپسی تک
پیٹ پالونگی اور آپکے بخیر و خوبی پلٹنے کی امید کو اپنے گھر کا چراغ بناؤنگی
خاوند اپنی چہیتی اور دانشمند بی بی کی ان باتوں سے بے اختیار متاثر ہوا
اور دل میں یہ سوچ کر نکل کھڑا ہوا۔ کہ جو کچھ یہ کہتی ہے سب سچ ہے۔ وطن
میں درحقیقت کسی کی قدر نہیں ہوتی۔ جب تک موتی سمندر کی تہ میں یا لعل
سنگ پارے کے خول کے اندر چھپا رہتا ہے اس کو کوئی جانتا بھی نہیں لیکن

بازار میں آتے ہی ہزاروں لاکھوں کی قیمت پاتا ہے۔ میں بھی گھر سے نکلکر نصیب کا پانسہ تو پھینک دیکھوں۔ اگر ٹھیک پڑا تو پو بارہ ہیں ورنہ یہی سمجھ کر دل خوش کر لونگا کہ

مارا دیار غیر میں مجھ کو وطن سے دور
رکھ لی مرے خدا نے میری بیکسی کی شرم

* * * * *

* * * *

دس سال کی مدت گذر گئی۔ خاوند ابھی تک وطن کو نہیں پلٹا اور اس عرصہ میں اس کی کوئی خبر نہیں آئی۔ بی بی ابھی تک اسی شہر میں مقیم ہے لیکن محلہ بدل لیا ہے۔ ایک ٹوٹی سی جھونپڑی میں تن تنہا رہتی ہے۔ اگر وہاں اس کا کوئی مونس اور جلیس ہے تو حسرت اور عسرت۔ اس کی فلاکت اور افلاس کی یہ حالت ہے کہ تن ڈھکنے کو اچھی طرح سے کپڑا بھی نہیں۔ بھوک کے روح شکن عذاب اور ہجر کے جانفرسا آلام نے اس عارض جمال افروز کی رنگینی کو جس پر اس کا خاوند نثار ہوا کرتا تھا زردی سے بدل دیا ہے۔ اس پر قحط نے جراحت پر نمک کا کام دیا۔ گیہوں روپیہ کے دو دو سیر بکنے لگے ہیں۔ اور غریب لوگ جو کی روٹی کو بھی ترس گئے ہیں۔ اس دس سال کے زمانہ میں اس نیک اور پارسا بی بی نے خاوند کی یاد کو اپنی عفت کا سہارا بنائے رکھا تھا اور محلہ کی ایک بدچلن عورت نے نیکی کی صراط مستقیم سے اس کو بھٹکانے کی جتنی کوشش کی تھیں وہ اب تک سب رائگاں ثابت ہوئی تھیں۔ لیکن قحط کی سختی روز بروز بڑھتی چلی جا رہی ہے اور نوبت اب یہاں تک پہنچی ہے کہ اسے آج تیسرے

دِن کا فاقہ ہے۔ ایسے عالم میں شیطان محلّہ کی اسی بد چلن عورت کی صورت میں ظاہر ہو کر اس کو ترغیب دیتا ہے کہ گناہ کر کے اپنی جان کو اس فاقہ کشی کی عذاب دہ موت سے بچائے اور وہ نصیبوں جلی مجبوراً اس پر راضی ہو جاتی ہے +

الحذر اُس فقر و ناداری سے سو بار الحذر
جس سے عزّت کو ہے خوف اور جس سے عصمت کو ہے ڈر

* * * * *

* * * * * *

شہر میں ایک وجیہ و شکیل اجنبی وارد ہوتا ہے۔ جس خدم و حشم کے ساتھ وہ آیا ہے۔ اس سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس شخص کے پاس دولت شمار سے زیادہ ہے۔ شہر میں داخل ہوتے ہی اُس نے سیدھا ایک خاص محلّہ کا رُخ کیا اور ایک خاص مکان پر پہنچ کر دستک دی اس کے چہرے پر اضطراب آمیز اُمیدؔ کی ایک کیفیت ہویدا ہے۔ جس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کو یہ توقع ہے کہ جو شخص اندر سے نکلیگا وہ اس کی جان پہچان کا ہوگا۔ لیکن دستک کو سن کر جب ایک پیر شصت سالہ دروازہ سے باہر سر نکالتا ہے تو اجنبی غش کھا کر گر پڑتا ہے۔ ہوش میں آنے پر بڈھے سے یہ اجنبی کچھ پوچھتا ہے اور جب جواب شافی نہیں پاتا تو بیقراری کے عالم میں روتا ہوا چلا جاتا ہے +

از درد دوست چہ گویم بہ چہ عنوان رفتم
ہمہ شوق آمدہ بودم ہمہ حرماں رفتم

* * * * * *

* * * * *

شہر میں ایک شاہ صاحب چند سال سے مقیم ہیں۔ لوگ کہتے ہیں کہ یہ بڑے خدا رسیدہ ہیں۔ ان کی برگزیدگی اور تقدس کا حال سُن کر اُن کے مرید ہوتے ہیں اور اُنکی ارادت کا حلقہ روز بروز وسیع ہو جاتا ہے۔ تازہ وارد اجنبی بھی حصولِ فیضان کی غرض سے اُن کی خدمت میں حاضر ہوتا ہے اور چند دن گذرنے پر جب دیکھتا ہے کہ شاہ صاحب حقیقت میں مرجع خلائق ہیں اور خاص و عام ان کو قدوۃ العارفین اور زبدۃ السالکین سمجھتے ہیں تو اُن کے ہاتھ پر بیعت کرنا چاہتا ہے۔ شاہ صاحب اس سے کہتے ہیں کہ میں تم کو اُس وقت تک مرید نہیں کر سکتا جب تک کہ تم دار القمامہ میں کسی خانگی کے ہاں نہ ہو آؤ۔ اجنبی نہائیت متقی و پرہیزگار اور پابندِ صوم و صلوٰۃ ہے۔ شاہ صاحب کی یہ خرافات سنکر برہم ہو کر اُٹھ جاتا ہے اور ایک دو دن تک نہیں آتا۔ لیکن جب پھر شاہ صاحب کے کشف و کرامت اور عارف باللہ ہونے کی تصدیق اُس کے بعض ولی دوست جو اس عرصہ میں اُس نے پیدا کر لئے تھے کرتے ہیں تو وہ پھر اُن کی خدمت میں حاضر ہوتا ہے لیکن وہاں سے مکرر اس کو یہی ایما ہوتا ہے کہ جو تم سے کہا گیا تھا جب تک اس پر عمل نہ کرو گے ہمارے مریدوں کے زُمرہ میں داخل نہ ہونے پاؤ گے اجنبی کی عقیدت مزید تامل کو جائز نہیں رکھتی اور وہ یہ خیال کر کے کہ جو گناہ ہوگا شاہ صاحب کی گردن پر ہوگا سیدھا چکلہ کو چلا جاتا ہے۔

اسد بسمل ہے کس انداز کا قاتل سے کہتا ہے کہ مشق نازکر خونِ دو عالم میری گردن پر

* * * * * *

* * * * *

شہر کے ایک بدنام حصہ میں خانگیوں کا اڈا ہے۔ رات کے آٹھ بجے ہیں کہ ایک مکان میں جو اس قبیح پیشہ کی ایک دلالہ کے ملک سے ہے ایک تازہ وارد اجنبی داخل ہوتا ہے۔ اندر پہنچ کر دیکھتا ہے کہ ایک کمرہ بہ تکلف طور پر سجا ہوا ہے اور اس میں ایک چھپر کھٹ کے اندر ایک نازنین عورت بیٹھی ہوئی ہے۔ لیکن اس کی نازنینی کا معیار اسوقت محض اس کا لباس فاخرہ اور اس کا تناسب جسم ہے کیونکہ چہرے کو وہ دونوں ہاتھوں سے چھپائے ہوئے ہے اجنبی چھپر کھٹ کے پاس آتا ہے اور ایک عزت باختہ کی طرف سے حیا و غیرت کی اس ادا کے اظہار پر متعجب ہوکر خوش طبعی کی راہ سے کہتا ہے +

اے نازنین زچہرہ برافگن نقاب را
بنمائے از دریچہ صبح آفتاب را

عورت یہ سنکر رونے لگتی ہے اور اس قدر روتی ہے کہ ہچکیوں کا تار بندھ جاتا ہے۔ اجنبی کو عورت کے اس اظہار درد کرب اور گریہ و بکا پر اور بھی زیادہ تعجب ہوتا ہے۔ لیکن چونکہ رحمدل اور خدا پرست ہے اس لئے اپنی نفسانی خواہشوں سے اعراض کرکے از راہ ہمدردی اس سے پوچھتا ہے کہ اے نیکبخت تو کیوں روتی ہے معلوم ہوتا ہے کہ تیرا دل چوٹ کھائے ہوئے ہے۔ اپنا حال مجھ کو بتا یا۔ اگر میں کسی طرح تیرے کام آسکتا ہوں تو دریغ نہ کروں گا۔ عورت منہہ سے ہاتھ ہٹائے بغیر چند ٹوٹے فقروں میں اپنے ٹوٹے دل کی کیفیت بیان کرکے کہتی ہے کہ میں حقیقت

میں وہ نہیں ہوں جو تم کو نظر آ رہی ہوں۔ مجھ کو تم کسبی خانگی سمجھتے ہو گے خدا گواہ ہے کہ اِس وقت سے پہلے میں پارسا اور عفیفہ تھی۔ دس سال ہوتے ہیں کہ میرا خاوند بہ تلاش روزگار وطن چھوڑ کر چلا گیا ہے اِس عرصہ میں میں نے اُس کی کوئی خبر نہیں پائی۔ معلوم نہیں وہ زندہ بھی ہے یا نہیں میں ساری عمر اس کے انتظار میں گذار دیتی اور اسی پر جوگ سادھے بیٹھی رہتی۔ لیکن بھوک کے عذاب نے مجھ کو یہ بُری گھڑی دکھائی اور ایک کٹنی کے کہنے پر میں یہاں چلی آئی۔ اُسوقت گناہ ایسا ڈراونا معلوم نہ ہوتا تھا۔ لیکن اب جبکہ وہ میرے سامنے مجسم بنکے کھڑا ہوا ہے میں اُس کی تاب نہیں لا سکتی۔ اے اجنبی اگر تیرے دل میں ذرہ بھر بھی درد موجود ہے اور تو خدائے پاک کا کچھ بھی خوف رکھتا ہے تو مجھ کو چھوڑ دے۔ مگر ہائے پھر میں کیا کروں گی۔ بہتر یہ ہوگا کہ تو خنجر سے میرا کام تمام کر ڈال تاکہ میں اس دُنیا کی ذلتوں سے نجات پاؤں اور دوسری دنیا میں اپنے خاوند سے جا ملوں +

اجنبی اِن باتوں کو ایک عالمِ محویت میں سُنتا ہے اور حیرت۔ مسرت اور درد کا ایک طوفاں اُس کے دل میں بپا ہو جاتا ہے۔ جب عورت اپنی دردانگیز داستان ختم کر چکتی ہے تو وہ دفعتہً اُس کے دونوں ہاتھ زبردستی اُسکے مُنہہ سے ہٹا دیتا ہے اور جو صورت اس کو نظر آتی ہے اُسے دیکھ کر بے اختیار ایک چیخ مار کر چھپر کھٹ پر گِر پڑتا ہے۔

بنایا درد نے عبرت کو کیوں آئینہ دارِ دل
گئے ہوش و خرد جاتا رہا صبر و قرار دل

* * * * * * *

* * * * * *

دوسرے دن صبح کے وقت شاہ صاحب اپنے مریدان باصفا کے حلقہ میں بیٹھے ہوئے تھے کہ اجنبی آیا اور آتے کے ساتھ ہی اُن کے قدموں پر گر پڑا۔ شاہ صاحب نے فوراً اُٹھا کر گلے لگا لیا اور کہنے لگے۔ کیوں بابا اب تو ہمارا کہنا بلا حیلہ وحجت مانا کرو گے۔ اجنبی نے جواب دیا کہ رُوحی فداک میں آپ کی کرامت کا قائل ہو گیا۔ کل رات گم گشتہ بی بی کو ملا کر آپ نے دنیا دیدی۔ اب دین عطا فرمائیے۔ میں بیوقوف تھا جو آپ پر پہلی مرتبہ شک لایا۔ اب مجھ کو معلوم ہوا کہ

بہ مے سجادہ رنگین کن گرت پیر مغان گوید
کہ سالک بے خبر نبود ز راہ و رسم منزلہا

اس شعر کی یہ شرح تو پرانے زمانہ کے دقیانوسی ملا کرتے ہیں۔ جو فلسفہ قدیم کی دو چار کتابیں پڑھ کر بزعمِ خود اپنے آپ کو کبھی مشائی سمجھتے ہیں اور کبھی اشراقی۔ اور جب فلسفہ سے کام نہیں چلتا تو تصوف اور عرفان اور سلوک کا راگ گانے لگ جاتے ہیں۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ ان لوگوں میں اس شعر کے معنے سمجھنے سمجھانے کی ہرگز قابلیت نہیں۔ اس شعر کی تہ کو پہنچنے کے لئے رُوح کی ماہیت سے ایک حد تک واقف ہونا چاہیئے۔ اور اُس آلہ کے استعمال میں پوری دستگاہ رکھنی چاہیئے جسے مدبرانِ یورپ نے حال میں ایجاد کیا ہے اور جس کا ذکر شرح وبسط کے ساتھ ہم ایک سابق کے مضمون میں کر چکے ہیں۔ جو ۹۔ اکتوبر ۱۹۰۳ء کے اخبار وطن میں مقیاس الروح کے عنوان سے چھپا تھا۔

حقیقت میں یہ آلہ ایک نہایت عجیب وغریب شے ہے۔ اس کی

ندرت کی داد ناظرین نے اس مضمون میں ضرور دی ہوگی جس کا حوالہ ہم نے اوپر دیا ہے۔ لیکن ناظرین کو ہمارے دعوے سے نہایت تعجب ہوگا کہ شعرائے متصوفین کے کلام کی باریکیوں کے سمجھنے اور اس کی معنوی خوبیوں اور لطافتوں کا اندازہ کرنے میں بھی یہ آلہ کام دیجا یا کرتا ہے۔ ہم ناظرین کو زیادہ دیر تک محو حیرت نہیں رکھنا چاہتے اور اس آلہ کی مدد سے حافظ علیہ الرحمتہ کے اس شعر کا حل درج کرتے ہیں جو مضمون کاطراز عنوان ہے +

کچھ مدت گذری کہ ایک ہستیٔ ذی روح نے جو فوجِ ظفر موج برطانیہ مقیم کشورِ ہند کی ایک رکن تھی اور جس کا نام ایمرسن تھا (وہ ایمرسن نہیں جس نے مکافات کے عنوان سے ایک مشہور مضمون لکھا ہے) صوبۂ مدراس میں اپنی روحانیت کا وہ ثبوت دیا جس کو ہندوستان کی غیر ذی روح ہستیاں ناممکن التردید سمجھنے کی عادی ہوگئی ہیں۔ بہ اقتضائے اُس طبعی تجاذب کے جو کشش ثقل کی طرح ایک ذی روح ہستی کے بوٹ کی ٹھوکر اور ایک غیر ذی روح ہستی کے تلی کی نوک یا ایک ذی روح انفیلڈ بندوق اور غیر ذی روح کالے گوشت پوست کے درمیان قایم ہے پرائیوٹ ایمرسن نے ایک کالی ہستی کو عدم کی طرف روانہ کردیا۔ لیکن چونکہ

کشتگانِ خنجرِ تسلیم را
ہر زمان از غیب جانے دیگر است

لہذا یہ نقطہ سویدا صفحہ ہستی پر حرفِ صحیح کی طرح ثبت رہا۔ اس کے کچھ دنوں بعد ایمرسن صاحب جو یوجوہ چند فوج سے علیحدہ ہوگئے تھے۔ ہندوستان کی کالی سرزمین کو اپنی صباحت کے فیضان کا اہل نہ سمجھ کر

بمقتضائے کُلُّ شَیءٍ یَرجِعُ اِلیٰ اَصْلِہٖ انگلستان چلے گئے۔ ادھر ہستی غیر ذی رُوح نے جو سرحد عدم تک پہنچ چکی تھی اور بوجہ تغییر حوالی اپنی فطرت دنیوی کو جس میں وفا و تسلیم کا عنصر غالب تھا بدل آئی تھی۔ چلّانا شروع کیا کہ میرے ساتھ انصاف کیا جائے اور جس قدر خون میرے جسم سے نکلا ہے۔ اس کا بدلا لیا جائے۔ اگرچہ یہ شور و غل قابل التفات نہ تھا کیونکہ اول تو ایک ہستی غیر ذی روح کا خُون ہی کیا اور پھر اس خون کا بدلہ لئے جانے کے کیا معنے۔ لیکن جب ہستی غیر ذی رُوح کے نالوں کی گونج عدم کے گنبد تک پہنچ گئی۔ اور یہ خوف ہونے لگا کہ اس گنبد میں جو ذی روح ہستیاں محوِ استراحت ہیں ان میں سے کوئی کچّی نیند سے اُٹھ کر "توس مکھن توس مکھن" کہتی ہوئی عالمِ ہستی کی طرف نہ دوڑ پڑے تو ایک بڑے جتا دری لاٹ پادری کی رُوح نے جس کو روحوں کی اصطلاغ و تطہیر اور ہدائت و تلقین کے مشاغل کی وجہ سے عدم میں بھی چین سے لیٹنے کی فرصت نہ تھی۔ مدراس گورنمنٹ کے گوشِ نصیحت نیوش تک یہ پیغام پہنچا دیا کہ جو کالی ہستی شور و غوغا مچارہی ہے اُس کو دم دلاسا دینے کا انتظام کیا جائے۔ لیکن طرزِ عمل وہی ملحوظ رہے جو شیکسپیئر کی چڑیلوں نے میکبتھ کے متعلق اختیار کیا تھا۔ اس گفت و شنید کا نتیجہ یہ ہوا کہ مدراس گورنمنٹ کے ایما پر ایمرسن صاحب جو انگلستان میں براج رہے تھے۔ یہاں پکڑوا بلوائے گئے جب خفیہ پولیس کے کارپردازوں نے ان سے کہا کہ حضرت آپکی انفیلڈ پر یہ الزام ہے کہ اس نے ایک ہستی غیر ذی روح کی ران کی جرمیّت میں بقدر ڈیڑھ اُونس سیسہ کے اضافہ کر دیا اس لئے آپکو ہندوستان لیجانے کے متعلق گورنمنٹ کا ایما ہوا ہے تاکہ وہاں آپ پر مقدمہ چلایا جائے۔

تو اُن کو نہائت حیرت ہوئی اور ساتھ ہی اس کے نفرت اور اکراہ سے بھی
انہوں نے سالک یعنے گورنمنٹ کے اس ارشاد کو سُنا۔ حیرت تو اس بات
پر کہ ایک غیر ذی رُوح ہستی کو گولی مار دینا بھی کوئی ایسا فعل ہے جس
کو لفظِ الزام کے ساتھ ایک ہی وقت میں زبان سے ادا کیا جا سکتا ہے
اور اکراہ و تنفر اس بات پر کہ گورنمنٹ جو بمنزلۂ مُرشد اور سالک کی
ہے وہ ایسا قابلِ نفرین حکم دے کہ "تم مدراس کو چلا جائیگا۔ وہاں تم پر
مقدمہ چلایا جانا مانگتا ہے"۔ حضرت ایمرسن کا روحانی تحیر اور استعجاب
حقیقت میں کچھ بیجا نہ تھا کیونکہ ہندوستان کی عدالتوں کی تاریخ اس
امر کی شاہد ہے کہ آج تک کسی ہستی غیر ذی روح کی تلی کے استغاثہ پر کسی
ہستی ذی رُوح کے بُوٹ کو دار پر کم کھینچا گیا ہے۔ اور کسی گوری ہستی
کو اس وجہ سے کوئی سنگین سزا نہیں دیگئی کہ اُس نے کسی کالی ہستی
کو چاند ماری کا تختۂ مشق بنایا۔ پھر ایمرسن بیچارے ہی نے کونسا ایسا
قصور کیا تھا کہ اس کو کشاں کشاں انگلستان سے مدراس منگوایا جائے +

مگر ایمرسن نے اس کے ساتھ ہی یہ بھی خیال کیا کہ ایسی حالت میں جبکہ
فریق مخالف ایک ہستی غیر ذی روح ہے جسے فریق کہنا بھی باعثِ ننگ
وعار ہے اور اس کے مقابلہ میں گورنمنٹ عالیہ ہماری مُرشد اور پیر
طریقت ہے لہذا اس میں بھی ضرور کوئی مصلحت ہوگی - مدراس چلنا چاہئے
چنانچہ یہ سوچ کر وہ بخوشی مدراس آنے پر آمادہ ہوگیا۔ اور یہاں پہنچا۔
مدراس میں مقدمہ کی تحقیقات ہوئی اور کئی دن تک مقدمہ ہائیکورٹ
میں چلتا رہا +

پھر کھلا ہے درِ عدالت روح　　　　گرم بازار فوجداری ہے

ٹھوکروں سے جہان ہے پامال
بوٹ کی پھر سرشتہ داری ہے

پھر دیا کالی ہستیوں نے سوال
ایک فریاد و آہ و زاری ہے

پھر ہوا ہے طلب گواہِ محال
جان نثاری کا حکم جاری ہے

گوروں کالوں کا جو مقدمہ تھا
آج پھر اُس کی روبکاری ہے

الہ آباد کا ذی روح اخبار رقمطراز ہے کہ ۹۔ اکتوبر کو عدالتِ مفتوحہ میں ذی روح جج صاحب نے بالاتفاق اُس جماعتِ ذی رُوح کے جسکا نام جیوری ہوتا ہے یہ فیصلہ سنایا کہ تم پر جو الزام لگایا جاتا ہے تم عزّت کے ساتھ اُس سے بری کئے جاتے ہو اور تم اس عدالت سے اپنے چال چلن کے دامن پر کوئی دھبہ چھوڑے بغیر جا سکتے ہو۔ تمہارے انگلستان پہنچائے جانے کا انتظام کر دیا جائیگا۔ اس پر جیوری نے ہز لارڈشپ سے یہ سفارش کی کہ ایمرسن کو بلحاظ ان سختیوں کے جو اُسے جھیلنا پڑی ہیں کچھ معاوضہ دلائے جانے کی حکامِ متعلقہ سے تحریک کیجائے۔ اور ہز لارڈشپ نے اس تحریک پر لحاظ مناسب کئے جانے کا وعدہ بھی فرمایا۔ اخبار مذکور کے دیکھنے سے یہ بھی معلوم ہُوا کہ ذی رُوح ہستیوں نے اپنے بھائی ایمرسن کے لیے چندہ بھی کھولا +

اب ایمرسن کو معلوم ہوا کہ ہندوستان میں بلائے جانے اور اس مقدمہ کے چلائے جانے کی علّت غائی کیا تھی حضرت کو اب مرشد کامل کی مصلحت معلوم ہوئی اور اُنہوں نے سمجھا کہ اگر میں انگلستان کی وسیع سرزمین میں جو روحوں سے بھری پڑی ہے اور جہاں ایک کو دوسرے پر سختی کرنے کا کوئی حق حاصل نہیں بھٹکتا پھرتا تو سوائے اس کے کہ میرے ہاتھ میں کاسۂ گدائی ہوتا اور میں توس شبینہ اور آلوئے چاشت کو محتاج

ٹھوکروں سے جہان ہے پامال | بوٹ کی پھر سرِشتہ داری ہے
پھر دیا کالی ہستیوں نے سوال | ایک فریاد و آہ و زاری ہے
پھر ہوا ہے طلب گواہِ محال | جان نثاری کا حکم جاری ہے
گوروں کالوں کا جو مقدمہ تھا | آج پھر اُس کی روبکاری ہے

الہ آباد کا ذی روح اخبار رقمطراز ہے کہ ۹۔ اکتوبر کو عدالتِ مفتوحہ میں ذی روح جج صاحب نے بالاتفاق اُس جماعتِ ذی رُوح کے جسکا نام جیوری ہوتا ہے یہ فیصلہ سنایا کہ تم پر جو الزام لگایا جاتا ہے تم عزت کے ساتھ اُس سے بری کئے جاتے ہو اور تم اس عدالت سے اپنے چال چلن کے دامن پر کوئی دھبہ چھوڑے بغیر جاسکتے ہو۔ تمہارے انگلستان پہنچائے جانے کا انتظام کردیا جائیگا۔ اس پر جیوری نے ہزلارڈشپ سے یہ سفارش کی کہ ایمرسن کو بلحاظ ان سختیوں کے جو اُسے جھیلنا پڑی ہیں کچھ معاوضہ دلائے جانے کی حکامِ متعلقہ سے تحریک کیجائے۔ اور ہزلارڈشپ نے اس تحریک پر لحاظ مناسب کئے جانے کا وعدہ بھی فرمایا۔ اخبار مذکور کے دیکھنے سے یہ بھی معلوم ہوا کہ ذی رُوح ہستیوں نے اپنے بھائی ایمرسن کے لیے چندہ بھی کھولا +

اب ایمرسن کو معلوم ہوا کہ ہندوستان میں بلائے جانے اور اس مقدمہ کے چلائے جانے کی علت غائی کیا تھی حضرت کو اب مرشد کامل کی مصلحت معلوم ہوئی اور انہوں نے سمجھا کہ اگر میں انگلستان کی صبیح سرزمین میں جو روحوں سے بھری پڑی ہے اور جہاں ایک کو دوسرے پر سختی کرنے کا کوئی حق حاصل نہیں بھٹکتا پھرتا تو سوائے اس کے کہ میرے ہاتھ میں کاسہ گدائی ہوتا اور میں توبن شبینہ اور آلوئے چاشت کو محتاج

ہوتا اور کوئی چارہ نہ تھا۔ مرشدِ کامل اور سالکِ ہمہ بین کا مقصد میرے یہاں بھیجنے سے یہ تھا کہ جو الزام ایک غیر ذی روح ہستی کی خیرہ چشمی اور ڈھٹائی کی وجہ سے مجھ پر لگایا گیا تھا اس کا دھبہ بالکل مٹ جائے اور اس کے ساتھ ہی وہ ذی رُوح ہستیاں جو ہندوستان میں موجود ہیں بہ تقاضائے حبِ قومی میرے۔ لئے زادِ راہ اور انگلستان میں چندے ڈٹ ڈٹ کر چین کرنے کے لئے سرمایہ کے طور پر چند قراضہ ہائے سیم بھی جمع کردیں نیز ایک بڑی مصلحت اس میں یہ بھی تھی کہ ذی روح انفیلڈ آئندہ سے غیر ذی روح کالے وپوست کو چاند ماری بنانے اور ذی روح بوٹ غیر ذی روح تلیوں کے پھاڑنے کا ڈپلوما قانونی طور سے حاصل کرلیں۔ یہ سوچ کر میاں ایمرسن نے دل میں اپنے مرشد ذی روح کا شکریہ ادا کیا اور اس قول کی انکو پوری طرح سے تصدیق ہوگئی کہ

بہ مے سجادہ رنگیں کن گرت پیرِ مغاں گوید
کہ سالک بیخبر نبود زراہ و رسم منزلہا

دنیا کی دلچسپیاں

دنیا بھی اک بہشت ہے اللہ رے کرم
کن نعمتوں کو حکم دیا ہے جواز کا (ذوق)

آدمی بسا اوقات تکالیف کے صدموں سے گھبرا کر یا محنت کی سختیوں سے اُکتا کر کہہ اٹھتا ہے۔ دنیا میں کیا آئے ایک آفت میں پھنس گئے“ ”یا دنیا ہے کہ

ایک سلسلۂ مصیبت"۔ کوئی اِسے دوزخ سے تشبیہ دیتا ہے۔ کوئی دار المحن کے نام سے یاد کرتا ہے۔ گو عملاً سب اِس کی محبت میں مبتلا ہیں۔ اور سوائے چند خدارسیدوں کے یہاں سے کوچ کرنے کو کوئی بھی پسند نہیں کرتا۔ تاہم ایک زمانہ ہے کہ اِسے بُرا کہنے پر تلا ہُوا ہے۔ ایسی حالت میں اُس حق پسند کی نظرِ غائر کی داد دینی پڑتی ہے۔ جس نے دنیا کی اُلجھنوں سے قطع نظر کرکے اس کی بیشمار دلچسپیوں کا دھیان کیا ہے اور شکر گذاری کا ثبوت دیا ہے اور غفلت کیش انسان کو یاد دلایا ہے۔ کہ اسے خالق نے کیسی کیسی نعمتیں بخشی ہیں۔ جن سے وہ ہر دم ہر لحظہ فائدہ اُٹھاتا ہے اور اس پر احسان مندی کا یہ حال ہے کہ ذراسی تکلیف پہنچے تو اُسے دِنوں۔ مہینوں بلکہ برسوں یاد رکھے اور ہر ایک سے اس کی شکایت کرتا پھرے اور جو لطف ہر گھڑی نصیب ہوتا ہے اُسے بھول جائے۔ اور اس کا شکر زبان پر لانا تو درکنار دل میں بھی کم آنے دے۔ جو قیود مذاہب نے بعض چیزوں کے متعلق لگادی ہیں۔ اُن سے تو گھبرائے لیکن اُن کے مقابل جو جو چیزیں جائز کر دی ہیں اور جن کی اجازت ہے کہ کھُلے بندوں اور دل کھول کر ان سے حظ اُٹھاؤ۔ اُن کا ذکر نہ کرے۔ بِنِعْمَةِ رَبِّكَ فَحَدِّثْ[1] کا مفہوم اگر ذہن میں رہے تو ایسی غفلت ممکن نہیں۔ مگر نسیان تو اِس کی گھٹی میں پڑا ہے۔ مبارک ہیں وہ لوگ جو احسانات الٰہی کو نہیں بھولتے۔ اور اُن کے سامنے دنیا کی معمولی کلفتوں اور رنج کی کچھ حقیقت نہیں سمجھتے +

ذرا آنکھ کھول کر دیکھو۔ کیا بہار ہے بادِ نسیم کے ہلکے جھونکے۔ بادِ صبا کی اٹکھیلیاں۔ چلتے ہوئے پانی۔ بہتی ہوئی ندیاں۔ شفاف جھیلیں۔ ذخار سمند

[1] قرآن مجید میں ہے۔" اپنے خدا کی نعمتوں کا ذکر کر ۱۲

آسمان سے باتیں کرتے ہوئے پہاڑ اور اُن کی برف سے ڈھپنی ہوئی چوٹیاں
پھولوں کے تختے اور پھلوں سے لدی ہوئی ڈالیاں۔ درخت اور اُن ہرے
ہرے پتے۔ سبزہ اور اس کا فرشِ زمرّدیں۔ پکتے ہوئے کھیت اور اُن
میں قوتِ زندگی سے بھرے ہوئے سنہری خوشے۔ نگاہ کے لئے جنت
نہیں تو کیا ہے؟ بلبل اور اس کی خوش نوائی۔ فاختہ اور اس کی کوکو
کوئل اور اس کی کوک۔ پپیہا اور "پی کہاں"۔ یہ نغمہ نہیں تو کیا ہے؟
اسی کو تو فردوسِ گوش کہتے ہیں۔ قدرت کا یہ ساز ہر وقت تمہارے خوش
کرنے کو تیار ہے۔ اس کا سازندہ نہ کبھی تھکتا ہے۔ نہ اُس کی آواز میں
ضعف آتا ہے یہ وہ ساز ہے جس کے لئے بگڑنا نہیں بنا۔ اور قدرت
کا حسن کچھ مناظرِ کوہ و دشت اور باغ و راغ پر ہی ختم نہیں ہو گیا۔ نہ اُس
کی آواز پرندوں کی خوش الحانی تک محدود ہے آنکھ بینا ہو تو ہر جگہ حسن کا
جلوہ ہے۔ غزال کی آنکھ اور مور کے پر اور شیر کی کھال تو خوبصورت مشہور
ہی ہیں۔ مگر جن جانوروں کو حسن سے بظاہر کچھ خاص مناسبت نہیں۔
ان کو اگر باریک بین نگاہوں سے دیکھو تو ایک ایک جامع اوصاف ہے
شکل پر کیا موقوف ہے۔ جوہر اچھے ہوں تو کیا دل نہیں لے لیتے؟ شتر سوار
سے پوچھو جس کی سانڈنی لق و دق اور بے آب و گیاہ میدان کے کالے
کوسوں کی منزل طے کر کے آئی ہے۔ کہ اترتے ہی اس کے گلے سے لپٹا
جاتا ہے۔ اپنی آسائش کی فکر پیچھے کریگا۔ پہلے اپنی وفادار سواری کے
آب و دانے کا بندوبست کر لے۔ تیز گام تازی اپنے یکہ تاز سے وہ پیار لیتا
ہے کہ کسی معشوق کو کم نصیب ہو جس جرمان نصیب بڑھیا کے لڑکے لڑ کیاں
اُسے چھوڑ کر چل دئے ہوں اور جسے تنہائی کی مونس ایک بلی نصیب ہوئی ہو

اُس سے اُس بلّی کے حسن دلفریب کی تعریف سُنو۔ اور جن ملکوں میں کتّوں کو پالنے کی رسم عام ہے اور نہ رہا کوئی نفرت اُن سے موجود نہیں۔ وہاں ذرا کتّوں کی قدر دانی ملاحظہ کرو۔ اچھی اچھی حسن کی پتلیاں اُن پر قربان ہوئی جاتی ہیں اور کہتی ہیں۔ "او حسن کی کان" ! "او ملاحت کی جان" ! اُس بڑھیا کے کان بلّی کی "میاؤں" ہی میں موسیقی کے سارے سر تال موجود پاتے ہیں۔ اور کتّے کی وفا کی فدائی جوان عورت کے نزدیک اُس کی آواز چنگ و دف کی صدا ہے۔ اور دنیا بھر کی مختلف اصوات کے ملنے سے جو آواز پیدا ہوتی ہے جس کا نام عوام کی اصطلاح میں "شور ہے"۔ اُسے درد آشنا اہلِ دل مختلف سروں کا ارگن سمجھتے ہیں۔ اُن کے خیال میں کوئی سر غلط نہیں اور کوئی صورت قبیح نہیں +

گرمی کے دن اور اُن میں ٹھنڈا پانی سردی کے دن اور اُن میں سورج اور دھوپ۔ برسات کا موسم اور اس میں ابر و گھٹائیں۔ بہار کا فصل اور اُس کا جوبن رسے نعمتیں ہیں۔ جن میں انسان کا حصّہ ہے۔ قدرت نے اس کی حفاظت کا ہر موسم اور ہر آب و ہوا کے مطابق کچھ نہ کچھ بندوبست کیا ہے۔ اور اس پر قادرِ مطلق کا یہ احسان مزید ہے کہ اس کو ایک چیز ایسی دیدی ہے جس کے زور پر یہ نہ صرف اپنی حفاظت کا بلکہ اپنے آرام اور آسائش کا پورا پورا سامان کر سکتا ہے۔ اور وہ چیز عقل ہے۔ عقل انسانی نے صفحہ قدرت کے متن پر خوب خوب حاشئے چڑھائے ہیں۔ اور اُن میں عجب عجب گلکاریاں کی ہیں۔ خسخانہ و برفاب راحت گرما ہیں تو قہوہ خانہ و گرمابہ فرحت سرما۔ باریک ریشمی ململ اور جالیاں گرمی کے لئے اور سمور اور پشمینہ سردی کے لئے پہننے کا سامان ہیں۔ جاڑوں کی راتوں کے لئے لحاف اور گرمیوں کی تپش کیلئے

پنکھے۔ یہ سب دولتمندوں کے لئے ہے۔ مگر غریب بھی خدا کے فضل سے
محروم نہیں۔ لاکھ دولتوں کی ایک دولت قناعت ہے۔ جس کو نصیب ہو۔
اور غریبوں میں امیروں کی نسبت اِس کا وجُود زیادہ ثابت ہے۔ امیر کو جُوں
جوں آرام کے اسباب ملتے جاتے ہیں۔ کہے جاتا ہے "اور"۔ غریب کو جو مل
گیا۔ اُسی کو صبر شکر سے لے کر بال بچوں میں خوش ہو بیٹھتا ہے۔ گرمی میں
دوپہر کے وقت درختوں کا سایہ اُسے خسخانے سے بہتر ہے اور سردی میں
سُورج اُس کے کمرے کی انگیٹھی ہے۔ رات کو اگر مکلّف لحاف میسّر نہیں
تو کیا ہوا۔ گدڑی یا کملی میں لپٹا ہوا ہے یا چند سوکھی لکڑیوں کا ایک ڈھیر
جمع کر لیتا ہے اور اُن کو جلا کر اُس کے قریب رات کاٹ دیتا ہے گھر ہو اور
اس میں اتفاق تو ایسی غریبی بھی کٹ جاتی ہے۔ اور پھر دولت تو ڈھلتی
ہوئی چھاؤں ہے۔ کیا جو غریب ہیں وہ ہمیشہ غریب ہی رہینگے۔ کیا اُن
کی یا اُنکی اولاد کی کبھی نہیں سُنی جائیگی؟ امُید اُن کے کان میں یہ خوش آئندہ
آواز ڈالتی ہے ؎

رسید مژدہ کہ ایامِ غم نخواہد ماند　　چنان نماند و چنین نیز ہم نخواہد ماند

انسان نہ دیکھے تو اور بات ہے ورنہ خود اُس سے کئی درجہ افضل چیزیں
حکمتِ ایزدی سے اس کی خدمت میں مصروف ہیں۔ آفتاب اس کیلئے
سمندروں کے پانی کو اُبالتا ہے اُن کے بخارات کو اُڑا کر بادل بناتا ہے۔
بادل برستے ہیں تو زمین سرسبز ہوتی ہے۔ پھر آفتاب چمکتا ہے تو کھیت
پکتے ہیں اور میوے کھانے کے لائق بنتے ہیں۔ ہوا جو انسان کی زندگی
کا سہارا اور بہت سی چیزوں کی ہستی کا راز ہے۔ انسان کے لئے چکّی تک
پیستی ہے۔ پانی چلتا چلتا انسان کے سو کام کرتا جاتا ہے۔ کھیتوں میں سے

ہو نکلا تو وہ ہرے ہو گئے۔ باغ میں جا پہنچا تو اس میں پھل پھول آ گئے
کشتی کو اُس کی چھاتی پر رکھ کر کہہ دو کہ بھئی ذرا اِسے بھی ساتھ لئے جانا۔ تو اُسے
عذر نہیں۔ اُس میں دس بیس سو پچاس یا زیادہ آدمی چڑھ بیٹھیں تو اُسے
کچھ عذر نہیں۔ اور تو اور بوجھ جتنا اور جس قسم کا چاہو لاد دو۔ انکار نہیں۔
بہائے لئے جاتا ہے۔ آگ آدمی کے لئے کھانا پکاتی ہے۔ روشنی مہیا کرتی
ہے۔ اور اس کے سوا کسی اور کام میں جوت دو تو اپنی قوت خدمت کے
لئے حاضر کر دیتی ہے۔ ریلوے کے انجن۔ دُخانی جہاز۔ اور کارخانوں کی
کلیں آگ ہی کے زور سے چل رہی ہیں۔ اِن قوتوں سے بالاتر ایک قوت
ہے جسے برق کہتے ہیں۔ یہ پہلے صِرف چمک کر ایک آنِ واحد میں غائب
ہو جاتی تھی۔ اور انسان کی شائق نظر کو ایک جھلک دِکھا کر اُس سے اپنا چہرہ
چھپا لیتی تھی۔ اسے دیکھ کر اِنسان پہلے دل جاتا تھا یا غشی کھا کر گر پڑتا
تھا۔۔ اب یہ بھی عقل انسانی کی ترقی کے آگے سرِ تسلیم خم کئے ہوئے ہے۔
کبھی اِسے پیام بری کی خدمت سپُرد کرتا ہے اور کبھی اُسے گھوڑے کی جگہ
گاڑی میں جوتتا ہے۔ اور اس پر غضب ہے کہ جس نے یہ عظمت اور عزت
دِی اُس کا شکر ادا نہیں کرتا +

تمتّع کے موقعے اس کثرت سے ہیں۔ کہ اُن کی کثرت طبیعت کو اُن سے
غافل کر دیتی ہے۔ کھانے کی چیزوں کو ہی دیکھو۔ سرد ملکوں کے خوش ذائقہ
انگور اور سیب اور گرم ملکوں کے مرغوب میوے آم اور خربزے قوتِ
ذائقہ کے لئے اس سے بڑھ کر لذّت کیا چاہتے ہو۔ لوگ انہیں بہشتی میوے
کہتے ہیں اور مراد یہ لیتے ہیں کہ یہ بہشت سے آئے ہیں۔ کتنا بھونڈا تخیّل
ہے۔ یہی کیوں نہیں کہتے۔ کہ یہ بہشت ہے جس میں ایسے میوے میسّر ہیں

اور انہی پر کیا منحصر ہے۔ اپنی اپنی جگہ ایک سے ایک بڑھ کر ہے۔ رنگترہ اور نارنگی۔ کھاؤ تو قلب کو تفریح ہو۔ اِس سے بڑھ کر اُن کی خوبی کیا ہوگی۔ کہ مادّی چیزیں ہیں مگر تفریحِ قلب کا مادہ اُن میں موجود ہے۔ آلوچہ اور خُرمانی قدرت نے اپنے ہاتھ سے جوڑ ملایا ہے۔ ہرے بادام اور ہرا پستہ۔ اِن سب کو روز چکھتے ہو اور پھر کہتے ہو "ہم پر مَنّ وَسلویٰ نہیں اُترتا" اس سے بڑا خوانِ کرم کون بچھا سکتا ہے اور کس نے کبھی بچھایا مَآئِدَۃً مِّنَ السَّمَآءِ کی تفسیر ہے۔ کوئی اپنا پکا یا ہوا ایک کھانا تو ان "بہشتی" کھانوں کے مقابلے میں پیش کرو۔ اور یہ تمہارے پکائے ہوئے کھانے کیا ہیں انہی کھانوں کی نامکمل نقل ہیں۔ حلوائے بادام بناتے ہو۔ کہ بادام کے ذائقے سے کسی قدر مشابہ ہو۔ اگر یہ قدرت کے عطا کئے ہوئے مصالح نہ ہوں تو تمہارا کوئی کھانا مکمّل اور مزے دار نہ ہو۔ طرح طرح کی رقعہ دوزی کر کے اُسے اِن چیزوں سے سجا لیتے ہو تو تمہارا دستر خوان پُر رونق ہو جاتا ہے۔ اور یہ مَن و سلویٰ بغیر اقرار احسان کے کھاتے کھاتے جب تھک جاتے ہو تو مِنْ بَقْلِهَا وَقِثَّآئِهَا[1] پکارنے لگتے ہو۔ اُس وقت گاجر۔ مُولی۔ لسن۔ پیاز۔ ماش اور مُسور کی دال۔ کھیرا ککڑی وہ مزا دیتے ہیں۔ کہ سیب و انگور اور سردے اور آم کو بھلا دیں۔ سمجھتے ہو کہ کتابِ مقدّس میں پُرانوں کی کہانی بیان ہوئی ہے مگر یہ معلوم نہیں کہ تمہارے دلوں کا بنانے والا اور جاننے والا اُس کہانی کے بیان کرنے میں فطرتِ انسانی کا راز بتا رہا ہے۔ تاریخ روز اپنے آپ کو دُہرا رہی ہے۔ اور تمہیں خبر نہیں ہوتی +

---

[1] حضرت موسیٰؑ کی اُمّت نے اُن کی [illegible] تھا کہ ہمارے لئے پکا پکایا کھانا اور چنا چنایا دستر خوان آسمان سے اُترے تو مانیں آخر من وسلویٰ اترنے لگا [illegible] لیکن جب [illegible] کھاتے کھاتے تھک گئے۔ تو سبزی۔ ککڑی۔ چنے اور مسور کی دال مانگنے لگے +

ذائقے سے کہیں نفیس وہ حِس ہے جسے شامہ کہتے ہیں۔ اس میں نہ کچھ کھانا ہے نہ پینا۔ نہ چھونے کی ضرورت ہے۔ صرف کسی خوشبو کے قریب آنے کی دیر ہوتی ہے کہ مشامِ جان تازہ ہوجاتا ہے۔ دل میں مسرت محسوس ہوتی ہے۔ اور باچھیں کھِل جاتی ہیں۔ خدا جانے اس میں کیا تاثیر ہے۔ اور اس نے یہ اُڑکر پہنچنے کی طاقت کہاں سے پائی ہے۔ مگر آنکھ کو کوئی سبب نظر نہیں آتا۔ اور طبیعت ہے کہ خوش ہوئی جاتی ہے۔ آدمی ایک ٹھنڈی سانس کھینچتا ہے۔ کہ شاید سانس سے شامل ہوکر یہ نعمت اندر چلی جائے۔ اور اپنی ہورہے۔ مگر نہیں۔ وہ ایک گذران لطف ہوتا ہے۔ جو پل بھر میں چل دیتا ہے اور وہی سانس جو اندر سے واپس آتی ہے تو گرم اور افسردہ ہوتی ہے اور اس میں خوشبو کا کوئی پتہ نہیں ہوتا۔ کبھی ایسے جنگل میں گذر ہو۔ جہاں گلاب کا تختہ کھِلا ہوا ہو۔ یا جہاں اور پہاڑی پھُولوں کی مہک دور سے آرہی ہو اور تمہیں اپنی طرف بُلا رہی ہو۔ تو ضرور جی چاہے گا۔ کہ وہیں جھونپڑا بنالو۔ اور بیٹھ رہو۔ اگر یہ نہیں نصیب ہوا۔ تو فصلِ گل میں کسی باغ میں جانکلو۔ خوشبوئیں تو ابھی اچھی ہیں۔ مگر موتیا کھِلی ہو تو معلوم ہو کہ تیزی کے ساتھ مستی کس حکمت سے ملائی گئی ہے۔ اور پھر کیوڑے کی جنون انگیز خوشبو۔ کرنے کی جانفزا مہک اور بید مشک کی سوکھی لکڑی میں دھانی رنگ کے پھُول اور ان کی بھینی بھینی بو۔ کوئی کس کس حُسن پر جان دے۔

اُستادِ قدرت کی اُستادی قابل دید ہے۔ ذہن انسان کی ترقی کے لئے کیسا زینہ بنایا ہے۔ مادی اشیا سے اس مکتب میں ابجد شروع ہوتی ہے۔ اُن کا ذائقہ حسن کو گرویدہ کرتا ہے۔ اس کے بعد درجۂ دوم کی مادی اشیا آتی ہیں۔ مثلاً سردی۔ گرمی جن کے متعلق کھانا استعارے کے طور پر بولتے ہیں۔

لیکن جو فی الحقیقت کھانے اور چکھنے میں نہیں آتیں دھوپ نظر بھی آتی ہے۔ محسوس بھی ہوتی ہے۔ بدن پر اثر بھی چھوڑتی ہے۔ مگر پھر بھی ایسی چیز نہیں جیسے لونگ اور دارچینی۔ کہ کھانے سے بدن میں حرارت معلوم ہو۔ اسی طرح سردی بدن کو لگتی ہے۔ دماغ پر اثر ڈالتی ہے۔ کبھی کبھی دل تک بھی پہنچتی ہے برف وباران کی وجہ سے ہو تو ایک حد تک نظر بھی آتی ہے اس پر اس قسم سے نہیں جس سے تباشیر اور سرد چینی۔ کہ کھائیں اور زبان سے لیکر دل تک ٹھنڈک پہنچ جائے۔ دوم درجے کی مادی اشیاء کے بعد خوشبو سبق دینے آتی ہے کہ اس کا سبب تو نظر کے سامنے ہے۔ مگر وہ خود نظر نہیں آتی ہاں اس کا اثر موجود ہے۔ اس کے بعد ایک چیز آتی ہے۔ جو خوشبو سے بھی بدرجہا زیادہ لطیف ہے۔ اور وہ "حسن" ہے۔ دیکھتے ہی دل قابو سے نکلا جاتا ہے۔ اُس میں ایک بیقراری اور تڑپ محسوس ہوتی ہے۔ ایک قسم کی لذت اس نظارے میں شامل ہے۔ جو اپنے ساتھ درد کی کیفیت بھی رکھتی ہے۔ اس پر اتنی مرغوب ہے۔ کہ کوئی اُس درد سے خالی نہیں رہنا چاہتا۔ یہ لذت اور سب لذتوں سے نرالی ہے۔ نہ اس کو کسی لذت سے تشبیہہ دے سکتے ہیں۔ نہ اس کو کسی طرح بیان کر سکتے ہیں۔ اہل ذوق اس سے واقف ہیں۔ اور وہی اس کو سمجھ سکتے ہیں۔ بس اس کے آگے "حسنِ مطلق" کی شناخت تک ایک ہی زینہ رہ جاتا ہے۔ مگر انسانی بصیرت کی معمولی حد یہیں تک ہے۔ یہاں پہنچکر بہت سی آنکھیں خیرہ ہو جاتی ہیں۔ اور آخری زینے پر نظر ڈالنے کی تاب نہیں لا سکتیں۔ کم لوگ ہیں جو آخری زینے پر کھڑے ہو کر موجوداتِ عالم پر نظر ڈالتے ہیں یا اُن سے پرے تک دیکھتے ہیں۔ لیکن اگر آدمی غور کرے تو قدرت نے سبق پڑھانے میں اور سبقوں کی ترتیب مکمل اور آسان کر دینے

میں کوئی دقیقہ نہیں اٹھار کہا۔ اس بینائی پر حیف ہے جو اتنی قریب مثال کے ہوتے ہوئے یہ کہے۔ کہ مجھے نظر نہیں آتا۔ تو میں کیوں کر مانوں۔ میں دیکھ نہیں سکتا تو میں کیونکہ متاثر ہوں۔ میں دور ہوں۔ میں کیا کروں +

برین دو دیدۂ حیران من ہزار افسوس
کہ با دو آئینہ رویش عیان نمے بینم

لیکن ہم تو دنیا سے آگے نکل چلے۔ ابھی تو اسی کی دلچسپیاں ختم نہیں ہوئیں خیر ان کا ختم ہونا تو مشکل ہے۔ مقصد صرف یہ ہے کہ ان میں سے جس ایک سلسلے کا بیان ہم نے شروع کیا تھا۔ اس زنجیر کے ایک دو حلقے ابھی باقی ہیں۔ ہم نے "حسن" کا نام لیا تھا۔ ان چند لوگوں کو چھوڑ کر جو "حسن" کی جھلک کوہ و دریا اور دیگر مناظر قدرت میں دیکھتے ہیں اور اس سے پھاند کر منزل کو جا لیتے ہیں۔ یا جو "حسن" کو حسن انسانی ئیں دیکھ کر دور ہی سے تڑپتے ہیں اور تڑپتے تڑپتے منزل پر جا رہتے ہیں۔ ان بیشمار مثالوں کی طرف آؤ۔ جو "حسن" کو دیکھ کر اس کو اپنا بنانے کی آرزو کرتے ہیں۔ اور آسانی کے لئے اس صیغے میں حسن انسانی کے فدائیوں کو دیکھو۔ ان میں کئی ایسے خوش قسمت ہیں۔ جو اس آرزو میں کامیاب ہوتے ہیں۔ جس حسین پر آغاز عشق میں ان کی نظر پڑتی ہے۔ آخر اس سے ملنا ہو جاتا ہے۔ دنیاوی رسوم اور مذہبی قوانین دونوں اس اتحاد کو تسلیم کر کے اپنی منظوری کا سہرا طالب و مطلوب کو پہناتے ہیں۔ اور دعا دیکر رخصت کرتے ہیں۔ کہ جاؤ۔ خوش رہو آباد رہو۔ پھلو پھولو آگے چلکر درخت امید ثمر لاتا ہے۔ حسن پھر نئی کونپلیں نکالتا ہے۔ ماباپ لڑکے لڑکی کی پیشانی میں پھر اسی نور کی جھلک دیکھتے ہیں۔ جس نے انہیں جوانی میں ایک دوسرے کا دالہ و شیدا کیا تھا۔ اور دیکھ دیکھ کر خوش ہوتے ہیں۔

اُس کی ہر بات میں اپنی کسی عادت۔ کسی خصلت۔ کسی کمال ظاہری یا باطنی کا نقش دیکھتے ہیں اور باغ باغ ہوتے ہیں۔ یہ وہ خوشی ہے۔ جس کے ساتھ کی دنیا اور آیا جو نعمتیں جائز کی گئی ہیں۔ اُن کا پلڑا ممنوعات اور مکروہاتِ دنیا سے بھاری ہے یا نہیں۔ یہ خوش قسمت جوڑا تو جو جواب اس سوال کا دیگا وہ تو ہم سمجھ ہی سکتے ہیں۔ لیکن ممکن ہے کہ کوئی اور یاس و حرمان کا ستایا ہوا دل پکار اُٹھے بہ۔ دنیا کی خوبیاں تو گن ڈالیں۔ مگر تصویر کے دوسرے رخ کو بھی دیکھو۔ غور کرو۔ دنیا میں کتنی مصیبت ہے۔ کتنی بیماریاں ہیں۔ کتنا افلاس ہے کتنی لڑائیاں ہیں۔ کیسی خونریزیاں ہیں۔ بجلی کتنے خرمن جلاتی ہے۔ آگ کتنے گھر پھونکتی ہے۔ موت کیسے کیسے خاندان تباہ کرتی ہے۔ غرض ہزار آفتیں ہیں اور ایک انسان کی جان ع ہرچہ آید بر سر فرزند آدم بگذرد بیچارا یہ سب ستم سہے جاتا ہے اور اُف نہیں کرتا ہے" مگر یہ شکایت کرنے والے خواہ کتنے ہی حق بجانب ہوں۔ انہیں یاد رکھنا چاہیئے۔ کہ دنیا اضداد سے پیدا کی گئی ہے ہر ایک چیز کا وجود اس کے ضد کے وجود کا متقاضی ہے دھوپ کے ساتھ سایہ لگا ہوا ہے۔ اور دھوپ کا احساس ناممکن ہوتا اگر ساتھ سایہ نہ ہوتا۔ ایک مثبت ہے۔ دوسرا منفی۔ دونو لازم و ملزوم ہیں دیکھنا یہ ہے کہ حکمتِ بالغہ کا مقصدِ اصلی کیا ہے۔ اور اس میں انسان کا کیا حصّہ ہے۔ نگاہ میں وسعت اور عمق پیدا ہو جائے تو تمام تکالیف خیر محض دکھائی دیں اور ہر منفی کی تہ میں کچھ مثبت پنہاں نظر آنے لگے۔ یہی وہ سرمہ ہے جس کے لگاتے ہی آنکھ گرد و پیش جنت ہی جنت دیکھتی ہے۔ اور دلِ مرحوم مرزا داغ شیریں بیان کے ساتھ ہم آہنگ ہو کر گاتا ہے۔ کہ دنیا بھی اک بہشت ہے"۔

ناکام محبت

ایک روز کا ذکر ہے میں ٹہلتا ٹہلتا دیہات کی طرف جا نکلا۔ چونکہ دُور بہت نکل آیا تھا واپس ہوتا ہُوا دم لینے کے لئے راستے میں بیٹھ گیا۔ تھوڑی ہی دیر گذری تھی کہ دُور سے ایک جنازہ آتا دکھائی دیا۔ نزدیک آیا تو معلوم ہُوا کہ کچھ نوجوان لڑکیاں ایک تابُوت کو اُٹھائے ہیں اور ایک جوان سب سے کسی قدر بڑی عمر کی ہے تابوت کے آگے آگے سفید پھُولوں کا ایک ہار ہاتھ میں لئے آرہی ہے۔ پوشاک ان سب نازنینوں کی سفید رنگ کی تھی تابُوت کے پیچھے پیچھے متوفّی کے والدین تھے۔ جن کی وضع سے ظاہر تھا کہ کوئی اچھے خوشحال کسان ہیں۔ باپ کے چہرے سے صبر و استقلال عیاں تھا۔ مگر جمی ہوئی نظر چڑھی ہوئی تیوری اور جھُریوں دار چہرہ بتا رہا تھا کہ اندرِ دل کی حالت کچھ اور ہے۔ ماں اپنے خاوند کے بازو پر جھُکی تھی اور رہ رہ کر بیتاب ہوتی تھی۔ میں جنازے کے ساتھ ہولیا اور دفن کے بعد تک لوگوں کے ساتھ رہا۔ جب تابُوت کو قبر میں اُتارا ہے سہیلیاں پھوٹ پھوٹ کر روتی تھیں باپ کی آنکھوں سے آنسو جاری تھے اور ماں کا یہ حال تھا کہ کوئی تسلّی دیتا تھا تو اور بیچین ہوتی تھی۔ افسوس جس ماں کا گلِ گلزارِ خوبی عینِ بہار میں یکایک یوں پژمردہ ہو کر رہ جائے وہ اگر یہ بھی نہ کرے تو اور کیا کرے!

قبرستان سے واپس ہو کر میں نے سارا حال معلوم کر لیا۔ اور معلوم کرنے کو کیا ایک نہائیت سادہ کہانی تھی۔ متوفی گاؤں کی ممتاز حسین اور سارے کسانوں کی لاڈلی نوجوان لڑکی تھی۔ یہ اپنے ماں باپ کی اخیر عمر کی ایک ہی بچّی

تھی اور دیہات کی سیدھی سادی معاشرت میں بڑے نازوں سے پل کر جواں ہوئی تھی۔ تعلیم اس نے گاؤں کے پادری سے پائی تھی اور وہ اس پر بیحد شفقت کیا کرتا تھا۔ اس کا نازک ڈیل ڈول دلفریب خد و خال البیلا حسن خدا داد دلربا بھولا پن غضب کا الھڑپن اور بیحد نیک دل یہ کہتا تھا کہ کھیت کے مضبوط مضبوط درختوں میں حسنِ اتفاق سے باغ کا ایک نازک نونہال پھلنے پھولنے کو آ پڑا ہے۔ سہیلیاں اُس کے حسن کی برتری کو تسلیم کرتی تھیں۔ مگر حسد نہ کرتی تھیں۔ اس کی بلا تصنع نرم مزاجی اور دلربا خوش اطواری ایسی تھی کہ یہ خیال ناممکن کیسا محالِ محض تھا۔ دیہات کا کونسا تہوار تھا جس میں ہماری خوبصورت کسان کی لڑکی اپنی سہیلیوں سمیت شریک نہ ہوتی تھی۔ کونسی خوشی کی تقریب تھی جس میں اس کے قدوم میمنت لزوم سے لطف دوبالا نہ ہو جاتا تھا۔ ہرے بھرے جنگل میں جھولے ڈالے جاتے تھے۔ پھول پہنے جاتے تھے۔ لٹائے جاتے تھے اور ہزاروں طرح طرح کے دل بہلاوے ہوتے تھے۔ یہ جلسے گاؤں میں اکثر ہوا کرتے تھے۔ اور ان موقعوں پر کبھی کبھی شہر کے رہنے والے بھی تماشا دیکھنے کو آ نکلتے تھے۔ ایک دفعہ ایسے ہی موقع پر سپاہیوں کا ایک دستہ گاؤں کے قرب و جوار میں آ کر ٹھہرا۔ بہت سے سپاہی تماشا دیکھنے کو آئے۔ ان میں ایک نوجوان افسر بھی تھا اس پر اس گاؤں کی رہنے والی ملکہ حسن و جمال مرجعِ خاص و عام کا اثر ایسا ہوا کہ بیدھڑک اظہارِ محبت کرنے لگا۔ اس کے محبت بھرے جملوں۔ الفت کی نظروں پیار کے لہجوں اور سینکڑوں ملائم اور دل پسند حرکات و سکنات نے اس ننھے نازک بھولے بھالے دل کو چٹکیوں میں موہ لیا اس کے دل میں نوجوان سپاہی کی محبت روز بروز بڑھتی جاتی تھی مگر اسے

معلوم نہ تھا کیا ہو رہا ہے اور آخر کیا ہو گا۔ اِسے آئندہ کا خیال تک نہ تھا اُس کا منظورِ نظر جب پاس ہوتا تو یہ اُس کی باتوں اُس کے حرکات وسکنات میں محو رہا کرتی اور وہ پاس نہ ہوتا تو یہ ایامِ گذشتہ کے شیریں واقعات کو یاد کر کر کے جی بہلایا کرتی۔ اُفو! اس لڑکی کو اپنے محبوب سے کتنی محبت تھی! نوجوان سپاہی کی سپاہیانہ خوبصورت وضع نے اس پر جادو کر دیا تھا اور اس کے دِل کو چھین لیا تھا یہ گویا اُس کی پرستش کرتی تھی اور اُسے ہمیشہ اپنے سے اعلےٰ وبرتر سمجھتی تھی۔ یہ بات نہیں کہ اس پر دولت اور رُتبہ کا اثر پڑتا تھا۔ ہرگز نہیں۔ وہ تو عقل وتمیز سلیقہ وشعور تھا۔ جس کے باعث نوجوان سپاہی نے اس کے دِل پر قبضہ کیا تھا۔ یہ ہمہ تن گوش ہو کر اُس کی باتیں سنا کرتی تھی اور بے انتہا مسرت کے ساتھ اس کی طرف دیکھا کرتی تھی۔ اور جب کبھی اس اثنا میں اپنا خیال آجاتا تھا تو آپ کو بہت کم درجہ پا کر ایک ادائے دلربایانہ کے ساتھ جھینپ جاتی تھی اس کے عاشق کو اس سے محبت تو بڑی تھی لیکن اس قدر نہ تھی جس قدر اس کو تھی۔ اُس نے اگرچہ کھیل ہی کھیل میں اس سے تعلق پیدا کیا تھا تاہم وہ ایسا آوارہ واوباش نہ تھا کہ کچھ بھی پروا نہ کرتا۔ اس نے محبت کو تماشا سمجھا تھا مگر خود محبت کا تماشا ہو گیا۔ وہ اس معصوم بھولی بھالی محبت کرنے والی کے اطوار۔ طرزِ معاشرت اور حیا وعصمت کو دیکھتا تھا تو بے اختیار شادی کی تمنا اُس کے دِل میں موجزن ہوتی تھی۔ مگر پھر اُس کا اعزاز ظاہری خاندانی مرتبہ اور باپ کی مغرور اور پُر تمکین طبیعت یہ سب ایسی رُکاوٹیں تھیں کہ اُس کا دل ٹوٹ جاتا تھا۔

یکایک رسالے کے کوچ کا حکم ہُوا اور اس نے ہمارے نوجوان کی آرزوں کا یکلخت خون کر دیا۔ نوجوان نے چاہا کہ اپنی محبوبہ کے نازک دِل کو اس وحشتناک

خبر سے صدمہ پہنچائے۔ اسی لئے جب چلنے میں ایک دن رہا تو مجبوراً شام کو سیر کرتے کرتے اُس سے ذکر کیا۔ اس معصومہ کو جدائی کا کبھی خیال بھی نہ آیا تھا۔ خبر کیا تھی ایک برق بلا تھی کہ خرمنِ مسرّت اور راحت کو دم بھر میں خاک سیاہ کر گئی۔ نازنین زار زار مثلِ ابرِ نوبہار رونے لگی۔ عاشقِ صادق نے فرطِ محبت میں سینے سے لپٹا لیا۔ نازک گلابی رخساروں کو چوما اور یہاں تک کہا کہ آؤ گھر چھوڑ دو اور جہاں خدا لیجائے ساتھ چلے چلو۔ یہ اس قدر سادہ لوح تھی کہ سراسیمہ ہو کر اُس کی طرف دیکھنے لگی اور جب ذرا دیر کے بعد مطلب سمجھی تو عجیب کیفیت ہوئی۔ زبان سے تو کچھ نہ کہا مگر اس طرح پیچھے ہٹی جس طرح کوئی افعی سے بچتا ہے اور ایسی درد بھری نظر سے اُس کی طرف دیکھا کہ نگاہ سینے کو چیر کر دِل کے پار ہو گئی۔ پھر کلیجا مسوس کر باپ کی جھونپڑی کی طرف بھاگی۔ غریب سپاہی ہکا بکا خفیف ہو کر رہ گیا +

اگلے ہی دِن رسالے کے ساتھ وہ اُس گاؤں سے چلا گیا۔ نئے آب و دانے نئے نئے منظروں نئی نئی تفریحوں اور نئے نئے رفیقوں نے اُس کی محبت کو بھلا سا دیا۔ تاہم خیمہ گاہ کی چہل پہل۔ زمانِ محاصرہ کی تفریح۔ فوجوں کی صف آرائی اور لڑائیوں کے شور و غل میں کبھی کبھی اُسے دیہاتی پُرامن اور سادہ زندگی کے نظّارے یاد آجاتے تھے۔ ہائے وہ سفید جھونپڑی! وہ پٹیا جو رو پہلے تالے کے کنارے کنارے ہو کر اوپر جھاڑی تک پہنچی تھی! وہ ننھی مُنّی دیہاتی لڑکی جو اُس کے بازو کے سہارے اُس پٹیا پر اِدھر اُدھر ٹہلا کرتی تھی اور بیحد تمنّا کے ساتھ اُس کی باتیں سُنا کرتی تھی! +

محبوب کی جدائی سے بیچاری دہقان زادی کو بڑا بھاری صدمہ ہوا اُس کی ساری امیدیں خاک میں مل گئیں۔ پہلے کچھ دنوں تک تو غش آتے رہے

اور دیوانہ پن کے آثار پائے گئے۔ جب یہ شکائتیں دور ہوئیں تو ایک گہری تاریک غم کی گھٹا دل پر چھا گئی جس سے تھوڑے ہی عرصے میں جسم نازنین سوکھ کر کانٹا ہو گیا۔ آہ! اس نے جھروکے سے سپاہیوں کو کوچ کرتے دیکھا تھا! اس نے اپنے بیوفا عاشق کو دور تک اس قدر آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھا تھا کہ ڈھیلوں میں درد ہونے لگا تھا۔ دور سے اب فقط ایک چمکتا تارا سا نظر آتا تھا! ہائے ایک خواب روشن تھا کہ آنکھوں سے نہاں ہو گیا اور اسے تاریکی میں چھوڑ گیا! لوگوں سے اسے نفرت ہو گئی۔ اکیلی اُن روشوں پر ٹہلا کرتی تھی۔ جن پر یہ اور اُس کا محبوب دولو اکثر رہا کرتے تھے۔ بس جس طرح کوئی آہوئے زخم خوردہ سب کی نظروں سے پنہاں ہو کر کسی گوشے میں رو رو کر جان کھویا کرتا ہے۔ وہی ہو بہو اس کی حالت تھی۔ شام کے وقت گوالنیں اپنے اپنے کھیتوں سے آتی تھیں تو اکثر اسے کوئی غمناک گیت گنگناتے سنتی تھیں۔ عبادت کی طرف اب اس کا میلان بہت زیادہ ہو گیا۔ جب پاس سے گذرتی تھی تو بڑے بوڑھے بھی اس کی ناتوانی ولاغری پر ترس کھا کر اور اس کی زاہدانہ صورت سے مرعوب ہو کر راستے سے ہٹ جاتے تھے۔ اسے یقین ہو چلا تھا کہ میں قبر کی طرف قدم بڑھائے جا رہی ہوں۔ مگر قبر کا خیال اسے تشویش میں نہ ڈالتا تھا۔ یہ تو اُسے آرامگاہ سمجھتی تھی جس رشتہ سیمیں نے اسے دنیا سے باندھ رکھا تھا وہ ٹوٹ گیا تھا دنیا کی کوئی خوشی اسے خوشی نظر نہ آتی تھی۔ سخت مجبور ہو کر اس نے اپنے محبوب کو ایک آخری خط لکھا اُس میں یہ بیان کیا کہ میں جاں بلب ہوں اور یہ سب تمہاری کرتوت ہیں۔ اس خط میں اپنے تمام رنج والم بھی تحریر کئے اور اخیر میں یہ لکھا کہ میرے جی نے گوارا نہ کیا کہ تمہیں معاف کئے بغیر مر جاؤں۔"

بالآخر نقاہت اتنی بڑھی کہ جھونپڑی سے باہر نکلنا محال ہوگیا۔ گر پڑ کر جھروکے تک پہنچ جاتی تھی اور وہیں بیٹھی بیٹھی دن گزار دیتی تھی۔ اُس نے کبھی کسی کا گِلہ نہ کیا اور نہ اپنا دُکھ کسی سے کہا۔ محبُوب کا نام تک کبھی اُس کی زبان سے نہ نکلا۔ ماں کے سینے پر گردن ڈالدیتی تھی اور چُپکی چُپکی روتی تھی۔ غریب والدین بیٹی کا یہ حال دیکھ دیکھ کر کڑھتے تھے مگر مایُوس نہ ہوتے تھے۔ ابھی انکو اُمید تھی کہ ہمارے خزاں زدہ نونہال پر پھر ایک دن بہار آئے گی ۔

ایک دن اسی صُورت سے وہ اپنے والدین کے پاس بیٹھی تھی۔ دونوں ہاتھ اُن کے ہاتھوں میں تھے کھڑکی کھُلی تھی اور نرم نرم ہوا کے ساتھ اُس کے ہاتھوں کی ملی ہوئی حنا کی خوشبو مشامِ جان کو معطر کر رہی تھی۔ باپ ابھی ابھی کتابِ مقدس کے ایک مقام کو پڑھ کر سُنا رہا تھا جہاں دنیا کی بے ثبات راحتوں اور بہشت کی ابدی لذّتوں کا بیان تھا۔ آہ! معلوم ہوتا تھا کہ اس بیان سے اُسے تسلّی ہوتی ہے! والدین بڑی حسرت سے اُس کی صورت کو تک رہے تھے جو کثرتِ رنج وغم کے باعث نورانی ہو چلی تھی۔ وہ ٹکٹکی باندھے ایک طرف کو دیکھ رہی تھی۔ اور نازک نیلی نیلی انکھڑیوں میں آنسو بھرے تھے۔ اپنے! کیا وہ اپنے بیوفا محبُوب کی یاد کر رہی تھی یا اُس کے دِل میں کچھ اور ہی خیال تھا۔ یکایک گھوڑے کی ٹاپ کی آواز کان میں آئی۔ ایک سوار گھوڑا دوڑاتا جھونپڑی کے دروازے کو آیا اور جھروکے کے نیچے آکر اُتر پڑا۔ بیچاری لڑکی نے آہستہ سی ایک چیخ ماری اور پھر اپنی جگہ لیٹ رہی۔ ہاں یہ اُس کا پشیمان عاشق تھا! وہ دوڑ کر اندر آیا اور آتے ہی اسے سینے سے لپٹا لیا۔ نحیف ونزار جسم اور مُردنی چھائے ہوئے زرد زرد پیارے چہرے کو دیکھ کر

اس کے دِل پر سخت چوٹ لگی ۔ اِس میں اتنی طاقت کہاں تھی ۔ بیٹھے ہی بیٹھے کانپتا ہُوا ہاتھ اُس کی طرف بڑھایا ۔ لبوں کو جُنبش ہوئی مگر کوئی لفظ منہہ سے نہ نکلا ۔ ایک عجیب محبّت بھرے تبسّم کے ساتھ نگاہ کی اور پھر سدا کو آنکھیں بند کر لیں ؛

یہ ہے وہ کہانی جو مجھے لوگوں کی زبانی معلوم ہُوئی ۔ واقعات کس قدر سادہ تھے مگر مجھ پر انکا اثر ایسا ہوا کہ بیان نہیں کر سکتا ۔ اس کے بعد میں بارہا اس گاؤں میں آیا اور جب آیا ارادتاً قبرستان میں گیا ۔ جاڑے کی ٹھنڈی شام تھی درختوں نے پتّوں کا پُرانا لباس اُتار دیا تھا ۔ ہوا خشک گھاس میں سے سَن سَن کرتی آتی تھی ۔ اور ہر طرف ویرانی اور بے رونقی چھائی ہوئی تھی ۔ معصوم گاؤں والی کی قبر پر سبز بیلیں چڑھی تھیں اور ہری ہری دوب قبر کے تعویذ پر لہلہا رہی تھی ۔ وہی پھولوں کا ہار جسے میں نے میّت کے روز دیکھا تھا قبر پر لٹکتا تھا پھول تو مرجھا کر خشک بھی ہو گئے تھے لیکن احتیاط کرنے والوں نے یہ احتیاط ضرور کی تھی کہ اُنکی سفیدی میں فرق نہ آئے ۔ میں نے بہت سی عجیب و غریب یادگاریں دیکھیں اور ایسی ایسی دیکھیں کہ سنگدل سے سنگدل ناظر کا دل بھی اُن کو دیکھ کر بھر آئے ۔ مگر یہ ایسی یادگار تھی کہ میرے دِل پر جتنا اُسکا اثر ہُوا اُتنا کبھی کسی کا نہ ہُوا تھا ؛

مرزا غالب

فکرِ انساں کو تری ہستی سے یہ روشن ہوا
ہے پرِ مرغِ تصور کی رسائی تا کجا

روح تھا تو اور تھی بزمِ سخن پیکر ترا
زیبِ محفل بھی رہا محفل سے پنہاں بھی رہا!

دید تیری آنکھ کو اُس حسن کی منظور ہے
صورتِ روحِ رواں ہر شے میں جو مستور ہے

معجزِ کلکِ تصور ہے دیا دیواں ہے یہ
یا کوئی تفسیرِ رمزِ فطرتِ انساں ہے یہ

نازشِ موسیٰ کلامی ہائے ہندوستاں ہے یہ
نورِ معنی سے دل افروزِ سخنداناں ہے یہ

نقش فریادی ہے تیری شوخیٔ تحریر کا
کاغذی ہے پیرہن ہر پیکرِ تصویر کا

نطق کو سو ناز ہیں تیرے لبِ اعجاز پر
محوِ حیرت ہے ثریا رفعتِ پرواز پر

شاہدِ مضموں تصدق ہے ترے انداز پر
خندہ زن ہے غنچۂ دلّی گلِ شیراز پر

آہ تو اُجڑی ہوئی دلّی میں آرامیدہ ہے
گلشنِ ویمر؎ میں ترا ہمنوا خوابیدہ ہے

لطفِ گویائی میں تیری ہمسری ممکن نہیں
ہو تصوّر کا نہ جب تک فکرِ کامل ہمنشیں

ہائے اب کیا ہو گئی ہندوستاں کی سرزمیں!
آہ اے نظارہ آموزِ نگاہِ نکتہ بیں!

گیسوئے اُردو ابھی منت پذیرِ شانہ ہے
شمع یہ جوئیدۂ دل سوزیٔ پروانہ ہے

؎ ملک جرمن میں ایک مقام ہے جہاں گوئٹے شاعر مدفون ہے ۱۲ -

اے جہاں آباد اے گہوارۂ علم و ہنر ہیں سراپا نالۂ خاموش تیرے بام و در
تیرے ہر روزہ میں خوابیدہ ہیں شمس و قمر یوں تو پوشیدہ ہیں تیری خاک میں لاکھوں گہر

دفن تجھ میں کوئی فخر روزگار ایسا بھی ہے؟
تجھ میں پنہاں کوئی موتی آبدار ایسا بھی ہے؟

چمن کی سیر

غنچوں نے چٹکیوں میں میرا دل اُچھالیا اے باغباں چمن میں تیرے کیا بہار ہے
لالہ ہے یا کہ حسن کا ہے جل رہا دیا اُڑتی ہے بو کہ جاتا ختن کا سوار ہے

ہنگام صبح سیر گلستاں بسا خوش است
بر شاخِ سبز بلبلِ شیریں نوا خوش است

سبزہ کا ہے زمیں پہ بچھا فرش مخملی اور اس پہ ہیں چمک رہی پھولوں کی کیاریاں
جا بجا پانیوں نے گویا سحر ہنر وری فیروزہ پر عقیق سے کیں مینا کاریاں

اے آسماں بگو بہ ملائک کہ دیدہ اند؟
منظر چنیں بہ خلدِ بریں یا شنیدہ اند؟

کس ناز کس ادا سے اٹھی ہے نسیم ہائے آفت کی شوخی اور قیامت کی چال ہے
کہہ دو کہ بلبلوں کو نہ اب باغباں ستائے شاخ شجر تک آج چمن میں نہال ہے

مانند گل ز فیض صبا تازہ شد دلم
بادہ خورم بہ یادِ گل و غم غلط کنم

نہروں میں کس صفائی سے بہتا ہے آبِ صاف آئینے ہیں یہ سرو و صنوبر کے واسطے

ہر لہر کی زباں سے یہ کہتا ہے آبِ صاف — رُوحِ رواں ہوں میں ہی گُلِ تر کیواسطے

چیزے کز و حیات شود بہرہ ور نسیم
در ابر جلوہ من و در ہر شجر منم

خوشیوں کے گیت گاتی ہیں سب طائرانِ باغ — شاخوں پہ پھول مستوں کی صورت ہیں جھومتے
محوِ زیارت آج ہیں کیا زائرانِ باغ — اور جھک کے پاؤں شاہدِ گُل کے ہیں چومتے

گُل گفت بس خوش آمدم اینک نوائے تو
بُلبل جواب داد۔ کہ جانم فدائے تو

کالی گھٹا چمن میں ہر اک سمت چھا گئی — موجِ ہوا پہ جھومنے لگی لینے بوئے گُل
پھر آکے اُنکے کان میں کچھ جو سنا گئی — اُڑ اُڑ کے بلبلیں چلی جاتی ہیں سوئے گُل

از قاصدِ صبا چہ حکایت شنیدۂ
از من چرا تو بُلبلِ شیدا پریدۂ

بجلی چمک کر چھپ گئی پھر کیوں سحاب میں — کیا کوئی دیدِ حسن کے لائق نہ تھا یہاں
کب تک چھپے گا چہرہ یہ آخر نقاب میں — لو یک بہ یک پھر آپ کا جلوہ ہوا عیاں

حقا کہ برقِ حسنِ حسیناں شنیدہ ایم
این نورِ شعلۂ رخِ رخشاں نہ دیدہ ایم

بجلی نہیں تجلیِ یزداں ہے ابر میں — اور یہ بھی محض عکس ہے اُس کے ظہور کا
جلوہ اُسی کا ظاہر و پنہاں ہے ابر میں — صد برق ایک قطرہ ہے دریائے نور کا

اے آفتاب ذرۂ مہرِ ضیائے تو
گستاخی اتمام شد عزمِ ثنائے تو

بارش کی بوندیں گرنے لگیں آسماں سے — اے خضر! عطر دیکھ لے آبِ حیات کا
ہیرے نکل رہے ہیں یہ بادل کی کان سے — تاروں کی طرح چمکیں سماں ہو جو رات کا

اَے ابرِ پرتوِ رحمت پروردگار باد
وز تو بکوہ و دشت ہمیشہ بہار باد

بادل ہو گُل ہو باغ ہو بلبل ہو شاخ پر ہو حرز جان و راحتِ دل میری ایک شے
قُدرت کی خوبیوں پہ ہمیشہ رہے نظر بس زندگی کا لطف ہمایوں اسی میں ہے

خوش باش اے چمن کہ مرا شاد کردۂ
ویرانہ بود خاطرم۔ آباد کردۂ

عجاز دیکھ تو سہی یہاں کیا سماں ہی آج نیرنگ آسمان و زمیں کا نیا ہی رنگ
اقبال تیری سحر بیانی کہاں ہی آج ناظر کمانِ فکر سے مار ایک دو خدنگ

از نغمہ ہائے دلکش ایں چار یار ما
پنجاب خوش نواست ہمایوںؔ دیار ما

مُرجھایا ہوا پھُول

ہی عجب عالم فضائے باغ پر آیا ہُوا ہر طرف تصویر کا سا ہی سماں چھایا ہُوا
جس شجر کو دیکھئے تنتا ہے اپنے حسن پر پھول جو دیکھو جوانی پر ہے اِترایا ہوا
سیدھے منہ سے بات تک کرتی نہیں غنچہ ذرا ان کا نخرا آجکل زوروں پہ ہی آیا ہوا
دیکھئے موجِ صبا کو کچھ اکڑ سی ہی اکڑ ہی کہتی ہے سارا جہاں ہی میرا مہکایا ہُوا
پھنس ہی جاتی ہی نظر اس کی کشش کے دام میں شاہدِ گل کا عجب جوبن ہی گدرایا ہُوا
یہ سماں ہی۔ دیکھتا ہوں پر اسی گلزار میں اک طرف کو شاخ پر اک پھول مرجھایا ہُوا

اس پھلے پھولے چمن میں یہ گلِ پژمُردہ ہے

یا کوئی حسرت کا پتلا عاشقِ دل مُردہ ہو

کل اسی گل کا عجب انداز تھا طرفہ نگاہ
تھی محبت سے لئے آغوش میں اس کو ہوا

لیتی تھی اِسکی بلائیں گردِ پھر پھر کر نسیم
پھینکتی تھی اوس موتی اُسکے سر پر وار وا

چاندنا سا مسکراہٹ سے تھا اسکی چار سو
تھیں ہوائیں اِسکے دم سے مشک بیز و عطر بار

کس کے دل میں چٹکیاں لیتی نہ تھی اُس کی ادا؟
دیکھکر صورت کو اُس کی کس کو آتا تھا نہ پیار

لونڈیوں کی طرح جھلتی تھی اسے پنکھا صبا
سر پہ چھتری اُسکے تھا کھولے ہوئے ابرِ بہار

نازپروردِ عناصر تھا بجا کہنا اِسے
دیکھ کر اس کو نہیں پھولی سماتی تھی بہار

دیکھ پاتا تھا ذرا اُس کو جو کوئی گلعذار
چاہتا تھا جھٹ گلے کا اپنے کر لے اس کو ہار

نام کو اسکی ہنسی میں تھا نہ غم کا شائبہ
کیا خبر تھی جلد اڑ جانے کو ہے رنگِ بقا

تھا رگوں میں اسکی گو یا موجزن آبِ حیات
اس کو کیا معلوم تھا چلنے کو ہے بادِ فنا

گود میں بادِ بہاری نے کھلایا تھا اسے
چومتی تھی اس کا ماتھا پیار سے بادِ صبا

کی جو کچھ بادِ سحر نے اس سے آ کر چھیڑ چھاڑ
گدگدانے سے یہ اُس کے کھل کھلا کر ہنس پڑا

کچھ ہوا اٹھکھیلیوں سے اُسکی ایسا خندہ زن
ہنستے ہنستے آنکھ میں شبنم کا آنسو آگیا

چومتی تھیں اس کا منہ جھک جھک کے شاخیں بار بار
اونگھتے کو ٹھیلتے کا اک بہانہ تھی صبا

اُسکی بو کی باندھتی تھی کل ہوا موجِ نسیم
انقلاب آیا ہے لیکن آج یہ کتنا عظیم

جانتی تھی کل اسے جو شاخ اپنا تاجِ سر
آج ہے اُسکے لئے یہ بارِ خاطر سے بتر

درد سے اسکے نہیں بھرتی ہے ٹھنڈی سانس تک
سرد مہر ایسی ہوئی ہے آج تو بادِ سحر

ڈھونڈھتی تھی کل بہانے اس سے لگ چلنے کو تو
آج کترانے لگی ہے اس سے تو کیوں اسقدر؟

آج آنکھیں پھیر لیں گلچیں نے تحرا سے تو کیا
رال اسکی بھی ٹپکتی تھی اسے کل دیکھکر

اپنے اپنے حالمیں ہیں مست سُکانِ چمن ‌ ‌ کس کو پروا ہے کرے جو اُسکی حالت پر نظر
کل گُلِ تر تھا۔ تو تھا گلگونہ روئے سخن ‌ ‌ صرف تشبیہ عذارِ مہوشانِ سیمبر

اَب زبانِ شعر میں ہم معنے حسرت ہی یہ
اہل بینش کو چراغ دیدۂ عبرت ہے یہ

اے تماشائی! مزے سیرِ چمن کے لوٹ کر ‌ ‌ اس گُلِ پژمردہ کی جانب بھی ذرا کر نا نظر
یہ دکھاتا ہی۔ اگر ہوں عقل کی آنکھیں کھلی ‌ ‌ کوئی دن کے ہیں سب اس دنیا کی حسن کروفر
ہوش کے کانوں سی سن۔ یہ کہہ رہا ہی صاف صاف ‌ ‌ "اس دو روزہ زندگی کو اس طرح کر تو بسر
چار سو پھیلے جہان میں بو ترے اخلاق کی ‌ ‌ دیکھ کر تجکو دلوں سی دور ہو غم کا اثر
کاٹ دے ہنس کھیل کر اس مختصر ہستی کو تو ‌ ‌ دی خوشی سب کے دلوں کو ورنہ مت پہنچا ضرر
کل کو چھا جائے نہ اُن پر موت کی پژمردگی ‌ ‌ التفاتِ دوستاں کی آج ناداں قدر کر

ہے مری پژمردگی تاویل رویائے حیات
میری ایک ایک پنکھڑی تفسیرِ آئینِ ممات"

شکایت زمانہ

مُبارک اہل ہنر کو فراغ نوحہ گری ‌ ‌ کہ شمع بزم طرب ہی فروغ بے ہنری
اگرچہ داخلِ طبعِ جہان ہی کونِ و فساد ‌ ‌ مگر زمانہ کی نیت فساد سے نہ بھری
مزاج دہر کو یہ ضد ہے چارہ جوئی سے ‌ ‌ کہ دست سعی رفو گر ہے صرف جامہ دری
چمن میں اب کے یہ کیسی بہار آئی ہے ‌ ‌ نہ کوئی پھول شگفتہ نہ کوئی شاخ ہری
چمن کی سیر مبارک فراغ بالوں کو ‌ ‌ ہمیں قفس میں مزا دیگئی شکستہ پری

دعا سے ہاتھ اٹھاتے ہیں اے دلِ ناہوں
کہ ناگوار طبیعت ہی ننگ بے اثری

اگرچہ دہر نے کھائے ہزار ہا چکر
سرِ فلک سے نہ نکلی ہنوز خیرہ سری

زمانہ بسکہ نئی چال روز چلتا ہے
نہ بھول جائے کہیں اپنی چال کبک دری

ہم اپنے دل کی لگی پر جو روئے بھی تو کیا
بجھا سکے گی نہ یہ آگ آنسوؤں کی تری

نمو دِ حشر ہے اے بختِ خفتہ ہو بیدار
غضب خدا کا ابھی تک نہ تیری نیند بھری

جگا کے تھک گئی عبرت بھی خوابِ غفلت سے
مگر نہ چونکے ہم اس پر بھی اف رے بیخبری

دکھایا جہل نے تحقیق کا اثر الٹا
مقدمات بدیہی بھی ہو گئے نظری

محیط ہم پہ ہے یوں تیرگی جہالت کی
کہ ظلمتِ شبِ غم ہے سپیدۂ سحری

بشر کے سر ہے رسومِ قیود کا وہ بار
جسے اٹھا نہیں سکتی ہی طاقتِ بشری

ہمیں گناہ پہ مجبور کرتی ہے عادت
اگرچہ فطرتِ انساں ہی معصیت سی بری

زمانے بھر سے برے ہو گئے ہمیں اے قوم
برا نہ مان جو کہتا ہو کوئی بات کھری

یہ کیا کہ علم میں ہم اور سب سے ہار گئے
جو ہیں شجاع کبھی بولتے نہیں وہ ہری

اگرچہ جبن میں ضرب المثل نہیں لیکن
حقیقتاً جو نظر کی تو ہم نہیں ہیں جری

ہم اپنے زعم میں سمجھے ہوئے تھے جسکو علم
نہ حکمتِ عملی ہے نہ حکمتِ نظری

ذلیل سمجھے ہیں ہم حرفت و صناعت کو
ہماری شان کے لائق نہیں ہی پیشہ وری

اگرچہ قوتِ ایجاد سے رہے محروم
نکالتے ہیں نئی روز طرزِ گدیہ گری

بری ہے تنگ حمایت سی ذاتِ اہل کمال
مسیح کو نہیں پر دلائے رنج بے پدری

ملی ہے خوبیٔ قسمت سے ہمتِ عالی
گداگری میں بھی ہے ہم کو زعم تاجوری

ادیب ہم بھی ہیں مرزا کہ آج علمِ ادب
نہیں ہے کچھ مگر افسانہائے دیو و پری

کمالِ نقص

ہیں تو بے شبہہ ہوں سراپا نقص
دیکھیں اہلِ کمال اپنا نقص

ماہ کامل میں ہے کلف کا عیب
مہر روشن میں ہے گہن کا نقص

ذرہ ذرہ ہے صاف صاف عیاں
ایک پر ایک کا ہے بالا نقص

چار دن کی ہے چاندنی کی بہار
صاف روشن ہے جیسے تارا نقص

ہات کا میل زر کو کہتے ہیں
بے زری کا ہے آشکارا نقص

روز روشن کے واسطے شبِ تار
روشنی کے لئے اندھیرا نقص

داغ افلاس مفلسوں کے لئے
اہل دولت کو زر کا توڑا نقص

ہے عجب دھوپ چھاؤں کا عالم
ہنر اس کا جو ہے وہ اس کا نقص

نازکی عیب پہلوانوں کا
پہلوانی پری رخوں کا نقص

حسن بے ناز بے نمک یکسر
نازِ بے حسن انتہا کا نقص

خامشی بے سبب سراسر عیب
سخن بے محل سراپا نقص

زندگی سے جہاں میں سب کچھ ہے
اس کو بھی ہے اجل کا کھٹکا نقص

نشے کو بھی خمار لازم ہے
عیش کا ہے یہ حیرت افزا نقص

جرم کا ہے جواہرات پہ جرم
جوہری پر یہ ہے ہویدا نقص

ہے ہنر کو کسادئے بازار
کس غضب کا یہ ہے خدایا نقص

علم سے قدرِ اہل علم و ہنر
اس کو ہے مال کا نہ ہونا نقص

سود کو ہیں زیان کے سو کھڑاگ
نفع کے واسطے ہے گھاٹا نقص

فتح کو ہے شکست کا دھڑکا
رنج کا ہے خوشی میں آنا نقص

دولتیں سب کی سب زوال پذیر — ہائے پیشِ نظر ہیں کیا کیا نقص
اس جہاں میں ثبات ہے کس کو — بے ثباتی بھلا ہے کم کیا نقص
گلِ بے خار اس چمن میں نہیں — پھول کے واسطے ہے کانٹا نقص
کہیں اس کے خلاف ہو تو ہی شاذ — شاذ ہوتا ہی کیا ہے تھوڑا نقص
آدمی کی خطا سے ہے ترکیب — ڈھونڈتا ہی ہے اُس کا بیجا نقص
نارسا ذہن ناتمام خیال — عقل ناقص ہے اس کا پیدا نقص
کوئی نقصان سے نہیں خالی — کہیں اتنا کہیں ہے اُتنا نقص
ہاں مگر ذاتِ واحدِ مطلق — جس میں حقاً نہیں ہے اصلاً نقص
لیکن اے دوست امرِ حق ہے یہی — نقص پر ہے نگاہ کرنا نقص ق
اوّلاً ہوگی یہ غلط بینی — کیونکہ وہ کم ہے یا زیادہ نقص
سب ہیں مخلوقِ خالقِ مطلق — اُس کی خلقت میں کچھ دکھانا نقص
نقصِ خلاق ہے معاذ اللہ — کیُوں کہ ناقص ہی سے ہو پیدا نقص
ثانیاً نقص ہے دلیلِ کمال — کہ اگر مجھ میں کچھ نہ ہوتا نقص
قدر اہلِ کمال کیا ہوتی!! — بحقیقت نہیں یہ میرا نقص
ایک فرقِ مجاز ہے ورنہ — کیسا نقصان اور کہاں کا نقص

ناقصِ آزاد پر نظر کیوں ہے
آپ کا یہ کمال ہے یا نقص

تصویرِ عبرت

بزم اک* لاہور میں ہے خادمانِ قوم کی
جنکے دل سے لگ رہی ہو فکر شانِ قوم کی

رات دن سرگرم رہتے ہیں سب اسی کوشش میں
جس طرح سے بن پڑے اسلام کی خدمت کریں

حسرتِ بیدل بھی اب کے شاملِ محفل ہوا
رنگِ محفل سے سرورِ بیکراں حاصل ہوا

بلبلانِ قوم کے جب چہچہے سب سن لئے
شہرِ خاموشاں میں جا نکلا میں عبرت کیلئے

پھرتے پھرتے مرقدِ نورجہاں آیا نظر
مقبرہ تھا وہ کہ تھا تصویرِ عبرت سر بسر

گل تھا جس کی شان پر عالم کا دل آیا ہوا
آج عالم بیکسی کا اُس پہ ہے چھایا ہوا

جس کے رتھ کو ہانکتا تھا بادشاہ روزگار
گردشِ گردوں سے یوں تاراج ہے اُس کا مزار

چوٹ سی دل پر لگی اُجڑی وہ حالت دیکھکر
جان ہی پر آبنی بگڑی وہ صورت دیکھکر

دل کی آنکھیں کھل گئیں غفلت کا پردہ اٹھ گیا
بیخودی نے مجھ کو دکھلایا تماشا اک نیا

شکل اک آئی نظر استادہ بافسرِ شاہی
جو عجب حسرت سے روضہ کی طرف تھی دیکھتی

اُس کی پیشانی سے رعبِ سلطنت تھا جلوہ گر
اُس کی چتون سے برستا تھا غضب کا کرّ و فر

دل نے آہستہ کہا یہ ہے جہانگیرِ غیور
مقبرہ میں سونے والی اُس کے دل کی تھی سرور

دیر تک تو ضبطِ بیتابیٔ دل کرتی رہی
جوشِ بیتابی سے وہ مجبور آخر ہو گئی

آہ کھینچی ایک اُس نے با دلِ اندوہگیں
یوں کیا اظہارِ دردِ دل بآوازِ حزیں

کیا اُسی بیگم کا یہ ہے خوار خستہ مقبرا
برسوں ڈنکا جس کا ملکِ ہند میں بجتا رہا

میں نے جس کے سر پہ قرباں چترِ شاہی کر دیا
جس کی چوٹی کے تلے اورنگِ شاہی دھر دیا

جسکے قدموں پر فدا کر دی تھی میں نے سلطنت
جسکے آگے سر جھکا دیتے تھے اہلِ مملکت

جس کی صورت جلوۂ فردوس کی تصویر تھی
جسکی رنگینی بہارِ خطۂ کشمیر تھی

* یعنی انجمن حمایت اسلام لاہور

آہ وہ ایام عشرت اور وہ لیل و نہار
جس کی رنگین بزم رشک روضۂ فردوس تھی
ظالموں نے قبر کا تعویذ تک چھوڑا نہیں
[...]نجی سے خجل ہوتی تھی جسکی پھلجھڑی
قصر میں بچھتا تھا جسکے فرش دیبا و حریر
جمگھٹے میں نازنینوں کے جو کرتی تھی بسر
سیج پر پھولوں کے سوتی تھی کبھی جو ناز میں
جس کی پابوسی کی کرتے آرزو گلہائے تر
حسن جس کا تازگی بخش گل و گلزار تھا
قصر میں جلتی تھیں جس کی شمعہائے عنبریں
نام روشن ہے جہان میں آہ جس کا سر بسر
[...]دی جس نے بہت سے صاحب طبل و نشان
جن کو صدہا خلعت دیبا و اطلس دیدیئے
[...]ڈیوں پہ جسکے تھی پوشاک کل زربفت کی
ناگہاں ہو گئی خاموش دم بھر کے لئے
[...]ر قبر پر نشان لوح بھی پیدا نہیں
نیکناموں کی نشان باقی رہینگے حشر تک

بلبلِ آمل* چہکتا دیکھ کر جن کی بہار
بیکسی سی اسکے روضہ کی ہے کیا صورت [...]
کونسا گوشہ ہی تربت کا کہ جو ٹوٹا نہیں
حیف وہ خاموش آغوش لحد میں ہے پڑی
آہ فرش خاک پر سوتی ہے وہ ماہ منیر
آہ اس کی قبر پر اب بیکسی ہے نوحہ گر
ہائے اس کی قبر پر اک پنکھڑی تک بھی نہیں
خشک† کانٹوں کا پڑا ہے ڈھیر اسکی گود پر
آہ قسمت میں لکھا اس کی لحد کے خار تھا
حیف روشن اک دیا بھی قبر پر اسکی نہیں
نام کو بھی روشنی آئے نہ اس کی قبر پر
اس شکستہ مقبرہ میں وہ پڑی ہے بے نشاں
حیف ترسے اس کی تربت ایک چادر کیلئے
آج ویرانے میں اس کے روضہ کی ننگی کھڑی
تبکہی جنوں سے ادا پھر اس نے یہ کلمے کہے
نقش نام نیک لوح دل سے مٹ سکتا ہے کیا
کیا ہوا گر دور گردوں نے مٹا دی قبر تک

گر نہیں ہے گور پر اس کے دیا تو کیا ہوا
ہے جہان میں نور اس کے نام کا پھیلا ہوا

* ملک الشعرا طالب آملی ۱۲ † جب تم نے نورجہاں کی قبر دیکھی تو اس پر ببول کے کانٹوں کا ڈھیر پڑا ہوا تھا ۱۲

حالی

کوئی نہ تھا جو بنے ملکِ شعر کا والی　　دکھائے جوہرِ فکرِ طبیعتِ عالی
پڑی تھی شاہدِ بزمِ سخن کی جا خالی　　زمانہ دیر سے تھا منتظر ترا حالی

بیا کہ فرشِ رہت دیدہ ہائے مشتاقاں
نوائے نغمہ تو جاں گدازِ عمناکاں

اُٹھا کے بربطِ بالین سعدیٔ شیراز　　پڑے ہوئے جسے گذرے تھے سالہا درا ز
گئے تھے جس کو بجانے کا بھول سب انداز　　کچھ اس ادا سے ہوا اُس پہ تو ترانہ نواز

کہ آتے جاتے کو شیدا بنا لیا تو نے
فسوں سا خلقِ خدا پر چلا دیا تو نے

جگر نشیں ہیں ترے تیرِ نالۂ موزوں　　تری نوائیں ہیں برق قرار و صبر و سکوں
ہے زخم زخمہ پہ ایک ایک والہ و مفتوں　　خمِ شراب میں ساقی نے گھول دی افیوں

کہ مستِ جامِ تو تنہا نہ مے گسار انند
"خرابِ بادۂ لعلِ تو ہوشیار انند"

ہیں حرف حرف میں تیرے چھپے ہوئے نشتر　　ہیں لفظ لفظ میں گویا بجھے ہوئے خنجر
دل اُس کا چھیدتے ہیں چاٹتے ہیں اس کا جگر　　ہوئی پکار کہ بزمِ طرب بنی محشر

"کسے نماند کہ دیگر بہ تیغِ ناز کشی
مگر کہ زندہ کنی خلق را و باز کشی"

صدائے رعد سے بھی تھے نہ چونکنے والے　　شرابِ لذتِ خوابِ سحر کے متوالے
مگر اُٹھائے جگر دوز تو نے جب نالے　　تو پڑ گئے دلِ فولاد میں بھی تبخالے

زخویشتن شد ویک یک تپاں زجا برخاست
کہ شورِ صورِ سرافیل حالیا برخاست

ترا کلام ہے تفسیرِ دردِ اہلِ جہان
ہے شرحِ رازِ حقیقت ہر ایک ترا بیاں
شعاعِ مہرِ معانی سے ہے ترا دیواں
ضیائے مردمکِ دیدۂ سخنداناں

ہمیشہ بزم میں باقی رہیگی ضو اُس کی
رہیگی زندہ دلوں کے دلوں میں لو اُسکی

غزل میں ہو وہ تصوف وہ سازو سوز و گداز
ہے مست صوفیٔ صافی و رند محرمِ راز
دکھا یا اُردو میں حافظ کا ہو بہو انداز
بھرا ہے شیشۂ ہندی میں بادۂ شیراز

زلالِ چشمۂ حیواں زخامہ ات بچکید
کہ روح درتنِ قومِ فسردہ جاں بدمید

چمن میں طوطیٔ ہندوستان ہو گرمِ سخن
کہاں ہے شورشِ آوازِ نالۂ بیرن
زبانِ ہند زبانِ جہاں اگر ہو جائے
تری نواؤں سے تسخیر بحر و بر ہو جائے

زمینِ شعر میں تازہ چمن لگائے ہیں
اور ان میں طرفہ مضامین کے گل کھلائے ہیں
نگاہ صادق مشتاق میں سمائے ہیں
ترا رطرح ہزاروں نے خار کھائے ہیں

نہ وہ رہینگے زمانہ میں اور نہ تو حالی
رہینگے تیرے گلستاں میں رنگ و بو حالی

آغازِ محبت

یاد ہیں وہ سارے عیش با فراغت کے مزے — دل ابھی بھولا نہیں آغازِ الفت کے مزے

وہ سراپا ناز تھا بیگانۂ رسمِ جفا — اور مجھے حاصل تھے لطفِ بے نہایت کے مزے

حسن سے اپنے وہ غافل تھا میں اپنے عشق سے — اب کہاں سے لاؤں وہ ناواقفیت کے مزے

میری جانب سے نگاہِ شوق کی گستاخیاں — یار کی جانب سے آغازِ شرارت کے مزے

یاد ہیں وہ حسن و الفت کی نرالی شوخیاں — التماسِ عذر و تمہیدِ شکایت کے مزے

جلوۂ ہستی فزائے دلربا کی لذتیں — بیخودی ہائے دلِ مخمورِ حیرت کے مزے

یاد ہیں وہ آرزو ہائے لقائے یار میں — کشمکش ہائے شبِ تاریکِ فرقت کے مزے

شوقِ عرضِ آرزو کے وہ نرالے ولولے — فکرِ مضموں ہائے عنوانِ کتابت کے مزے

یاد ہیں وہ انتظارِ نامۂ محبوب میں — بیقراری ہائے ناکامِ طبیعت کے مزے

صحتیں لاکھوں مری بیماریِ غم پر نثار — جس میں اٹھے بارہا ان کی عیادت کے مزے

وہ زمانہ بھی غرض تھا کیا زمانہ لطف کا — دل کو جب حاصل تھے سارے عیش و عشرت کے مزے

لیک حسرت اس تغافل کیش کی بیداد نے
بھلائے سب محرومیوں سے وہ محبت کے مزے

انجامِ محبت

(حرماں نصیب گلیٹ[1] زبانِ حال سے)

---

[1] مغرب کے لاثانی فسانہ نگار وکٹر ہیوگو کے فسانہ تو اثر آفریں نے ختم کر کے راقم کے دل میں

مجھ سے پوچھے کوئی انجام محبت کے مزے
یادہ حرماں کی لذت، جامِ حسرت کے مزے

مجھ پہ احساں کر گئی وعدہ فراموشی تری
بے وفائی نے ہی دکھلائے شہادت کے مزے

کوہکن بھی داستاں کو میری سنکر بول اُٹھے
کاہے کو چکھے تھے ہیں نے یہ مصیبت کے مزے

گو سراب آرزو تھا تیرا پیمانِ وفا
پر ملے دھوکے میں بھی ہم کو حقیقت کے مزے

آہ امیدِ حصولِ مرہمِ مقصود میں
لوٹے ہیں کیا کیا مرے دل نے جراحت کے مزے

واللہ دردِ محبت کا تن آسانوں کو کیا
جانتے ہیں اہلِ ہمت ہی مصیبت کے مزے

بحرِ الفت میں تھا طوفانِ شدائد کا خطر
سب بھلا دیتے تھے پر امیدِ راحت کے مزے

بے وفا یار ستم پیشہ اگر نکلا تو کیا
کم نہیں راہِ وفا میں استقامت کے مزے

جامِ وصلت سے نہیں کم مجھ سے حرماں دوست کو
یہ خمارِ نشۂ صہبائے الفت کے مزے

بوالہوس کو ہی مبارک وعدۂ الفت ترا
ہم اُٹھائینگے بس اب ایثار و غیرت کے مزے

جان دینگے اب تو قعرِ بحرِ ناکامی میں ہم
پائینگے گمنامیٔ مرقد میں شہرت کے مزے

چھٹ گئے امید کے پھندوں سے اب نیرنگ ہم
یاس نے ہم کو دئے عیش و مسرت کے مزے

بقیہ حاشیہ کمال صفحہ ۲۲۲:- ان خیالات نے خود بخود ہجوم کیا۔ گلیٹ ایک حسینہ پر عاشق ہے اُس حسینہ کے چچا کا جہاز کہیں دور سمندر میں ٹوٹ کر غرق ہو گیا ہے۔ یہ چچا ہی اس حسینہ کا سرپرست بلکہ بمنزلہ پدر ہے۔ وہ حسینہ اور اُس کا چچا وعدہ کرتے ہیں کہ جو کوئی اس شکستہ جہاز کے انجن کو سمندر سے نکال لائے اُس سے اس حسینہ کی شادی ہو۔ گلیٹ اس شرط کو منظور کرکے دو ماہ کی لاتعداد مصائب جھیل کر انجن کو تن تنہا نکال لاتا ہے۔ مگر اس اثنا میں وہ حسینہ اپنا دل ایک اور کو دے بیٹھی ہے۔ گلیٹ یہ دیکھکر اپنے ہاتھ سے اپنے رقیب کی شادی اس حسینہ سے کراکر خود سمندر میں ڈوب مرتا ہے +

گمنام نامور

نظر کر ذرا حالتِ بحر و بر پر
ہزاروں ہیں لولوئے شہوار ایسے
ہے آب اُن کی پر آبِ دریا میں پنہاں
عجائب ہیں نیرنگِ گلزارِ ہستی
ہر اک گل سے اچھے ہیں جو رنگ و بو میں
مگر ہیں وہ لوگوں کی نظروں سے پنہاں
پڑے بار بنکر گلے میں کسی کے
شمیم اُن کی محدود جنگل میں بھٹکی
عنادل تھے ایسے بہت اس چمن میں
جہانِ ادب جانِ اخلاق و حکمت
ہو فردوسی اُن کے گلستاں کا گلچیں
خیالات روشن لئے ساتھ اپنے
نہیں جانتا نام بھی ان کے کوئی
کسی وقت جاکر کرو غور ان میں
تو پاؤگے اُڑتے ہوئے ایسے ذرّے
اولوالعزم خوش فکر ہمدردِ ملّت
ملیں ہستیاں اُن کی یوں نیستی میں

محل ہے یہ عبرت کا اے دل سراسر
سمجھتے جنھیں لوگ بہتر سے بہتر
تہ سطحِ تاریک قعرِ سمندر
زمیں نے کھلائے ہیں پھول ایسے اکثر
لطافت ہو اُن کی کہ قدرت کا منظر
کھِلے اور وہیں گر پڑے خشک ہو کر
نہ لہرایا طرّہ ہے اُن کا سروں پر
یہاں تک کہ غالب ہوئی بادِ صرصر
نواسنجیوں میں نہیں جن کا ہمسر
وہ خوش گو فصاحت کو ہو ناز جن پر
پھڑکنے لگے آ سخن شعر سنکر
چھپے جاکے تاریک قبروں کے اندر
لحد ہو گئی ہے زمیں کے برابر
مقابر ہیں جو اگلے قبریوں کے باہر
ہیں جن میں نہاں فخرِ تیمور و بابر
رئیسوں کے سرتاج شاہوں کی افسر
سرابوں کو جیسے مٹاتی ہے صرصر

رام کہانی

پہلے ہم بچے تھے اک نادان تھے
بے تُولے تھے بے سر و سامان تھے

بچپنے کے ہاتھ سے مجبور تھے
رات دن کی کھیل میں مسرور تھے

پھر جوانی آئی تو آئی بہار
خوب دیکھی گردشِ لیل و نہار

بے سر و سامانیاں جاتی رہیں
اگلی آناکانیاں جاتی رہیں

ستیاں سوجھیں ہوس کی ہان لی
ٹھان لی جو کچھ کہ دل میں ٹھان لی

جس نے ٹوکا بے تکلف کہدیا
آخرت تو آئے دیکھا جائے گا!

ساقیا برخیز و در دہ جام را
خاک بر سر کن غمِ ایام را

علم سیکھا اور ہی کچھ ہو گئے!
رات کے جاگے ہوئے تھے سو گئے

پھر نہ جاگے عمر بھر خواری ہوئی!
قبر میں لیٹے تو بیداری ہوئی

ایسی بیداری سے سونا خوب تھا!
اور اس سونے پہ رونا خوب تھا

مردہاں را سر بسر در خواب دان
گشت بیدار آنکہ او رفت از جہاں

ایک ظاہر تھا نتیجا اور بھی
ایسے ویسوں نے اڑایا اور بھی

واہ کیا کہنے ہیں چہرا دیکھئے"
رحمتِ حق کا تماشا دیکھئے

اب تو ہر مسجد کے ممبر سج گئے!
اور کیا حضرت کے ڈنکے بج گئے!

اب کو کوشش سے یہ رتبہ ملا
لَیْسَ لِلْاِنْسَانِ اِلَّا مَا سَعٰی

رل گئی تقدیر بھی تدبیر سے
آدمی سونا بنا اکسیر سے

ماہر ہر علم حضرت ہی تو ہیں — ماحیِ تقلید و بدعت ہی تو ہیں
آپ کو سچوں میں سچا جانیئے — جانئے اچھوں کو اچھا جانئے

ایسی باتوں سے بڑھا کبر و غرور — بڑھتے بڑھتے پڑ گئے رستے سے دُور
پہلے رحمت تھے تو زحمت ہو گئے — خضر سے گمراہِ امّت ہو گئے
ہو گئے سرمستِ صہبائے خودی — بیخودی میں کچھ نہ سوجھی دُور کی
جب ہوائے نفس میں رہنے لگے — آدمی کو آدمی کہنے لگے
خود پرستی کی طرح غفلت بڑھی — خود کو بھولے غیر سے الفت بڑھی
کاش ہم دلدار پر رکھتے نظر — اعتمادے نیست بر علم و ہنر"

جب ہوئی اُس ابتدا کی انتہا — ہو گئی اِس انتہا کی ابتدا
انگلیاں اُٹھیں تماشا ہو گئے — چار سو عالم میں رُسوا ہو گئے
ایک نے بڑھ کر کہا حضرت یہ کیا؟ — آپ ہی ہیں ہادیِ امت یہ کیا؟
خود کو بھولے اور خودی میں آ گئے — منہ بھی یوں آئے کہ منہ کی کھا گئے
آپ اپنی ذات سے ماہر نہیں — بات جو مخفی ہے وہ ظاہر نہیں
مُولوی گشتی و آگاہ نیستی — خود کجا و از کجا و کیستی"
معرفت کیا چیز ہے فرمائیے؟ — آپ سمجھے ہیں تو کچھ سمجھائیے؟
ایں روا آں ناروا دانی تو نیک — تو روا یا ناروائی بیں تو نیک
تو ہمی دانی یجوز و لایجوز! — خود ندانی کہ حوری یا عجوز!

مرگ کے ظاہر نشاں ہونے لگے — تیر سے حضرت کمان ہونے لگے

پر نہ سمجھے آپ کو یہ کب ہوا! آپ کا کہنا مرا کہنا ہوا!
علم کے دنیا میں جھنڈے گڑ گئے پھر بھی تو لینے کے دینے پڑ گئے
"صد ہزاران علم دارد از علوم جانِ خود را خود ندانداین ظلوم"

داغ دو کھائے ہیں رونا ایک ہے آنکھ کا ہونا نہ ہونا ایک ہے
"اے بسا عالم ز دانش بے نصیب حافظ علم است آنکس نے حبیب"
ہائے سب منطق کا جھگڑا ہیچ ہے ہیچ ہے صغریٰ و کبریٰ ہیچ ہے
عمر در محمول و در موضوع رفت بے بصیرت عمر در مسموع رفت
زندگی صغرے ہے کبرے ہے ممات حدِ اوسط ہے عذابوں سے نجات
ہوگیا باقی نتیجہ "وصلِ دوست" "ہر دو عالم یک فروغِ روئے اوست"

"معرفت" کے لفظ نے سمجھا دیا اِک خودی گم ہو تو مل جائے خدا
گھر سے نکلو شکل دیکھو راہ کی معرفت ہے نفس سے اللہ کی
خود کو پہچانو تو اُس کو جان لو
مان لو اے آہ کہنا مان لو

ہمّت و تدبیر

ایک مناظرہ

تدبیر یہ ہمت سے لگی کہنے بہ تکرار میں صاحب خانہ ہوں تو ہے میری پرستار

ہمت نے کہا اُس سے کہ بیہودہ نہ جھک مار | حامی ہے خدا میرا نہ کر مجھ سے یہ گفتار

میں وہ ہوں کہ ہر ملک کو تسخیر کیا ہے

کی جس پہ نظر صاحبِ توقیر کیا ہے

انسانوں سے دنیا کا سفر میں نے کرایا | ہر منزلِ دشوار کو آسان بنایا

بخشا شہِ جمجاہ کا نادار کو پایا | کر کر کے غلاموں کو شہنشاہ دکھایا

مانند پرِ کاہ بہت کوہ ہیں کاٹے

میدانوں میں انبوہ کے انبوہ ہیں کاٹے

جا پوچھ کلکس سے روایت کہ میں کیا ہوں | پڑھ لارڈ کلائیو کی حکایت کہ میں کیا ہوں

یا حالِ نکلسن[1] سے ہدایت کہ میں کیا ہوں | اللہ[2] کی شاہد ہے حمایت کہ میں کیا ہوں

آنکھیں کھلیں گر مجھ کو بونا پارٹ[3] سے پوچھے

معلوم ہوئیں کیا ہوں جو لاکھارٹ[4] سے پوچھے

کیا شان ہے میری کوئی یونان سے پوچھے | روم و عرب و بربر و ایران سے پوچھے

رتبہ مرا تاتار سے توران سے پوچھے | ہاں میری حقیقت کوئی جاپان سے پوچھے

شاہانِ جہاں غیرتِ جمشید کئے ہیں

رستم سے بہت زندۂ جاوید کئے ہیں

چنگیز[5] بنی اور میں ایران میں پہنچی | نادر[6] ہوئی مغلوں کے شبستان میں پہنچی

واں فتح تھی جس جنگ کے میدان میں پہنچی | آزاد تھے قیدی جو میں زندان میں پہنچی

---

[1] جنرل جان نکلسن ۱۲ [2] ہمت کا حامی خدا مشہور ضرب المثل ہے ۱۲ [3] نپولین بوناپارٹ شہنشاہ فرانس ۱۲ [4] جنرل سر ولیم لاکھارٹ سابق سپہ سالار افواج ہندوستان و کمانڈر انچیف ۱۲ [5] مراد از چنگیز خان ۱۲ [6] مراد از نادر شاہ ۱۲ +

محمودؔ[1] کا بہروپ بھر اہند پہ آئی
اسکندرِ اعظم کو اُٹھا سندھ پہ لائی

نصرانیوں سے بیتِ مقدس کو چھڑایا | پس پا کئے عاجز کئے اور نیچا دکھایا
توحید کا ڈنکا بہ سرِ رزم بجایا | شُقّہ علم دینِ محمدؐ کا اُڑایا

کیا اپنی زباں سے کہوں جمہور سے سُن لے
بابر سے ہمایوں سے تیمور سے سُن لے

لونڈی مجھے اللہ کی شان آپ بتائیں | توہین کریں طعنے دیں صلواتیں سنائیں
احسان جو کئے ہیں ذرہ سب دل سے بھلائیں | اور درپئے تخریب ہوں در پردہ ستائیں

جو میں نہ یہاں ہوتی تو۔ تو چیز ہی کیا تھی
دنیا میں تجھے رہنے کی تمیز ہی کیا تھی

تدبیر رجز خوانیاں ہمت کی یہ سنکر | بولی کہ میں ہوں خادمہ تم ہو میری افسر
ارشاد جو تم نے کیا۔ ہو اس سے بھی برتر | سُن لیجئے پر عرض میری کان لگاکر

یہ مانا کہ دنیا میں ضرورت ہے تمہاری
پر ساتھ ہی رہتی ہے ہماری بھی سواری

کہئے تو سہی آپ کہاں پہنچیں اکیلی | حاضر نہ تھی خاتون کی کس جا یہ سہیلی
تنہا کوئی بن سیر کو مصیبت بھی ہے جھیلی | سمجھائیے اللہ شتابی یہ پہیلی

حائل ہوا جب ایلپسؔ[2] تو رہ کس نے بنائی؟
اس کوہ کی کس نے تھی چڑھائی وہ چڑھائی؟

---

[1] :- سلطان محمود غزنوی۔ [2] ایلپس اس دشوار اور برف پوش پہاڑ کا نام ہے جس پر سے فرانس کا مشہور عالی ہمت اور بلند حوصلہ شہنشاہ نپولین بونا پارٹ بحسن تدبیر معہ سامان جنگ گذر گیا تھا

ہر حال میں ساتھ آپ کو دمساز رہی ہوں | ہر مشورت خاص میں ہمراز رہی ہوں
دکھلاتی ہر اک کام میں اعجاز رہی ہوں | ہر معرکۂ جنگ میں جانباز رہی ہوں

آپ اکثر اوقات میں ناکام پھری ہیں
میدانوں سے ہم ہی ظفر انجام پھری ہیں

بوالفضل[لہ] کو میں نے کیا دستور معظم | اکبر[۲] کو ہر اک شخص کی نظروں میں مکرم
مجھ سے ہی کھلا رائت عزت کا پرچم | وکٹوریہ[۳] کو بخشا بڑا حصۂ عالم

شاہان زمانہ کو ہے آپس میں ملایا
سلطان[۴] کے اور زار[۵] کے جھگڑوں کو مٹایا

منچوریا کے قصے کو طے میں نے کیا ہے | اور مصر پہ دیکھو تو قدم میرا جما ہے
مشہور جہاں مجھ سے ہی بسمارک[۶] ہوا ہے | افریقہ میں بوتھا[۷] کو شرف میں نے دیا ہے

یورپ کی دول مجھ سے سرافراز ہوئی ہیں
سب قومیں غرض مجھ سے ہی ممتاز ہوئی ہیں

انگلینڈ میں مجھ کو گلڈسٹون[۸] سے پوچھو | بغداد میں جاکر وزرا ہارون سے پوچھو
منصور و واثق و مامون سے پوچھو | بقراط سے سقراط فلاطون سے پوچھو

مہمان جو ترے ہیں وہ مرے زلہ ربا ہیں
حاکم جو ترے ہیں وہ مرے در کے گدا ہیں

لہ شیخ ابوالفضل مشہور وزیر باتدبیر شہنشاہ اکبر ۱۲ ۲ہ شہنشاہ جلال الدین اکبر بانی دین الٰہی ۱۲ ۳ہ جنابہ ملکہ معظمہ (مرحومہ) قیصر الہند ۱۲ ۴ہ مراد از سلطان المعظم خلد اللہ ملکہم ۱۲ ۵ہ مراد از زار روس ۱۲ ۶ہ پرنس بسمارک دا انجہانی وزیر اعظم سلطنت جرمن ۱۲ ۷ہ جنرل بوتھا کمانڈر انچیف افواج ٹرانسوال ۱۲ ۸ہ مسٹر گلیڈسٹون وزیر اعظم سلطنت انگلشیہ ضرورت شعری کے لحاظ سے گلڈسٹون لکھا گیا ۱۲ +

دربار میں عزت ہے اگر کچھ تو مجھے ہے ۔۔۔ سرکار میں وقعت ہے اگر کچھ تو مجھے ہے
آفاق میں شہرت ہے اگر کچھ تو مجھے ہو ۔۔۔ دنیا میں لیاقت ہے اگر کچھ تو مجھے ہے

ہے کوئی اگر صاحب تمیز تو میں ہوں
دراصل ہے اکسیر کوئی چیز تو میں ہوں

چپ رہتی جو ہمت تو بھلا تاب کہاں تھی ۔۔۔ فرمایا کہ کیوں لاف سے آلودہ زباں کی
کیا اپنی صفت آپ ہی کرنے میں ہے خوبی ۔۔۔ ہے بات وہی جس میں نکالے نہ کوئی فی

اُٹھ عقل سے پوچھیں کہ بھلا کون بڑی ہے
ڈھیلی ہے تو ہے کونسی اور کون کڑی ہے

بی عقل۔ کہ پردہ سے یہ بحث تھیں سنتیں ۔۔۔ آسامنے کہنے لگیں دونوں گئی گذریں
لازم تھی یہی بات کہ تم ایکے سے رہتیں ۔۔۔ جب پھوٹ ہوئی دونوں ہی کچھ کر نہیں سکتیں

تدبیر نہ شامل ہو تو ہمت ہے۔ جہالت
ہمت کی نہ شرکت ہو تو تدبیر۔ حماقت

شمع

تیری طرح سے میں بھی ہوں ای شمع دردمند ۔۔۔ فریاد در گرہ صفتِ دانۂ سپند!
دی عشق نے حرارتِ سوز درون تجھے ۔۔۔ اور گل فروشِ اشکِ شفق گوں کیا مجھے
ہو شمع بزمِ عیش کہ شمع مزار تو ۔۔۔ ہر حال اشکِ غم سے رہی ہمکنار تو!
ان اشکباریوں میں طہارت کا راز ہے! ۔۔۔ کیسا وضو ہے یہ کہ سراپا نماز ہے!
یک بیں تری نظر صفتِ عاشقانِ راز ۔۔۔ میری نگاہ مایۂ آشوبِ امتیاز!

کعبے میں بت کدے میں ہے یکساں تری ضیا
میں امتیازِ دیر و حرم میں پھنسا ہوا!

ایذا پسند ہے دلِ اندوہگیں ترا!
کیا تجھ پہ رازِ غمکدۂ دہر کھل گیا!

ہے شان آہ کی ترے دودِ سیاہ میں
پوشیدہ کوئی دل ہے تری جلوہ گاہ میں

از مہر تا بہ ذرہ دل و دل ہے آئینہ
طوطی کو شش جہت سے مقابل ہے آئینہ

جلتی ہے تو کہ برقِ تجلی سے دور ہے
بے درد تیرے سوز کو سمجھے کہ نور ہے!

سمجھے کہ خامشی ہے مآلِ ضیائے شمع!
اے وائے گفتگوئے لبِ بے صدائے شمع

خورشید شب ہے جلوۂ ظلمت ربا ترا!
تجھ کو بھی ہے خبر کہ یہ ہے چاندنا ترا؟

تو جل رہی ہے اور تجھے کچھ خبر نہیں
وائے کہ بے قراری محشر اثر نہیں

ہیں جوشِ اضطراب سے سیماب وار بھی
آگاہِ اضطرابِ دلِ بے قرار بھی!

تھا یہ بھی کوئی ناز کسی بے نیاز کا
احساس دے دیا مجھے اپنے گداز کا

یہ آگہی مری مجھے رکھتی ہے بے قرار
خوابیدہ اس شرر میں ہیں آتشکدے ہزار

جلتی اسی شرار سے ہے شمعِ ماسوا
سامانِ طرزِ ظلمتِ شب ہے یہ چاندنا!

یہ امتیازِ رفعت و پستی اسی سے ہے!
خوشبو ہے گل میں بادہ میں مستی اسی سے ہے

بستان و بلبل و گل و بو ہے یہ آگہی
اصلِ نظارۂ من و تو ہے یہ آگہی۔

آزادِ دستبردِ بقا و فنا ہوں میں
کشتہ ہو یہ شرار تو کیا جانے کیا ہوں میں

صبحِ ازل جو حسن ہوا دلستانِ عشق
آوازِ کن ہوئی تپش آموزِ جانِ عشق

یہ حکم تھا کہ گلشنِ کن کی بہار دیکھ
ایک آنکھ لے کے خوابِ پریشاں ہزار دیکھ

مجھ سے خبر نہ پوچھ حجابِ وجود کی
شامِ فراقِ صبح تھی میری نمود کی!

وہ دن گئے کہ قید سے میں آشنا نہ تھا　　زیبِ درختِ طور مرا آشیانہ تھا!

قیدی ہوں اور قفس کو چمن جانتا ہوں میں!　　غربت کے غمکدے کو وطن جانتا ہوں میں!

جوں نے کمندِ نالۂ دل میں اسیر ہوں!　　فرقت میں نیستاں کی سراپا نفیر ہوں!

یادِ وطن فسردگی بے سبب بنی
شوقِ نظر کبھی کبھی ذوقِ طلب بنی

اے شمع حالِ قیدئ دامِ خیال دیکھ　　مسجودِ ساکنانِ فلک کا مآل دیکھ!

مضموں فراق کا ہوں ثریا نشاں ہوں میں　　آہنگِ طبعِ ناظمِ کون و مکاں ہوں میں!

باندھا مجھے جو اس نے تو چاہی مری نمود　　تحریر کر دیا سرِ دیوانِ ہست و بود!

گوہر کو مشتِ خاک میں رہنا پسند ہے!　　بندش اگرچہ سست ہے مضمون بلند ہے!

چشمِ غلط نگر کا یہ سارا قصور ہے　　عالم ظہورِ جلوۂ ذوقِ شعور ہے!

یہ سلسلہ زمان و مکاں کا کمند ہے　　طوقِ گلوئے حسنِ تماشا پسند ہے!

منزل کا اشتیاق ہے گم کردہ راہ ہوں　　اے شمع میں اسیرِ فریبِ نگاہ ہوں!

محمود اپنے آپ کو سمجھا ایاز ہے!　　کیا غفلت آفریں یہ مئے خانہ ساز ہے!

ڈر وا کہ وہم غیر میں ہوں ہو نہیں پھنسا ہوا!　　آذر خلیل ہے بتِ پندار کا ہوا!

صیاد آپ حلقۂ دامِ ستم بھی آپ!　　بامِ حرم بھی طائرِ بامِ حرم بھی آپ!

میں حسن ہوں کہ عشق سراپا گداز ہوں　　کھلتا نہیں کہ ناز ہوں میں یا نیاز ہوں

ہاں آشنائے لب ہو نہ رازِ کہن کہیں　　پھر چھڑ نہ جائے قصہ دار و رسن کہیں

دلِ خار زارِ کم نگہی میں الجھ نہ جائے
ڈرتا ہوں کوئی میرے فغاں کو سمجھ نہ جائے

جوگی

کل صبح کے مطلعِ تاباں سے جب عالم بقعۂ نور ہوا
سب چاند ستارے ماند ہوئے خورشید کا نور ظہور ہوا
مستانہ ہوائے گلشن تھی جانانہ ادائے گلبن تھی
ہر وادی وادیٔ ایمن تھی ہر کوہ پہ جلوۂ طور ہوا
جب بادِ صبا مضراب بنی ہر شاخِ نہال رباب بنی
شمشاد و چنار ستار بنے ہر سرو و سمن طنبور ہوا
سب طائر مل کر گانے لگے عرفاں کی تانیں اڑانے لگے
اشجار بھی وجد میں آنے لگے دلکش وہ سماعِ طیور ہوا
سبزے نے بساط بچھائی تھی اور بزمِ سرور سجائی تھی
بن میں گلشن میں آنگن میں فرشِ سنجاب و سمور ہوا
تھا دلکش منظرِ دشت و جبل اور چالِ صبا کی مستانہ
اس حال میں ایک پہاڑی پر جا نکلا ناظمؔ دیوانہ

چیلوں نے جھنڈے گاڑے تھے پربت پر چھاؤنی چھائی تھی
تھے خیمے ڈیرے بادل کے کہرے نے قنات لگائی تھی
یہاں برف کے تودے گلتے تھے چاندی کے فوارے چلتے تھے
چشمے سیماب اگلتے تھے نالوں نے دھوم مچائی تھی
یہاں قلۂ کوہ پہ رہتا تھا اک مست قلندر بیراگی

تھی راکھ جٹوں میں جوگی کی اور انگ بھبوت رمائی تھی
تھا راکھ کا جوگی کا بستر اور راکھ کا پیراہن تن پر
تھی ایک لنگوٹی زیب کمر جو گھٹنوں تک لٹکائی تھی
سب خلق خدا سے بیگانہ وہ مست قلندر دیوانہ
بیٹھا تھا جوگی مستانہ آنکھوں میں مستی چھائی تھی۔
جوگی سے آنکھیں چار ہوئیں اور جھک کر ہم نے سلام کیا
تب آنکھ اُٹھا کر ناظر سے یوں بن باسی نے کلام کیا
کیوں بابا ناحق جوگی کو تم کس لئے آکے ستاتے ہو
ہم پنکھ پکھیرو بن باسی تم جال میں آن پھنساتے ہو
کوئی جھگڑا دال چپاتی کا کوئی دعوے گھوڑے ہاتھی کا
کوئی شکوہ سنگی ساتھی کا تم ہم کو سنانے آتے ہو
ہم حرص و ہوا کو چھوڑ چکے اس نگری سے منہہ موڑ چکے
ہم جو زنجیریں توڑ چکے تم لا کے وہی پہناتے ہو
تم پوجا کرتے ہو دھن کی ہم سیوا کرتے ہیں ساجن کی
ہم جوت جگاتے ہیں من کی تم اُس کو آکے بجھاتے ہو
سنسار سے یہاں مکھ پھیرا ہے من میں ساجن کا ڈیرا ہے
یہاں آنکھ لڑائی ہے پیتم سے تم کس سے آنکھ ملاتے ہو
اُس مست قلندر جوگی نے جب ناظر کو یہ عتاب کیا
کچھ دیر تو ہم خاموش رہے پھر جوگی سے یہ خطاب کیا
ہیں ہم پردیسی سیلانی مت ناحق طیش میں آ جوگی
ہم آئے تھے تیرے درشن کو چتون پر میل نہ لا جوگی

آبادی سے منہ پھیرا کیوں پربت میں کیا ہے ڈیرا کیوں
ہر محفل میں ہر منزل میں ہر دل میں ہے نورِ خدا جوگی

کیا مسجد میں کیا مندر میں سب جلوہ ہے وجہ اللہ کا
پربت میں نگر میں ساگر میں ہر اُترا ہے ہر جا جوگی

جی شہر میں خوب بہلتا ہے وہاں حسن پہ عشق مچلتا ہے
وہاں پریم کا ساغر چلتا ہے چل دل کی پیاس بجھا جوگی

وہاں دل کا غنچہ کھلتا ہے ہر رنگ میں موہن ملتا ہے
چل شہر میں سنکھ بجا جوگی بازار میں دھونی رما جوگی

اِن چکنی چپڑی باتوں سے مت جوگی کو پھسلا بابا
جو آگ بجھائی جتنوں سے پھر اُس پہ نہ تیل گرا بابا

ہے شہروں میں غل شور بہت اور حرص و ہوا کا زور بہت
بستے ہیں نگر میں چور بہت سادھوں کی ہے بن میں جا بابا

ہے شہر میں شورشِ نفسانی جنگل میں ہے جلوہ روحانی
ہے نگری ڈگری کثرت کی بن وحدت کا دریا بابا

ہم جنگل کے پھل کھاتے ہیں چشموں سے پیاس بجھاتے ہیں
راجا کے نہ دوارے جاتے ہیں پرجا کی نہیں پروا بابا

سر پر آکاس کا منڈل ہے دھرتی پہ سہانی مخمل ہے
دن کو سورج کی محفل ہے شب کو تاروں کی سبھا بابا

جب جھوم کے یہاں گھن آتے ہیں مستی کا رنگ جماتے ہیں
چشمے طنبور بجاتے ہیں گاتی ہے ملار ہوا بابا

یاں پنچھی مل کر گاتے ہیں پیتم کے سندیس سناتے ہیں

یاں رُوپ انوپ دکھاتے ہیں پھل پھول اور برگ گیا بابا

ہے پیٹ کا ہر دم دھیان تمہیں اور یاد نہیں بھگوان تمہیں

سِل پتھر اینٹ مکان تمہیں دیتے ہیں سکھی سے چھڑا بابا

تن من کو دھن میں لگاتے ہو ہیتم کو دل سے بھلاتے ہو

ماٹی میں لعل گنواتے ہو تم بندۂ حرص و ہوا بابا

دھن دولت آنی جانی ہے یہ دنیا رام کہانی ہے

یہ عالم عالمِ فانی ہے باقی ہے ذاتِ خدا بابا

خوابِ راحت

پھول ہی پھول اس پہ برساؤ آنکھ سے اشکِ خون نہ ٹپکاؤ

پھول ہی پھول اس پہ برساؤ ذکرِ گور و کفن کا مت لاؤ

خوابِ راحت میں یہ تو سوتی ہے نیند یہ کب نصیب ہوتی ہے

جب زلیخا نے اس کا حظ پایا خوابِ یوسف میں پھر نہ لطف آیا

کاش مجھ کو بھی چین یوں ملجائے

دلِ بیتاب کو سکوں ملجائے

اس سے اہلِ نشاط خواہاں تھے ہر گھڑی خندہ و تبسم کے

اس نے ہنس ہنس کے انکو شاد کیا نامرادوں کو بامراد کیا

اس نے پھولوں کے کر دئے انبار اس نے دنیا کو کر دیا گلزار

خستہ دِل تھی مگر یہ بیچاری زندگی سے بہت تھکی ہاری

سو گئی ہے جواب یہ زار و نزار
ہو گئے سب کنارہ کش یکبار

عمر سب صرف پیچ و تاب رہی — ہائے کیا زندگی خراب رہی
دل میں ایک کش مکش مدام رہی — ایک چکر میں صبح و شام رہی
اس سے غافل طرب پرست رہے — خندۂ ظاہری پہ مست رہے
ماندۂ رنج راہ ہستی تھی — عافیت کو سدا ترستی تھی

اب یہ آغوشِ عافیت میں ہے
عافیت خوب عاقبت میں ہے

طائرِ روح آسماں پرواز — کس طرح لائے تاب قیدِ دراز
(قفس تنگ ہے بلا ہوتا — سانس گھٹتا ہے دم خفا ہوتا)
چھوڑ کر جسم کو روانہ ہوا — اور مرض کا تو اک بہانہ ہوا
قیدِ غم سے ہوئی ہے یہ آزاد — وسعتِ عالم بقا میں شاد

خلد میں اب یہ راج کرتی ہے
خلق یاد اس کو آج کرتی ہے

جلوۂ دربار

(تصور کی آنکھ سے)

سر میں شوق کا سودا دیکھا — دہلی کو ہم نے بھی جا دیکھا
جو کچھ دیکھا اچھا دیکھا — کیا بتلائیں کیا کیا دیکھا
تعلم ہے مجھ کو بادۂ صافی — شغل یہی ہے دل کو کافی

مانگتا ہوں یاروں سے معافی — خیراب دیکھئے لطف قوافی

جمناجی کے پاٹ کو دیکھا — اچھے ستھرے گھاٹ کو دیکھا

سب سے اونچے لاٹ کو دیکھا — حضرت ڈیوک کناٹ کو دیکھا

پلٹن اور رسالے دیکھے — گورے دیکھے کالے دیکھے

سنگینیں اور بھالے دیکھے — بینڈ بجانے والے دیکھے

خیموں کا اک جنگل دیکھا — اس جنگل میں منگل دیکھا

برھما اور ورنگل دیکھا — عزّت خواہوں کا دنگل دیکھا

سڑکیں تھیں ہر کمپ سے جاری — پانی تھا ہر پمپ سے جاری

نور کی موجیں لمپ سے جاری — تیزی تھی ہر جمپ سے جاری

کچھ چہروں پر مردی دیکھی — کچھ چہروں پہ زردی دیکھی

اچھی خاصی سردی دیکھی — محفل میں سارنگی دیکھی

بیرنگی بارنگی دیکھی — دہر کی رنگا رنگی دیکھی

اچھے اچھوں کو بھٹکا دیکھا — بھیڑ میں کھاتے جھٹکا دیکھا

موبنہہ کو اگرچہ لٹکا دیکھا — دل دربار سے اٹکا دیکھا

ہاتھی دیکھے بھاری بھر کم — انکا چلنا کم کم تھم تھم

زرّیں جھولیں نور کا عالم — میلوں تک وہ چم چم چم چم

پُر تھا پہلوے مسجد جامع — روشنیاں تھیں ہر سو لامع

کوئی نہیں تھا کسی کا سامع — سب کے سب تھے دید کے طامع

سرخی سڑک پہ کٹتی دیکھی — سانس بھی بھیڑ میں گھٹتی دیکھی

آتشبازی چھٹتی دیکھی — لطف کی دولت لٹتی دیکھی

چوکی اک چولکھی دیکھی — خوب ہی چکھی پکھی دیکھی

ہر سو نعمت رکھی دیکھی ‏ شہد اور دودھ کی بہتی دیکھی
ایک کا حصّہ من و سلوا ‏ ایک کا حصّہ تھوڑا سا حلوا
ایک کا حصّہ بھیڑ اور بلوا ‏ میرا حصّہ دور کا جلوا
اوج برٹش راج کا دیکھا ‏ پرتو تخت و تاج کا دیکھا
رنگ زمانہ آج کا دیکھا ‏ رخ کرزن مہراج کا دیکھا
پہنچے پھاند کے سات سمندر ‏ تحت میں انکے بیسوں بندر[له]
حکمت و دانش ان کے اندر ‏ اپنی جگہ ہر ایک سکندر
اوج بخت ملاقی ان کا ‏ چرخ ہفت طباقی ان کا
محفل ان کی ساقی ان کا ‏ آنکھیں میری - باقی ان کا
ہم تو ان کے خیر طلب ہیں ‏ ہم کیا ایسے ہی سب کے سب ہیں
ان کے راج کے عمدہ ڈھب ہیں ‏ سب سامان عیش و طرب ہیں
اگزبشن کی شان انوکھی ‏ ہر شے عمدہ ہر شے چوکھی
اقلیدس کی ناپی جوکھی ‏ من بھر سونے کی لاگت سوکھی
جشن عظیم اس سال ہوا ہے ‏ شاہی فورٹ میں بال ہوا ہے
روشن ہر اک ہال ہوا ہے ‏ قصّہ ماضی حال ہوا ہے
ہے مشہور کوچہ و برزن ‏ بال میں ناچیں لیڈی کرزن
طائر ہوش تھے سب کے پرزن ‏ رشک سے دیکھ رہی تھی ہر زن
ہال میں چمکیں آ کے یکایک ‏ زریں تھی پوشاک چھکا چھک
محو تھا ان کا اوج سما تک ‏ چرخ پہ زہرہ ان کی تھی گاہک
گو رقاصہ اوج فلک تھی ‏ اس میں کہاں یہ نوک پلک تھی
اندر کی محفل کی جھلک تھی ‏ بزم عشرت صبح تلک تھی

له [illegible] ۱۱۰۵

کی ہے بندش ذہنِ رسا نے کوئی مانے خواہ نہ مانے
سُنتے ہیں ہم تو یہ افسانے جس نے دیکھا ہو وہ جانے

خوابِ ناز

اے شبِ ماہتاب کے تارو فلک نیلگوں کے سیّارو
فروِ نیلوفری میں منہ کو چھپاؤ غرق دریائے نیل ہو جاؤ
خوب ہے خوب ہے تمہارا لباس پھر بھڑک اُس کی رکھو اپنے پاس
پیلی آنکھیں نہ ہم کو دکھاؤ بہت شمع سحری! نہ ٹمٹماؤ بہت

میرا معشوق خوابِ ناز میں ہے

تجھ سے کہتا ہوں! ماہتاب بہار! کس لئے کھو رہا ہے اپنا وقار
کیوں نہ ہو غرق بحر تاریکی چاندنی پڑ گئی بُری پھیکی
آن بان اور چمک دمک نہ دکھا اب بھی آمان لے ہمارا کہا
کوئی دم میں ترا اُترا ہی نور ہُوا جاتا ہے دیکھ کے کافر
رنگ فق حال ہے خراب تیرا ہے لبِ بامِ آفتاب تیرا
کوہ مغرب سے تاکتا کیا ہے پسِ دیوار جھانکتا کیا ہے

میرا معشوق خوابِ ناز میں ہے

اے صبائے بہار کے جھونکو اے شبِ مشکبار کے جھونکو
اس قدر شوخیاں نہیں اچھی ایسی بے تابیاں نہیں اچھی
بیٹھو اس کنجِ عشق پیچاں میں سنبل و بید مشک و ریحاں میں

اپنے پیر لو سمیٹ نہ مارو دم
ہلا نہیؔا تو سر کرونگا قلم

ہؤا بینکا گر اُس کی زلف کا بال
سارا بَل میں تمہارا دونگا نکال

میرا معشوق خوابِ ناز میں ہے

خوابہائے شبِ بہار! سنو
عرض کرتا ہے دلفگار سنو

لِلہ اتنا کرو ہمارا کام
کان میں اس کے دو یہ جا کے پیام

غیرتِ حسنِ ماہ و مایۂ ناز
تیری ہر بات میں نیا انداز

تو کرے خوابِ ناز میں آرام
منتظر تیرا صادقِ ناکام

شب گذاری ہے آہ و زاری میں
تیرے بالیں کی پہرہ داری میں

جاں بلب ہے تمہارے خستہ جگر
ہے زبان پر مگر یہ مصرعِ تر

میرا معشوق خوابِ ناز میں ہے

خار

تو سمجھتا ہے کہ اس باغ میں بیکار ہوں میں؟
محض بیکار ہی کیا موجبِ آزار ہوں میں؟

تو نے دیکھا ہے مجھے دیدۂ عبرت سے کبھی؟
قدر پوچھی ہے مری اہلِ بصیرت سے کبھی؟

سلکِ ہستی میں کوئی شئے کہیں بے سود بھی ہے؟
جلوۂ حسن کسی چیز میں محدود بھی ہے؟

کلکِ قدرت نے لکھی ہے کوئی شئے بے مطلب؟
اس مسدّس[لہ] میں کوئی لفظ بھی ہے بے مطلب؟

نورِ خورشید کا ہر ذرّے میں ہے راز چھپا
موجِ دریا کا ہے ہر قطرے میں انداز چھپا

ایک قانون کی تابع ہیں شجر ہو کہ حجر
ایک سانچے میں ڈھلے ہیں کُرۂ خاک و قمر

تو گُل و خار میں کرتا ہے تمیز ان قائم
دیکھ اُس آئین کو جس سے ہیں یہ چیزیں قائم

لہ ستہ یا بیت ۱۲

کس جگہ حسن کے آئین کا اظہار نہیں؟ — گل ہی گل باغ جہاں میں ہے کہیں خار نہیں

کیا چشم مشاہد کی ہو کوتہ نظری! — جس سے مستور رہے حسن کی ہو جلوہ گری

دیکھئے حسن تناسب کا نمونہ ہوں میں! — کیا دلاویز ہوں کیا شوخ نکیلا ہوں میں

ہے دل افروز میری نوکِ سناں کی سی جھلک — میری تشبیہ پہ اترائی حسینوں کی پلک

رنگ ہر شاخ پہ پاؤ گے نرالا میرا — روپ ہر نخل پہ دیکھو گے انوکھا میرا

نگہِ حسن طلب دیکھے تو رعنا ہوں میں — دل میں ہر رنگ میں ہر روپ میں کھبتا ہوں نہیں

رونق افروز ہے گل باغ میں زینت کے لئے — میں چمن زاد میں ہوں گل کی حفاظت کیلئے

دامن اہلِ تطاول میں اٹک جاتا ہوں — دیدۂ حاسدِ گلچیں میں کھٹک جاتا ہوں

نہیں آزار دہی خلق کی شیوہ میرا — پھر بھی گلچین کی مدارات ہے عہدہ میرا

توڑ لینا گل تر کا کوئی انسانی ہے؟ — باغ میں یوں ہی تباہی کی ہوا آنی ہے

گل کو وہ اپنی غرض کیلئے برباد کرے — کیوں نہ بندہ عملِ نشترِ فصاد کرے؟

راہ روسے نہیں صحرا میں کبھی مجھ کو خلش — ہاں اگر بھائی اسے آپ ہی غفلت کی روش

خود ہی مجھ خاک نشیں کو وہ کچل ڈالے اگر — تو کبھی اس کو بتاتا ہوں سلامت کی ڈگر

سینکڑوں مور و ملخ وہ تو کچل دیتا ہے — یونہی چٹکی سی کبھی بندہ بھی لے لیتا ہے

اس سے ہے نیند سے رہرو کو جگانا مقصود — قدر ہے خاک نشینوں کی بتانا مقصود

اس سے کیا بڑھ کر کروں کام میں انسانوں کا؟ — میں نگہبان ہوں کھیتوں کا خیابانوں کا

یوں میری قدر کو جانے کہ نہ جانے کوئی
میرے احسان کو ملے کہ نہ مانے کوئی

داغِ جگر

اے انقلابِ عالمِ فانی ہزار حیف
اے اعتبارِ فصلِ جوانی ہزار حیف

باقی رہے ہیں سینہ میں اب تک دل و جگر
اے تابِ ضبطِ سوزِ نہانی ہزار حیف

یہ کیا ہُوا کہ خشک ہیں دامان و آستین
اے ذوق و شوقِ اشک فشانی ہزار حیف

ہے آمد و شُدِ نفسِ تنگ دل خراش
اس پر یہ سنگِ غم کی گرانی ہزار حیف

کیا ہوگئی وہ لذّتِ تقریر کیا ہُوا
کیا ہوگئی وہ سحر بیانی ہزار حیف

دیتا ہے کون دادِ ستمہائے آسماں
سُنتا ہے کون غم کی کہانی ہزار حیف

اندازِ دلفریبیٔ دنیا ہزار تُف
ارمانِ عیش و لذّتِ فانی ہزار حیف

اے آرزوئے عالمِ اسباب صد دریغ
اے حرصِ تخت و تاج کیانی ہزار حیف

اُمید دار کان صدائے درا کے ہیں
دُنیا کے رہنے والے مسافر سرا کے ہیں

شورِ فغاں میں جو اثرِ نفخِ صُور تھا
تھا تیرا روزِ مرگ کہ یوم النشور تھا

جب یہ سُنا کہ آج زمانہ میں تم نہیں
دل میں نہ تھا سرور نہ آنکھوں میں نور تھا

رہتے تھے میرے گھر میں جو ذرات روشنی
اے شمعِ حسن سب پہ تمہارا ظہور تھا

ثابت ہُوا وہ شب تھی تمہاری شبِ وفات
جس رات بیقرار دلِ ناصبور تھا

ہنگامِ نزع حسرتِ دیدار رہ گئی
مجبور تھا کہ تم سے میں کمبخت دور تھا

مشتاق رہ گیا ہے غریب الوطن پدر
اکبار اُس کو شکل دکھانا ضرور تھا

ہوجائیگا شمار مرے دل کے داغ سے
جو عمر میں حساب سنین تھا

اے شمع صبح تک تیری رونق کہاں رہی
اس ہستیٔ قلیل پہ کتنا غرور تھا

دنیا کا لطف تیری جدائی میں کچھ نہیں
جب تو نہیں تو ساری خدائی میں کچھ نہیں

دم توڑو تم اور آنکھ سے دیکھا کرے کوئی
پتھر کا کس طرح سے کلیجا کرے کوئی

جب تم بھی آنکھ پھیر لو ناشاد باپ سے
پھر یہ بتاؤ کس کا بھروسا کرے کوئی

ہے زندگی میں موت کا دھڑکا لگا ہوا
کیا قدرِ دلفریبیٔ دنیا کرے کوئی

نازک مزاج تم سا جو مل جائے خاک میں
پھر خاک زندگی کی تمنا کرے کوئی

آنکھیں میری ہیں کیوں نہ میں رؤں کسی کو کیا
کیوں مجھ سے ضبطِ غم کا تقاضا کرے کوئی

کیوں مجھ کو صبر کی ہو ہدایت میں کیوں سنوں
کیوں میرے اضطراب کو روکا کرے کوئی

مجھ کو نہیں تحملِ احسانِ چارہ ساز
کیوں میرے دردِ دل کا مداوا کرے کوئی

تاخیر کیوں نزولِ بلا میں ہے کیا ہوا
اب کب تک آسمان کو دیکھا کرے کوئی

ممکن نہ تھا یہ جبر کبھی اختیار میں
پر دخل کیا مشیتِ پروردگار میں

جز مرگ اب تو دل میں کوئی آرزو نہیں
افسوس ہم جہان میں ہیں اور تو نہیں

میں مر ہی جاؤنگا جو لگے گی ذرا ہی ٹھیس
اے چارہ گر خدا کے لئے زخم چھو نہیں

کیا تھی خبر قضا کا فرشتہ ہے گھات میں
ہم جانتے تھے کوئی تمہارا عدو نہیں

پاؤں پہ گر کے کرتے سفارش عدو سے ہم
پر کیا کریں کہ اُس میں مروت کی خو نہیں

کیا ڈھونڈتے ہیں اشک جو بہتے ہیں خاک میں
یہ بھی کہو گئے تم کہ میری جستجو نہیں

کیسی ہوا چلی ہے گلستانِ دہر میں
پھولوں کو سونگھئے تو محبت کی بو نہیں

دیوانہ ہو گئے ہیں یہ کمبخت چارہ ساز
میرے جگر کے زخم میں جائے رفو نہیں

گردش نے آسماں کی ملایا ہے خاک میں
پھر کیونکر اس کو دورِ پیہم تفو نہیں

پہلو میں لیکے میری عبادت گذار کو

کیا آج ناز ہوگا زمینِ مزار کو

کیونکر بسر ہو زیست کہ چارا نہیں رہا — جب تم نہیں تو کوئی ہمارا نہیں رہا

ہو کے وطن میں جا کے کبھی دید و باز دید — اتنا بھی اب تو ہم کو سہارا نہیں رہا

چمکیں فلک پہ روز ستارے تو کیا غرض — جب تو ہمارے آنکھ کا تارا نہیں رہا

چھائی ہوئی ہے بزمِ جہاں پر فسردگی — آخر یہ کون انجمن آرا نہیں رہا

سر کیا کروں کہ سر میں وہ سودا کہاں ہے اب — دل کیا کروں کہ اب وہ دلِ آرا نہیں رہا

غنچے فسردہ ہوتے ہیں بادِ سموم سے — باغِ جہاں میں اب وہ نظارہ نہیں رہا

دنیا اگر ہو محوِ تواضع تو کیا خوشی — لے تیرے لطفِ لطف و مدارا نہیں رہا

اللہ تو مجھے بھی اُٹھا لے تو خوب ہے — اب مجھ میں غم اُٹھانے کا یارا نہیں رہا

ہے ہے ابھی جہاں سے گذرنے کے دن نہ تھے
یہ کھیلنے کی فصل تھی مرنے کے دن نہ تھے

تاریک ہو گیا ہے زمانہ نگاہ میں — یا رب ہے کس بلا کا اثر دودِ آہ میں

اے حاملانِ میتِ معصومہ دیکھنا — آنکھوں کا فرش ہم نے بچھایا ہے راہ میں

آخر ہوا عروج جوانی پیامِ مرگ — نقصان ہے کمال جو پیدا ہو ماہ میں

اے روشنیٔ داغِ جگر تو نے کیا کیا — دھبہ لگا دیا مرے روزِ سیاہ میں

کنجِ مزار میں تمہیں کس طرح چین آئے — راحت کہاں ملی مہ کنعاں کو چاہ میں

اہلِ عزا کا کس نے کلیجا ہلا دیا — کیسا اثر تھا اشھد ان لا الٰہ میں

احسنؔ و فورِ گریہ نے عصیاں کو دھو دیا — کچھ بھی نہیں رہا ہے مری فردِ گناہ میں

عہدِ وفا کو اہلِ مروت نہ توڑتے — رخنہ اجل نے ڈال دیا ہے نباہ میں

آلودہ گو کہ خاک میں جسمِ نفیس ہے
تربت قریبِ قبرِ جنابِ نفیسؔ ہے

بس اے ہجومِ حسرت و غم آہ الغیاث — باقی نہیں ہے چشم میں نم آہ الغیاث
گر بیٹھنے کا قصد کروں بیٹھ جائے دل — اُٹھنے میں کانپتے ہیں قدم آہ الغیاث
بے راحلہ یہ سخت سفر اور یہ بے کسی — ہے ہے مسافرانِ عدم آہ الغیاث
اہلِ وفا میں طرزِ تغافل ہزار حیف — اہلِ کرم میں شیوۂ رم آہ الغیاث
بیتابی و طپش قلق و اضطراب و درد — اک جانِ ناتوان پہ ستم آہ الغیاث
تم کو جوان ہو نہیں پہلے ہی موت آئی — زندہ رہے جہان میں ہم آہ الغیاث
حورین شریکِ ماتمِ مرگِ جوان ہیں آج — کہتے ہیں اہلِ خلد بہم آہ الغیاث
اے یادگارِ احسنِ خستہ جگر دریغ — اے وجہِ حسرتِ آب وام آہ الغیاث

افراطِ حزن مانعِ آرام و خواب ہے
احسن بھی اب مسافرِ پا در رکاب ہے

مشرقی ادب کا پژمردہ باغ

تباہ حال ہے ہندوستاں میں لٹریچر — بہار کا نہیں پاتے ہیں اس چمن میں گذر
پڑے اجاڑ ہیں جو تھے ہرے بھرے گلشن — ہوا نے جڑ سے اکھاڑے جو تھے قدیم شجر
ہیں بلبلوں کی جگہ چند تتلیاں اُڑتیں — نسیم صبح کے گھر میں ہے چل رہی صرصر
ہیں نونہالِ چمن علم سے بھلے پھولے — مگر مٹھاس کا پاتے نہیں پھلوں میں اثر
ہر ایک باغ میں ہے اک نئی ہوا چلتی — چمن میں پھول ہیں لیکن بہار ہے باہر
نہ ہندوؤں میں نظر آئے بالمیک کوئی — نہ ہم میں ہیں متنبی و فیضی و جعفر
نہیں ہے ایک بھی تلسی کا مثل بھاشا میں — نہ پارسی میں ہے خسرو کا دوسرا ہمسر

انیس و غالب مرحوم کی جگہ کوئی
نکل سکے نہ صد افسوس! اُردو زبان آور

ہے سنسکرت نانی میں بان بانو کی
مگر ہے اب تو وہ بیکنٹھ باش سرتاسر

اُسی کی بیٹی نے مارا ہے اسکو گر دیکھو
ہوئی ہے مار کے بھاشا اُسے زبان آور

نہ ہم کو نحو و عروضِ سخن میں جانکاہی
نہ ہندوؤں کو توجہ نیائے و پنگل پر

نہ بولتے ہیں پپیہے صدائے دلکش سے
نہ قمریوں کے ترانوں میں وجد کا ہی اثر

کنول کے پھول کھلے ہیں مگر ہیں پژمردہ
کھڑا ہے حوض میں لیکن فسردہ نیلوفر

ہزار طرح کے پھل ہیں مگر مٹھاس نہیں
ہزار طرح کے گل ہیں مگر نہیں گلِ تر

ہے بالمیک کی تصنیف قالبِ بیجاں
نہ پہنچے بام پہ اُس کے کمندِ اہلِ نظر

مصنفین میں بھاشا کے ہیں جو تلسی داس
ورق طلا کے ہیں اُن کی لکھے ہوئے پتر

مگر ہیں اس میں بھی جو استعارہ ہائے ادب
وہ میل کھائیں نہ انگلش مذاق سے یکسر

ادب نے پہلے تھا وابستہ دھرم کرم یہاں
نہ پاس آنے دی اس کو جدید لٹریچر

گریجوایٹ جو نکلے ہیں نیو فیشن کے
دلوں میں اُن کے نہیں اُس مذاق کا ہی اثر

جو نغمہ سنجِ طرب تھیں وہ اُڑ گئیں چڑیاں
جو نکتہ دانِ ادب تھے وہ اُڑ گئے طائر

زباں میں حس ہی نہیں ہے تو ذائقہ کیسا
نہیں مشام تو پھر کیا شمامۂ عنبر

چمن وہی ہے مگر بلبلیں نہیں ویسی
پنچے پڑی ہیں کہیں کیاریوں میں انکی پر

اثر نہ پوت میں موتی کا ہو سکے پیدا
نہ پائیں لوہے میں فولاد کی کبھی جوہر

ہر ایک چوب نہ تاثیر میں بنے صندل
ہر ایک پھول میں آئے گلاب کا نہ اثر

دل و دماغ نہ باقی رہے ہوں جب اگلے
تو اُن سے کام بتاؤ وہ ہو سکے کیونکر

جو پہلے فضل و ادب کے تھے مقصدِ اعلیٰ
وہ اب ہیں خانہ بر اندازِ صاحبانِ ہنر

نہ سلطنت کو ہمارے ادب کی کچھ پروا
نہ سلطنت کی صداؤں کی ہم سخن گستر

نہ کچھ خدا سے علاقہ نہ دیوی۔ دیوتا سے
نہ آج کام کے اوتار ہیں۔ نہ پیغمبر

نہ راج نیتی میں اپنی زباں کا کچھ حصّہ
نہ ہم فرائض لے علےٰ میں صاحبِ دفتر

نہ شمعِ حسنِ ازل سے لگی ہماری لو
نہ ہیں مناظرِ حسن کمال پیشِ نظر

اُردُو

میں اب دکھاتا ہوں اُردو کی حالتیں تم کو
جو عام طور سے دیکھے ہر ایک اہلِ نظر

ہے ہندوؤں کیلئے کنیاں یہ کلجگ کی
ہماری قوم کو دوشیزہ حالِ محشر

اصولِ السنہ اسپر ہیں حجتِ ناطق
کہ اس زباں کے نہ ہو دوسری زباں ہمسر

حروف سب سے زیادہ ملے ہیں اُردو کو
نہیں کثیر ہے الفاظ نسبتہً اکثر

زیادہ لفظوں سے جملے زیادہ ہوں پیدا
اُسیقدر ہوں تکلم میں وسعتیں ظاہر

ہر ایک بیج ہے اس کی زمیں میں کھپ جاتا
ہر ایک تخم ہو نشو و نما سے بار آور

جو دیکھیے عربی سنسکرت بھاشا کو
تو اُن کو غیر کی صحبت سے پائیگا حذر

مگر نہیں اسے کچھ دوش ان کے ملنے سے
نہ یہ تعصبِ مذہب کی عادتا خوگر

جو کام سہل ہے اس کو وہ غیر کو مشکل
جو کام غیر کو آساں وہ اس کو آساں تر

نہ ایک نثر ہی مجموعۂ تکلم ہے
ہے جامعِ سخنِ عام نظم کا دفتر

بڑے بڑے ادبا اس کے ناقلِ معنے
بڑے بڑے حکما اس کے قائلِ جوہر

ذرا بتاؤ تو ہندی میں لکھ کے دکھیں تو
ہوں کلیات میں جس سے یہ وسعتیں مضمر

نہ ایک جملہ سے پیدا ہوں اس قدر معنی
نہ یوں تلفظِ الفاظ ہو سخن گستر

عرب کے لفظ عجم کے زبان کی یہ چال
زبان انگلش و بھاشا کی ناقلِ دفتر

نہ لکھ سکیں اسے اہلِ مقدمہ ایسا
نہ پڑھ سکیں اسے اہلِ معاملہ فر فر

یہی زبان ہے زمانے کے ساتھ چل سکتی
نہیں ہے جس میں تعصب کا نام کو عنصر

نہیں ہے واسطہ خاص اس کو مذہب سے — نہ ایک مذہب و ملت کی یہ ہوئی خوگر
کوئی زبان نہیں اس کے سوا یہاں ایسی — جو سب زبانوں میں ملجائے جیسے شیر و شکر
ہیں اس کے پیٹ میں سرگن کے سارے گن پیدا — اگرچہ ہو نہ یہ نرگن کی آشنا یکسر
یہی زبان ہے انگلش کے ساتھ چل سکتی — اسی زبان میں ہو ہر زباں سخن پرور
سوائے اس کے علوم و فنونِ انگلش کا — کوئی زباں نہ کرے اس سے ترجمہ بہتر
غضب ہے ملک اگر اتنہری! نہ قدر کرے — کرے گا ظلم جو اس پر وہ ہے ستم خود پر

تصویرِ صبح

بخشا فلک کو مہر نے خلعت جو نور کا — مژدہ دیا افق نے سحر کے ظہور کا
مٹنے لگا جو داغ نظر کے قصور کا — روشن دلوں پہ حال ہوا دور دور کا

گردوں کی سرنوشت جو آئینہ ہوگئی
رو داد شب کی دفترِ پارینہ ہوگئی

بڑھتا چلا جو نور کا ہلکا سا اک سحاب — ڈالی ہر اک شجر پہ ہوا نے تنک نقاب
اللہ رے فیض مقدمِ شاہِ قمر رکاب — ذرے ہوا میں اپنی جگہ سب تھے آفتاب

تھے منتظر جو سب ہمہ تن شاہ راہ میں
جان آگئی دلوں میں بصیرت نگاہ میں

کچھ کچھ ہوا خنک، وہ دھند ہلکا وہ سبزہ زار — ملتے ہوئے وہ قطار درختوں کی ہر قطار
جنگل دکھا رہا تھا عجیب قدرتی بہار — ہر رنگ میں تھی صنعتِ صناع آشکار

عالم جدا تھا جلوۂ ہر وحش و طیر میں

باطن کا انکشاف تھا ظاہر کی سیر میں

آتا تھا نورِ چمن کے درختوں کی جب ادھر — تا دور دوڑ جاتی تھی حیرت سے خود نظر
کچھ دے رہی تھی دل کی خوشی کان میں خبر — قادر نہ تھی ادائے بیاں پر زباں مگر
میزانِ عقل و ہوش میں کیا کچھ تلا نہیں
لذت تھی کیونکہ ذہنوں کو یہ عقدہ کھلا نہیں

ہر تخم کے بطون میں اسی طرح تھے نہال — ہے وہم خوردہ بین سے بھی جن کا بیاں محال
جن قوتوں کا فعل انہیں کا ہے انفعال — عقلیں فلاسفہ کی یہیں ہیں شکستہ بال
ہر نخل کے نمو کا عجب اہتمام تھا
یہ اہتمام روحِ نباتی کا کام تھا

گل چین کی ہاتھ سے جو ملی تھی ذرا اماں — بزمِ چمن تھی صحبتِ یارانِ ہم زباں
وہ ناروں وہ سوسن و ریحان و ضیمراں — وہ یاسمن وہ نرگسِ شہلائے دل ستاں
پتے جو بڑھ کے پھولوں کے منہ چومنے لگے
سائے بھی ہر شجر کے تلے جھومنے لگے

ہر چیز کے خصائل جدا اور جدا تھی شاں — جاری کسی زباں پہ سخن کوئی بے زباں
وابستۂ خیال تنومند و ناتواں — شیروں کو اپنی فکر تو چیونٹی کو اپنا دھیاں
پابند اسی دھن میں گرفتار حال ہیں
آزاد پھر پھنسے ہوئے سب ایک جال میں

شیر الطرف خموش تھے بالائے کوہسار — جیسے آہوؤں کے غول تھے بالائے کوہسار
کفچے گرا کے زمیں پہ پڑے تھے مار — چیونٹی کی بھی رکی ہوئی اس وقت تھی قطار
جلوے جو اصلِ حسن کے تاباں نظر میں تھے
جاندار سارے محوِ بہارِ سحر میں تھے

سودائے خام

جو ہو مجھ سے پیار تم کو - جو ہو تم سے پیار مجھ کو
یہ ضیائے مہر تاباں
یہ فضا یہ سبز پودے
یہ کمالِ حسن و زینت -
مری زیست کا ترانہ
نہ یہ بے سری صدائیں کریں بیقرار مجھ کو

نظر آئے خارِ ہستی گلِ نو بہار مجھ کو!
یہی آنی جانی گھڑیاں
یہی گل یہی پرندے
مجھے دیں نویدِ راحت!
ہو سرودِ دلبرانہ!
"جو ہو مجھ سے پیار تم کو جو ہو تم سے پیار مجھ کو"

"جو ہو مجھ سے پیار تم کو"!
کوئی انقلاب آئے
کہ ہو شاہ گدا کا ہمساں
میری خوش نصیبیوں کا
میرے عشق کی حکایت
کرے مستِ عیش دائم مئے دیدِ یار مجھ کو

مگر آہ! یہ کہاں ہو؟
تو وہ دن سب مجھے دکھائے
ہو زمیں پہ مہ خراماں
ہو ہر ایک زباں پہ چرچا
بنے دفترِ مسرت
"جو ہو مجھ سے پیار تم کو جو ہو تم سے پیار مجھ کو"

"جو ہو تم سے پیار مجھ کو"
کروں غرقِ بحرِ نسیاں
یہ مشقتِ پشیماں
انہی قدموں میں پڑا ہوں!

میری عمر یوں بسر ہو
غمِ دہر و فکرِ ساماں
یہ ہجومِ یاس و حرماں
تمہیں مسکراتے دیکھوں!

مری زیست ہو محبت کرم معانِ الفت
مے بیخودی پلا کر کرے ہوشیار مجھ کو جو ہو مجھ سے پیار تم کو جو ہو تم سے پیار مجھ کو

جو ہو مجھ سے پیار تم کو جو ہو تم سے پیار مجھ کو! مگر آہ! تم بتوں کا نہیں اعتبار مجھ کو
یہ کہاں ہے اپنی قسمت کہ ہو مجھ سے تم کو الفت!
تمہیں حسن و خود پرستی مجھے عشق و حال مستی
ملیں پھر جو ہم تو کیونکر؟ جئیں یوں ہی زندگی بھر!
دمِ واپسیں تک اے جاں رہیں دل کے دل میں ارماں!
پسِ مرگ بھی کھٹکتا یہ جگر میں خار جائے! لبِ گور بھی تڑپتا دلِ بے قرار جائے!

جوئے آب

غیرتِ باغ ارم ایک نظارا تیرا! رشکِ فردوسِ بریں ایک تماشا تیرا!
ہائے وہ شام و سحرگاہ کا جلوہ تیرا دل مشتاق ہوا جاتا ہے شیدا تیرا!
دردمندوں کے لئے باعثِ آرام ہے تو
نام ہے جس کے ہو راحت وہ دلارام ہے تو
واہ کیا شان ہے کیا رعب ہے کیا ہے شوکت واہ کیا زور ہے کیا شور ہے کیا ہے قوت
آہ پہنایہ ترا آہ تری یہ وسعت اُف تری شوخ ادائیں تری پیاری صورت
چاندنی چاندنی سب کہتے ہیں ہم جانتے ہیں
کوئی ہو تجھ سے مقابل کہیں ہم مانتے ہیں؟

ٹھنڈی ٹھنڈی تجھے چھوکر جو ہوا آتی ہے　　غنچۂ خاطرِ ناکام کھِلا جاتی ہے
نور کی تیری جھلک چاند کو شرماتی ہے　　تیری یہ طرزِ خرام آہ غضب ڈھاتی ہے
چھیڑنا ساحلِ شیدا کا تجھے بھاتا ہے
واہ شاباش ہے کیا ناز کا ڈھب آتا ہے

چاندنی رات میں دیکھے کوئی تیرا جوبن　　ہائے وہ [illegible] کہ قرباں ہو صحنِ گلشن
وہ سماں نور کا اور بادِ صبا کا وہ چلن　　وہ سکوں چار طرف چھایا فدا جس پہ سخن
تنِ نازک کا وہ نقشہ کہ خجل آئینہ
شرم سے آب ہو بلّور غضب وہ سینہ

دن کو وہ کھیلنے سورج کی کرن کا آنا　　ناز و انداز کا رنگین وہ تانا بانا
آہ وہ جوش میں چلتے ہوئے تیرا گانا　　باتوں باتوں میں اک عالم کو لبھا لیجانا
چھیڑنا بادِ صبا کا وہ تجھے مستی سے
ہائے وہ چلبن تجھ میں ہونا تر شوخی سے

دامنِ کوہ سے اٹھلا کے نکلنے والی　　ساحتِ دشت میں انداز سے چلنے والی
رنگ ایک آن میں لاکھوں ہی بدلنے والی　　سبزہ و گل کے قریب آکے مچلنے والی
تو ہی تزئین ہے کھیتوں کے بیابانوں کی
تو ہی تفریح ہے حیوانوں کی انسانوں کی

آہ اے نشۂ بیخود کن پیمانۂ حسن　　آہ اے کیفیتِ بادۂ جانانۂ حسن
ہائے کیا بات تری شورشِ میخانۂ حسن　　واہ شاباش تجھے او دلِ دیوانۂ حسن
تو سلامت رہے دنیا میں الٰہی دائم
زندگی اپنی ہے تیرے ہی تو دم سے قائم

شمعِ ہستی

اے شمعِ ہستی اے زندگانی | بھاتی ہے دل کو تیری کہانی
ہے کوچ تیرا ہر لحظہ جاری | جاتی ہے بگٹٹ تیری سواری
بجلی سے بڑھکر بے تاب ہو تو | یا واہمہ ہے یا خواب ہے تو
کیوں چپ چپاتی ہر دم رواں ہے | آئی کہاں سے جاتی کہاں ہے
ظاہر ہیں یوں تو سب پر تری گن | لیکن نہ پایا تیرا سراغ بن
گذرا نہ کوئی اس ہفت خواں سے | جاہل ہیں تیرے سرِّ نہاں سے
فی الجملہ ہمت سب ہار بیٹھے | ہیں سر بزانو ناچار بیٹھے

اے زندگانی اے شمعِ ہستی | سونی پڑی تھی تجھ بن یہ بستی
چاروں طرف تھی چھائی اندھیری | ناگاہ اٹھی اک ڈیک تیری
وہ ڈیک تھی بس نورٌ علیٰ نور | کل ہے کو ہستی پردہ میں مستور
پھولوں میں جھلکی تاروں میں چمکی | بخشی جہاں کو رونق ارم کی
ہوتا نہ یاں جو تیرا ٹھکانا | چوپٹ ہی رہتا یہ کارخانہ
کیا پھونک ماری دنیا کے تن میں | گویا لگا دی دوں خشک بن میں
بزمِ جہاں میں رونق ہی تجھ سے | اس میکدہ میں ہو حق تجھ سے

ہے تیرے دم سے اے عالم آرا | بزمِ عروسی آفاق سارا
سرگرم ہے تو جادوگری میں | ہیں تیرے عشوے خشکی تری میں

مٹی کا جوبن تو نے نکھارا — دے دے کر چھینٹے اسکو ابھارا
بے حِس کو بخشا احساس تو نے — دی مشتِ گِل کو بو باس تو نے
تھی بھولی بھالی بھونڈی بھنگم — تو نے سکھایا اس کو خم وچم
کر تب سے تیرے سانچے میں ڈھلکر — کندن سی نکلی رنگت بدل کر
ٹھکرا کے تو نے جب کہدیا قُم — اُٹھ بیٹھی فوراً کرتی تبسّم
بھولی ہے اپنی اوقات پہلی — پھرتی ہے خوش خوش کیا البیلی

پاتی ہی خلقت جب تیری آہٹ — ہوتی ہے پیدا اک گد گداہٹ
مچتا ہے پھر تو اودھم غضب کا — بجتا ہے ڈنکا عیش و طرب کا
کہتی ہے دنیا تو ہے تو کیا غم — تو آئے نت نت تو آئے جم جم
جیتے ہیں جب تک مرتے ہیں تجھ پر — سب کچھ تصدق کرتے ہیں تجھ پر
کیا مال ہے جو تیرے سوا ہے — تو ہی نہ ہو تو سب پر وھتا ہے

اے سب کی پیاری سب کی چہیتی — کہ منہہ زبانی کچھ آپ بیتی۔
"قدرت کے گھر کی میں لاڈلی ہوں — ناز و نعم سے برسوں پلی ہوں۔
تقویم احسن میرا لگن تھا — فردوس اعلےٰ میرا وطن تھا۔
حور و ملک کی آبادیاں تھیں — بیفکریاں تھیں آزادیاں تھیں
چلتی تھی ہر دم بادِ بہاری — شیر و عسل کی نہریں تھیں جاری
میری ادا پر مرتے تھے قدسی — سجدہ پہ سجدہ کرتے قدسی
تکریم میری ہوتی تھی ازحد — ہیں داستانیں جسکی زباں زد
پھر دیس چھوٹا گذری سو جھیلی — پردیسیوں کا اللہ بیلی

پل مارتے کا ہے یہاں بسیرا — حبِّ وطن ہے ایماں میرا

آب و ہوا میں دشت و جبل میں — میری رسائی ہے ہر محل میں

لیکن یہاں میں خلوت نشیں ہوں — ہوں اس طرح پر گویا نہیں ہوں

خوابِ گراں کی حالت ہے طاری — مستی میں گم ہے سب ہوشیاری

جب آتے آتے سبزہ میں آئی — کروٹ بدل کر میں لہلہائی

انگڑائیاں لیں منہ کھول ڈالا — پر آنکھ سے کچھ دیکھا نہ بھالا

داخل ہوئی جب حیواں کے تن میں — اک شور اُٹھا اس انجمن میں

انسان کا جامہ جب میں نے پہنا — اللہ رے میں کیا میرا کہنا

کس کس جتن سے میں نے بنایا — رُتبہ بہ رتبہ پایہ بپایہ

جامد کو نامی کو حیواں — حیواں کو وحشی وحشی کو انساں

پھیلایا میں نے کیا کیا بکھیڑا — شادی و غم کے ارگن کو چھیڑا

نیکی بدی کے میلے جمائے — جھوٹ اور سچ کے سکّے چلائے

جو ناچ میں نے جس کو نچایا — وہ ناچتے ہی اُس کو بن آیا

القصہ ہوں میں وہ اسمِ اعظم — ہے جس کے بس میں تسخیرِ عالم

کچھ کچھ کھلے ہیں انداز میرے — دیکھے ہیں کس نے اعجاز میرے

مجھ کو نہ سمجھو تم آج کل کی — ہوں موجِ مضطر بحرِ ازل کی

رکھوں گی جاری یوں ہی سفر میں — بحرِ ابد کی لوں گی خبر میں

ہے میری ہستی اک طرفہ مضموں — کچھ بھی نہیں ہوں پر میں ہی میں ہوں

سنتے رہو گے میری کہانی

جب تک ہے باقی دنیا فانی

ہمارا دیس

سارے جہاں سے اچھا ہندوستاں ہمارا
ہم بلبلیں ہیں اس کی یہ گلستاں ہمارا

غربت میں ہوں اگر ہم رہتا ہے دل وطن میں
سمجھو وہیں ہمیں بھی دل ہو جہاں ہمارا

پربت وہ سب سے اونچا ہمسایہ آسماں کا
وہ سنتری ہمارا وہ پاسباں ہمارا

گودی میں کھیلتی ہیں اس کی ہزاروں ندیاں
گلشن ہے جن کے دم سے رشکِ جناں ہمارا

اے آبِ رودِ گنگا وہ دن ہے یاد تجھ کو
اترا ترے کنارے جب کارواں ہمارا

مذہب نہیں سکھاتا آپس میں بیر رکھنا
ہندی ہیں ہم وطن ہے ہندوستاں ہمارا

یونان و مصر و روما سب مٹ گئے جہاں سے
اب تک مگر ہے باقی نام و نشاں ہمارا

کچھ بات ہے کہ ہستی مٹتی نہیں ہماری
صدیوں رہا ہے دشمن دورِ زماں ہمارا

اقبال کوئی محرم اپنا نہیں جہاں میں
معلوم کیا کسی کو دردِ نہاں ہمارا

مرغ و صیّاد

اے نسیمِ صبح! اے گہوارہ جنبانِ چمن
ہو اگر تیرا گذر سوئے جوانانِ چمن

ان سے کہنا میری جانب سے بصد اظہارِ شوق
ساتھ کے کھیلے ہوئے ہیں وہ جو یارانِ چمن

اک گرفتارِ قفس نے ہے کہا تم کو سلام
اور پوچھا ہے مزاجِ سرو و ریحانِ چمن

پھر یہ دینا میری جانب سے نویدِ جانفزا
سیرِ گلشن ہو مبارک تم کو مرغانِ چمن

خاک اڑا کر پہلے چپ ہو جائیو بادِ صبا
حال پوچھیں کچھ جو میرا ہم صفیرانِ چمن

پھر یہ کہنا کھینچکر سینے سے آہِ جانگداز
ہے قفس میں قید وہ مرغِ خوش الحانِ چمن

اب نہ سیرِ لالہ و گل ہے نہ وہ گلگشتِ باغ
حسرتِ پرواز ہے اب اور ارمانِ چمن

اب نہ وہ پھولوں کا تختہ ہے نہ کنجِ خوشگوار
وہ نہالانِ چمن ہیں اب نہ میدانِ چمن

تنکے چنتا ہے پڑا کنجِ قفس میں اب غریب
آشیاں کیسا! کہاں کی فکرِ سامانِ چمن

توڑتا ہے خانۂ صیاد میں دم ہائے ہائے
ہو رہا ہے بلبلِ تصویر ماتم کئے ہائے

چھیڑتی ہے کیا قفس میں ہم کو اے موجِ نسیم
اس چمن میں ہم بھی تھے پروردۂ نازِ قدیم

تھی ہماری بھی کبھی سرسبز کشتِ آرزو
ہم پہ بھی اے ابرِ رحمت! تھا ترا لطفِ عمیم

لوٹتے تھے آہ دن کو سبزہ زاروں کے مزے
شب کو رہتے تھے تر و شاداب کنجوں میں مقیم

یا چہکتے پھرتے تھے باغوں میں ہم اے ہمصفیر
یا قفس میں چیختے ہیں آ ملے یار و ندیم

ہم کہاں کے خوش نوا تھے ہم کہاں کے بذلہ سنج
ہم پہ اے صیاد ٹوٹا جو ترا قہرِ عظیم

ہمصفیرانِ چمن کے کیا تغافل کا گلہ
جب قفس میں پھنس گئے کیسی رہ و رسمِ قدیم

ذبح اے صیاد کر بھی چک کہ جھگڑا پاک ہو
ہم سے اب دیکھا نہیں جاتا ہے یہ حالِ سقیم

پھونکدے اے سوزِ غمہائے نہانی! پھونکدے
بنکے او ظالم! بھڑک اٹھ اشتعالِ نارِ جحیم

ہم ہیں پابندِ قفس کیسا چمن کیسی بہار
کس کو مژدہ دینے آئی ہے تو اے بادِ نسیم

دیدِ گل سے واسطہ کیا ہم اسیروں کے لئے
سیرِ گلشن ہو مبارک ہمصفیروں کیلئے

لالہ و گل کی بھی قسمت میں فضا دو چار دن
ہم نے کھائی سبزہ زاروں کی ہوا دو چار دن

پھر سنیگا ہائے کس کے زمزمے صیاد تو
ہم قفس میں اور ہیں نغمہ سرا دو چار دن

حسرتِ پرواز بھی جاتی رہیگی اے اجل!
ہم سے اڑ لیں اور مرغانِ ہوا دو چار دن

پھر کہاں صیاد و ہم اور پھر کہاں کنجِ قفس
آب و دانہ ہے مقدر میں ترا دو چار دن

گھٹ کر اس زنداں میں جائیگا کبھی تو دم نکل
مانگتے ہیں ای اجل! تیری دعا دو چار دن

یاد ای صیاد! ہم کو بھی کرے گا تو کبھی
اور تڑپا لے قفس میں بیوفا دو چار دن

دیکھکر خالی قفس کو جی بھر آئے گا ترا
پیٹ کر روئیگا سر بعدِ فنا دو چار دن

کر رہے ہیں جس طرح ہم نالہائے دردناک
تو رہیگا یونہی مصروفِ بکا دو چار دن

یاد جب صیاد آئینگے ہمارے زمزمے
گھر میں تنہا تیرا جی گھبرائیگا دو چار دن

دستِ حسرت مل کرائے صیاد! پچھتائیگا تو
ایسا لائیگا کہاں سے آہ مرغِ خوش گلو

جب بنائیگا ہمارا آہ! چھوٹا سا مزار
چپکے چپکے تو ہمارے غم میں ہوگا اشکبار

یاد رہ رہ کر جفائیں اپنی آئینگی تجھے
اور ہماری بیکسی پر روئے گا تو زار زار

لے کے خالی گھر کو جب گلشن سے لوٹیگا قفس
پیچھے پیچھے خاک اُڑاتی آئے گی بادِ بہار

سنکے ای صیاد! تیرے نالہائے جانگداز
راستے میں لوگ پوچھینگے کہ کیوں ہی سوگوار

تو کہیگا مرگئی وہ بلبلِ رنگیں نوا
وصلِ گل کے واسطے تھی جو قفس میں بیقرار

گل کھلینگے، سبزۂ نورس اُگیگا قبر پر
ہم نہ ہونگے اور آئیگی گلستاں میں بہار

سوتے ہونگے تیری گہواری میں ای کنجِ لحد
خوابِ راحت میں مخل ہوگی نہ گلبانگِ ہزار

اپنی مٹی کی کہاں کی کیا خبر۔ بادِ صبا!
ہو پریشاں دیکھئے کس کس جگہ مشتِ غبار

وہ بھی آزادی کے دن تھے ہائے کتنے جانفزا
تیرے بندھن سے تھے جب ای قیدِ ہستی رستگار

لوٹتے تھے اپنے گلشن میں بہاروں کی مزے
سبزہ زاروں کی تھیں سیریں۔ جوئباروں کی مزے

ہم سرودِ طائرانِ قدس تھی ہم بھی صبا!
قیدِ ہستی کی کشاکش میں نہ تھے یوں مبتلا

بولتے تھے اپنی دھن میں پیاری پیاری بولیاں
ہائے وہ دن! شاخِ طوبیٰ پر تھی جب نغمہ سرا

لوٹتے تھے ہم بہارِ گلشنِ فردوس کی
تھی عجب دل کش ہماری سبزہ زاروں کی فضا

کھل رہے تھے چار سو پھولوں کے کنج خوشگوار
تھیں رواں شیر و عسل کی اُنمیں نہریں جابجا

اپنے پھولوں پر تو اتراتی ہے کیا اے عندلیب!
تو نے دیکھی ہی نہیں شاہد گل کی ادا۔

کرکے ہم کو تو اسیر حلقۂ دامِ فریب
کھینچکر کس وادئ پرخار میں لائی قضا

ہم نہ پھنستے کس طرح صیاد تیرے جال میں
آب و دانہ تھا مقدر میں ترے گھر کا لکھا

ہم قفس میں کب تلک بے بال و پر تڑپا کریں
ٹوٹ بھی جا! اے طلسم قید ہستی ٹوٹ جا!

تیرے مرغ دست پرور ہم ہیں صیاد ازل
خواہ ہم کو ذبح کر تو۔ خواہ ہم کو کر رہا

من نہ آں مرغم کہ نالم از جفائے تیغ تو
ذبح کن صیاد۔ قربانِ ادائے تیغ تو۔

سپوت بیٹا

آتا ہے ہند سے تو اے نوجوان سپاہی
مجھ کو بھی کچھ بتا جا۔ رکھے تجھے الٰہی

انیسویں کی پلٹن ہے اک وہاں بہادر
جس کا ہر اک سپاہی مشہور ہے دلاور

کچھ اُن کا حال کہنا اور مجھ کو یہ بتانا
کیا ہیں وہ سب سلامت اور خرم و توانا

بیٹا میرا ہے اُن میں۔ میرا عزیز لڑکا
جس کی ہے سب سے بڑھکر دنیا میں مجھکو پروا

احساں کریگا ماں پر اُس کی خبر بتا کر
لے رانڈ کی دعائیں اُس کی خبر سنا کر

آتا ہوں ہند سے میں۔ موجود جنگ میں تھا
حصہ میرا بھی اس جا تیر و خدنگ میں تھا

انیسویں جو پلٹن ہے خوب جانتا ہوں
اُس کے سپاہیوں کی جرأت کو مانتا ہوں

افسر ہوں یا سپاہی سب سے ہوں میں شناسا
ہمراہیوں سے اپنے ہر اک ہی دوست میرا

لایا پیام ہوں اک تیرے لئے بڑی ماں
رابرٹ کا تیرے پیغام خوش خوش سنو بڑی ماں

رابرٹ کو میرے تم کیا پہچانتے ہو بیٹا؟ سچ سچ بتانا جو کچھ تم جانتے ہو بیٹا
اے نیک خو سپاہی اُس کا پیام کیا تھا کہنا اُسی کے الفاظ۔ اس کا کلام کیا تھا
ہائے وہ لفظ کہنا جو اس کے منہہ سے نکلے لختِ جگر کے میرے جو اپنے منہہ سے نکلے
تجھ کو خبر نہیں وہ۔ کیسا مجھے ہے پیارا اپنی ضعیف ماں کی ہے۔ آنکھ کا وہ تارا

فرقت میں اس کی ماں کا کیا حال ہو رہا ہے
یہ دل میرا غموں سے۔ پامال ہو رہا ہے"

"ہیولاک کی لڑائیاں اُس نے لڑی ہیں ساری دشمن پہ وار ساری اس کی ہوئی ہیں کاری
دو بار لکھنؤ پر وہ چڑھ کے خوب لڑا ہے تلوار سے لڑا ہے اور توپ سے لڑا ہے

کر شکر اس خدا کا جس نے اسے بچایا
ہر معرکے میں اس پر حق کا رہا ہے سایا"

صد شکر یا الٰہی۔ طاقت نہیں بیاں کی تو نے سنی دعائیں اس کی غریب ماں کی
اے دو جہاں کے مالک اے کردگار میرے اس رانڈ ناتواں کی سن لی نثار تیرے
گولے کی زد سے روکا تلوار سے بچایا اپنے کرم کا نقشہ دل پر میرے جمایا

پر ہاں مجھے بتادے پیغام اس کا کیا تھا
اپنی ضعیف ماں کو کہنے کو کیا کہا تھا"

"اے ماں بہادری سے تیرا لڑا ہے لڑکا اور ہر زباں پہ اُس کا پھیلا ہوا ہے چرچا
کرنل کی جاں کو اس نے رن میں بچا لیا تھا سرکار میں یہ قصہ سارا لکھا گیا تھا
اس کے صلے میں اس کو تمغہ عطا ہوا ہے زائد ہر آن وظیفہ اس کو دیا گیا ہے

ہے خوش نصیب لڑکا تیرا بہت بڑی ماں

ندی کا راگ

بگلوں اور چہلوں کی نشیمن سے میں نکلکر ناگاہاں
چشم زدن میں سیل بلا کی طرح جھپٹ کر آتی ہوں

سبزہ کو فرش استبرق پر مثل دراتی غلطاں
کروٹیں لیتی ہوئی وادی میں پہنچکر شور مچاتی ہوں

کتنی گھاٹیوں کی دامن کو راہ میں آتی جھٹک کر میں
کتنے ٹیکروں اور ٹیلوں کی تلووں میں سہلاتی ہوں

بیسیوں گاؤں اور قصبوں کے پہلو سے نکل کے ٹک کے میں
سیکڑوں پل ہیں میٹھی ہیں دل جنکا میں حرا کرلاتی ہوں

زید کے کھیت کے نیچے بہہ کر تھوڑی سی دور یہ آخر کار
جا کے چھلکتے دریا کو میں شربت وصل پلاتی ہوں
عمر و زید کی ہستی ہی کیا ہے صبح آئے گئے شام سدہار
مجھ کو دیکھو کہ ایک روش پر صبح و مسا چلی جاتی ہوں

تان کھرج کی یا پنچم کی چھیڑتی ہوں بیخود ہو کر
ریزۂ سنگ سے تار آب پہ دلکش نغمہ لگاتی ہوں

پاؤں پہ جھانجھ بھنور کی پہنے اوڑھے لطافت کی چادر
چھم چھم کرتی ہوئی آپ اپنے حسن پہ میں اتراتی ہوں

بنکر میں مشاطہ کبھی الجھاتی ہوں گیسوے ساحل کو
کھیتوں کا دھو آتی ہوں منہہ میدانوں کو نہلاتی ہوں

اور کبھی ساقی بنکے مرتب کرتی ہوں سبزہ کی محفل کو
ساغر نامیہ بھر کے بنفشہ اور سمن کو پلاتی ہوں

گاتی بجاتی جشن مناتی تھوڑی سی دور یہ آخر کار
جا کے چھلکتے دریا کو میں شربت وصل پلاتی ہوں
عمر و زید کی ہستی ہی کیا ہے صبح آئے گئے شام سدہار
مجھ کو دیکھو کہ ایک روش پر صبح و مسا چلی جاتی ہوں

زیب بدن میں کر کے آب رواں کا پاک اور صاف لباس
ساحت ہا معلے پر جسید مرلی کھاتی ہوئی اٹھلاتی ہوں

اپنے آنچل میں بھرلاتی ہوں میں کہیں پھول اور کہیں گھاس
گودیوں میں رہو کو کبھی جھینگے کو کبھی میں کھلاتی ہوں

کف کے عنبر میں رنگ کے گگنے مجھ پہ کہیں ہیں بیر رہے
ہنستی ہوں میں حباب کو گاہے اور کبھی اسکو جلاتی ہوں

لوٹتی لوٹتی رستے میں بستر پہ سنہری کنکروں کے
میں ٹکرا کے کبھی پتھر سے روپہلی چھینٹیں اڑاتی ہوں

بہتی بہتی بس اس انداز سے تھوڑی سی دور پہ آخر کار
جا کے چھلکتے دریا کو میں شربتِ وصل پلاتی ہوں
عمرو زید کی ہستی ہی کیا ہے صبح آئے گئے شام سدھار
مجھ کو دیکھو کہ ایک روش پر صبح و مسا چلی جاتی ہوں

اڑتی ابابیلوں کے ساتھ اڑاتی اپنی زیر و بم
میں کبھی پہلی اور کبھی پر پٹی اور کبھی آنکھ لڑاتی ہوں

سورج کی کرنوں کو اپنے ریت کی ٹاپوؤں پر پیہم
رقص میں لا کر زہرہ کو افلاک پہ میں شرماتی ہوں

دشت نوردی بادیہ گردی کرتی اک انداز سے میں
سبزہ تر کو چھیڑتی ہوں اور بیدوں میں لہراتی ہوں

لالہ و سنبل کو جو مظاہر عاشق اور معشوق کے ہیں
میٹھی نیند سے گدگدی لیکے چلتے چلتے جگاتی ہوں

جھاڑوں میں جھنکار دئیں صحراؤں میں ویرانوں میں سلا
چاند کو اور تاروں کو میں اپنا میٹھا راگ سناتی ہوں

اپنے ریت کی مینڈوں میں کچھ دیر کو لیتی ہوں سستا
اپنے کنارے کی بوٹیوں سے دم بھر کو میں دل بہلاتی ہوں

کاٹتی ہوں اک چکر پھر اور تھوڑی سی دور پہ آخر کار
جا کے چھلکتے دریا کو میں شربتِ وصل پلاتی ہوں
عمرو زید کی ہستی ہی کیا ہے صبح آئے گئے شام سدھار
مجھ کو دیکھو کہ ایک روش پر صبح و مسا چلی جاتی ہوں

رات کے پچھلے گھنٹے

دنیا تمام غفلت کی نیند سو رہی تھی
اور شورشِ جہاں تک خاموش ہو رہی تھی

سناٹا کل فضائے عالم پہ چھا چکا تھا
پچھلے پہر کا گھنٹہ بارہ بجا چکا تھا

وقتِ رواں کا ہر دم ہوتا تھا پاشمارہ | اے سونے والو دیکھو تم مجھ کو آشکارا
میرا قدم ازل سے کُل کائنات پر ہے | اک نقشِ پا ہے دن پر اور ایک رات ہے
خمخانۂ فلک میں رندوں کا جمگھٹا تھا | محفل سکوت کی تھی اور دور چل رہا تھا
چوٹی سے کوہ نور کی تھی اک جوئے نور جاری | اور روشنی کا گویا برسا رہی تھی پانی
میں نے جو غور کر کے دیکھا تو چاند تھا وہ | بادل کی جھاڑیوں میں تھا راہ ڈھونڈھتا وہ

تنہائی مختصر نے تھا ایسا مجھے ابھارا
بے اختیار ہو کر میں نے اُسے پکارا

اے پھرنے والے دشتِ غربت میں آسماں کے | اے راہ نورد یوسفِ انجم کے کارواں کے
اے رات کے مسافر بے زادِ راہ و ساماں | کس منہ سے اپنے گھر ہم تجھ کو بلائیں مہماں
گھر کیسا؟ آہ گھر بھی تو یاں نہیں کوئی ہے | ہر شے میں غیریت ہے ہر چیز اجنبی ہے
لیکن نہیں بٹانے کو تیرا ہاتھ میں ہوں | چل جس طرف کو چلنا ہے تیرے ساتھ میں ہوں
اس دیس میں ہوا ہوں آ کر تباہ میں بھی | تیری طرح چلا ہوں بے زادِ راہ میں بھی
پھرتا ہوں زندگانی کے توسنِ رواں پر | اک پاؤں ہے زمیں پر اور ایک آسماں پر
تیری طرح ابھر کر جاتا ہوں ڈوب میں بھی | یعنی طلوع ہوتا ہوں اور غروب میں بھی
گھیرے ہوئے مجھے بھی تاریکیٔ محن ہے | تیری طرح سے میرے بھی واسطے گہن ہے
یعنی ہوں گاہ روشن اور گاہ ماند میں ہوں | بس ایک چاند تو ہے اور ایک چاند میں ہوں
تو وہ کہ تجھ سے روشن رہتی ہے آدھی دنیا | میں وہ کہ مجھ سے رونق پکڑے ہے ساری دنیا
ساری زمیں پہ انجم ہے میری روشنی سے | دن ہو رہا ہے میری تجلی کی روشنی سے

اے ماہِ آسماں من آں ذرۂ زمینم
صد ماہ چوں تو پنہاں در جیب داشتیم

اے چاند حال میرا تجھ سے چھپا نہیں ہے | تو اور میں ہوں کوئی یاں دوسرا نہیں ہے

یہ سب تو شاعرانہ میری تعلیاں تھیں ۔ لفاظیاں تھیں اور سب رنگین بیانیاں تھیں

سن کان دھر کے اپنی بیتی تجھے سناؤں ۔ میرا تو حال یہ ہے میں تجھ سے کیا چھپاؤں

طوفاں کا جیسے مارا ساحل کو ڈھونڈھتا ہو ۔ یا وہ تھکا ہوا جو منزل کو ڈھونڈھتا ہو

یا جیسے وہ پتنگا جو کھیل جائے جی پر ۔ اور دوڑ کر گرے جو شعلے کی روشنی پر

یا جس طرح وہ بیوہ جو غم میں جل رہی ہو ۔ اور خاک اپنے شوہر کی جو کھریدتی ہو۔

صدیاں گذر گئی ہیں مجھ کو تلاش کرتے ۔ خالق کو اور اس کے اسرار فاش کرتے

جانچی ہیں میں نے برسوں خورشید کی شعاعیں ۔ ذروں پہ ہیں نو برسوں دوڑائی یہ نگاہیں

تہ تک سمندروں میں غوطے لگا گیا ہوں ۔ پتال تک زمیں کے اندر چلا گیا ہوں

تحت الثریٰ سے گذرا اُڑتا نزقند بھرتا ۔ افلاک پھاڑتا اور اجسام قطع کرتا

چمکا کبھی افق پر خورشید شرق بنکر ۔ تڑپا کبھی فضائے عالم میں برق بنکر

اونچا بہت غباروں میں بیٹھ کر اڑا ہوں ۔ بادل میں چھپ گیا ہوں تاروں میں ملگیا ہوں

عدم کر آیا میں اسپتل اوڑاتا ۔ گذرا ادھر ادھر سے بائیسکل اوڑاتا

جنت میں جا کے وعدی لے آیا حور ہی میں ۔ دوزخ کا دیکھ آیا دروازہ دور سے میں

شمس و نجوم کی میں رفتار دیکھ آیا ۔ اور کائنات کے کل اسرار دیکھ آیا

کیا دورہ کواکب اور کیا قیام شمسی ۔ دیکھا پڑا ہے میرا سارا نظام شمسی

گردش کی شکل میں نے اسطرح کھینچدی ہے ۔ گویا زمین میری انگلی پہ گھومتی ہے

دنیا کا کام سارا مجھ سے نکل رہا ہے ۔ یہ کارخانہ میرے پرزوں سے چل رہا ہے

لیکن بتاؤں اس سرگردانی کا نتیجہ ۔ یہ ہے کہ سر جھکائے افکار میں ہوں بیٹھا

تحقیق اور تجسس کے دام میں پھنسا ہوں ۔ وسواس میں گھرا ہوں اوہام میں پھنسا ہوں

کہنے کو ہوں میں فارغ کہلانے کو ہوں کامل ۔ جو چیز ہے فراغت مجھ کو کہاں ہے حاصل؟

سب زندگی کی خوشیاں ہیں خاک میں ملا کر ۔ بیٹھا ہوا ہوں دونوں ہاتھوں سے اب میں سر کو تھام کر

صحرا میں آہ آہو بھرتے ہیں جب کلیلیں — بے فکر ہو کے جب وہ سبزے پہ لوٹتی ہیں

گرتے ہیں جبکہ بھونرے پھولوں کے جامِ گل پر — جب بلبلیں مچاتی ہیں شور شاخِ گل پر

چشموں پہ غول باندھے چڑیاں جب آگئی ہیں — جب وہ پروں سے اپنے پانی اچھالتی ہیں

اُس وقت میرے دل پر اک ابر چھا گیا ہے — اور وہ برس کے گھنٹوں مجھ کو رُلا گیا ہو

اُس وقت میں نے جانا ہے زندگی یہی ہے — اصلی خوشی یہی ہے زندہ دلی یہی ہے

پھر سوچ کر کہ میرا کیا حال ہے میں کیا ہوں — بس چوند ہیا گیا ہوں ایسا کہ چیخ اٹھا ہوں

باز آیا علم و فن کی میں ایسی روشنی سے — گذرا میں ایسے جینے اور ایسی جانکنی سے

اے لذتوں کے پھندو تم میری جان چھوڑ دو — اے حوصلو مجھے تم کوئی تو آن چھوڑ دو

اے علم میں فضیلت سے تیری باز آیا — اے عقل میں ہدایت سے تیری باز آیا

روزِ اک نہ اک بکھیڑا تو نے لگا دیا ہے — جب تو نے رائے دی ہے مجھ کو پھنسا دیا ہے

اے عشق جان تجھ سے اپنی بچا رہا ہوں — اے شوق تجھ سے پیچھا اپنا چھڑا رہا ہوں

جس راہ تم نے چاہا ہے مجھ کو لے چلے ہو — تم کھینچے چلے ہو تم پھیلتے چلے ہو

آہ اے امید تو نے مجھ کو بہت تھکایا — اے آرزو کے پودو کچھ تم سے پھل نہ پایا

اے جذبِ حسن اور اے جوشِ شباب رخصت — اے ذوق و شوق عشق خانہ خراب رخصت

بس اے عروس دنیا اب میں الگ ہونگا — اب اے بہشت تجھ کو میں لیکے کیا کرونگا

در محفلے کہ یاراں شربِ مدام کردند

چوں نوبتِ من آمد آتش بجام کردند

اے چاند دو بجے ہیں اور میں بھی تھک گیا ہوں — یہ نیند کا نشہ ہے جو کچھ بہک گیا ہوں

غمنامہ سن چکا تو میرا میری زبانی — زنہار تو کسی سے کہنا نہ یہ کہانی

تو شورشِ جہاں میں مہرِ سکوتِ شب ہے — لوحِ طلسم ہے تو ٹوٹا تو بس غضب ہے

ہیں سر بمہر قدرت کے راز تیرے سر میں — اس میکدے کی کنجی ہے تیری ہی کمر میں

میں ہوں کلیم تیرا اور شمع طور تو ہے — نادر کے مالِ یغما ہیں کوہ نور تو ہے
پروانہ میں ازل سے تیرے چراغ کا ہوں — بچپن سے جرعہ کش ہیں تیرے ایاغ کا ہوں
اے جامِ خوابِ راحت میرے قریب آجا — آنکھوں میں میری بلجا دل میں مرے سما جا
یہ تھوڑی رات جو ہے کٹ جائے مجھ کو سوتے — اور تازہ دم میں اٹھوں ایسا کہ صبح ہوتے
رکھدوں طلسمِ بحرِ ظلمت کو توڑ کر میں — موتی کی طرح نکلوں دامن نچوڑ کر میں

بس آنکھ بند کر کے خاموش ہو گیا میں
دو جھونکے الیسے جھونکے آئے کہ سو گیا میں

شاہ اور ہم

(یعنی)

سرورِ قناعت

اگر شاہ مُلکِ ارم کا مکین ہے — بھرے گھر میں رنجش سے خالی نہیں ہے
ہماری طرح وہ بھی اندوہگیں ہے — اُسے فکرِ دنیا۔ ہمیں فکرِ دیں ہے

وہ اپنے الم میں ہم اپنے الم میں
رہا فرق کیا شاہ میں اور ہم میں؟

بظاہر سرِ شاہ پر تاجِ زر ہے — مگر باطناً روز و شب خوفِ سر ہے
وہاں قلب مجروح۔ زخمی جگر ہے — یہاں تیغ کا ڈر نہ فکرِ سپر ہے

ہم آرام میں ہیں شاہ رنج و سقم میں

یہی فرق ہے شاہ ہیں اور ہم ہیں

وہاں خوانِ نعمت مگر اشتہا کم
یہاں اشتہا پر سوالِ غذا کم
نہیں ہم کو اصلا خیالِ سوا کم
قناعت ہمارا خزانہ۔ ہے کیا کم؟

ہم آسودہ دل۔ شاہ حرصِ نعم ہیں
یہی فرق ہے شاہ ہیں اور ہم ہیں

وہاں چاپلوسی۔ تملّق۔ خوشامد
خوشامد برآمد سے بنتا سرآمد
دورنگی دلِ دوستاں کی شد آمد
وفا کی جدا امد۔ جفا کی جدا امد

نہ خوش مدح میں ہم۔ نہ مغموم ذم ہیں
یہی فرق ہے شاہ ہیں اور ہم ہیں

اگر شاہ کے ہاتھ میں جامِ جم ہے
یہاں اوک اپنا جو ہے کس سے کم ہے؟
اگر شاہ ملجائے نازو نعم ہے
دل اپنا غنی ہے۔ غنیمت یہ دم ہے

جو ہم میں ہے وہ شاہِ والا حشم ہیں
رہا فرق کیا شاہ ہیں اور ہم ہیں

وہ بدخواب ہیں۔ نومِ شب کھو رہے ہیں
مگر پاؤں پھیلائے ہم سو رہے ہیں
وہاں دیدۂ شاہ خوں رو رہے ہیں
یہاں اپنے آنسو گہر ہو رہے ہیں

ہم آزاد غم سے وہ پابندِ غم ہیں
یہی فرق ہے شاہ ہیں اور ہم ہیں؟

کوئی شاہ بادل بلادے تو جانیں
کوئی برق و باراں گرادے تو جانیں
کوئی حرفِ قسمت پڑھا دے تو جانیں
مقدّر کا لکھا مٹادے تو جانیں

نہ ہم میں یہ قدرت نہ اُس ذی ہمم ہیں
رہا فرق کیا شاہ ہیں اور ہم ہیں؟

وہاں جو فروش اور گندم نما ہیں — جو اعیانِ دولت ہیں زر آشنا ہیں
یہاں جتنے دم ساز ہیں بے ریا ہیں — نہ اہلِ غرض ہیں نہ اہلِ دغا ہیں
ہم اہلِ کرم ہیں وہ اہلِ ستم ہیں
یہی فرق ہے شاہ ہیں اور ہم ہیں

وہاں غلبۂ حرصِ کشور کشائی — یہاں مُلکِ تسلیم کی بادشائی
وہاں فرشِ سندس۔ بساطِ غنائی — یہاں بوریا مسندِ بے ریائی
ہم آزاد وہ فکرِ دام و درم میں
یہی فرق ہے شاہ ہیں اور ہم ہیں

وہاں جاوداں رشکِ جاہ و نعم ہے — حضوری میں بھی ہجر غیبت میں غم ہے
یہاں ایک ساں حالتِ بیش و کم ہے — نہ آنے کی شادی نہ جانے کا غم ہے
کھلے بند ہم۔ شاہ قیدِ خدم میں
یہی فرق ہے شاہ ہیں اور ہم ہیں

وفورِ دِل میں مسرت نہیں ہے — وہ مسرور ہے جو قناعت گزیں ہے
جسے فرشِ سنجاب سطحِ زمیں ہے — اُسی کا دلِ پاک عرشِ بریں ہے
ہم اور شاہ یکساں ہوئے جب شکم میں
رہا فرق کیا شاہ ہیں اور ہم ہیں؟

یہاں نیتِ نیک تاجِ ہما ہے — یہاں عرشِ دل سدرۃ المنتہا ہے
یہاں قلبِ قانع مسرت فزا ہے — جگر دولتِ عافیت سے بھرا ہے
ہم آلام و اغلال سمجھتے ہیں سَم ہیں
یہی فرق ہے شاہ ہیں اور ہم ہیں

ہمیں گنجِ عرفان واں اک بس ہے — کہ اللہ بس اور باقی ہوس ہے

ہوا و ہوس سے حذر ہر نفس ہے — نہ ذوق جہاں ہے نہ شوق قفس ہے
ہمارے قدم ہیں تلاش قدم میں
یہی فرق ہے شاہ میں اور ہم میں

ثمر ہم شجر میں۔ صدف میں گہر ہیں — گہن میں اگر ہیں تو مثل قمر ہیں
اگر آہ و نالے میں ہیں تو اثر ہیں — نہاں نیشکر میں مثال شکر ہیں
کسی حال میں ہم نہیں پیچ و خم میں
یہی فرق ہے شاہ میں اور ہم میں

وہی نزع ہے اور وہی جاں کنی ہے — ولادت وہی ہے وہی مردنی ہے
جو ہم پر وہی جان شہ پر بنی ہے — فقط شاہ میں کبر یا دمنی ہے
ہم آہ و فغاں میں وہ طبل و علم میں
یہی فرق ہے شاہ میں اور ہم میں

مگر کوئی مغلوب ہو یا کہ غالب — سیہ بخت یا کامیاب مطالب
جدا ہو گیا روح سے جبکہ قالب — برابر ہوئے دونوں مطلوب و طالب
بالآخر گئے دونوں یکساں عدم میں
رہا فرق کیا شاہ میں اور ہم میں!

نیا شوالہ

سچ کہدوں اے برہمن گر تو برا نہ مانے — تیرے صنم کدوں کے بت ہو گئے پرانے
اپنوں سے بیر رکھنا تو نے بتوں سے سیکھا — جنگ و جدال سکھایا واعظ کو بھی خدا نے
تنگ آکے میں نے آخر دیر و حرم کو چھوڑا — واعظ کا وعظ چھوڑا چھوڑے ترے فسانے

کچھ فکر پھوٹ کی کر مالی ہے تو چمن کا — بوٹوں کو پھونک ڈالا اس بس بھری ہوا نے

پتھر کی مورتوں میں سمجھا ہے تو خدا ہے
خاکِ وطن کا مجھ کو ہر ذرہ دیوتا ہے

آ اِل کے غیریت کی پردوں کو پھر اُٹھادیں — بچھڑوں کو پھر ملادیں نقشِ دوئی مٹادیں
سونی پڑی ہوئی ہے مدت سے جی کی بستی — آ اک نیا شوالہ اس دیس میں بنادیں
دنیا کے تیرتھوں سے اونچا ہو اپنا تیرتھ — داماں آسماں سے اس کا کلس ملادیں
پھر اک انوپ ایسی سونے کی مورتی ہو — اس ہردوار دل میں لاکر جسے بٹھادیں
سندر ہو اس کی صورت چھب اسکی موہنی ہو — اس دیوتا سے مانگیں جو دل کی ہوں مرادیں
زنار ہو گلے میں تسبیح ہاتھ میں ہو — یعنے صنم کدے میں شانِ حرم دکھادیں
پہلو کو چیر ڈالیں درشن ہو عام اسکا — ہر آتما کو گویا اک آگ سی لگادیں
آنکھوں کی ہے جو گنگا لے لیکے اس سے پانی — اس دیوتا کے آگے اک نہر سی بہادیں
ہندوستاں لکھدیں ماتھے پہ اس صنم کے — بھولے ہوئے ترانے دنیا کو پھر سنادیں
ہر صبح اُٹھ کے گائیں منتر وہ میٹھے میٹھے — سارے پجاریوں کو مے پیت کی پلادیں
مندر میں ہو بلانا جس دم پجاریوں کو — آوازہ اذاں کو ناقوس میں چھپادیں
اگنی ہے وہ جو نرگن کہتے ہیں پیت جس کو — دھرموں کے یہ بکھیڑے اس آگ میں جلادیں

ہے ریت عاشقوں کی تن من نثار کرنا
رونا ستم اُٹھانا اور ان کو پیار کرنا

تسکینِ قلب

مرے چاہنے والے کیوں رو رہے ہیں
یہ جاں اپنی کس واسطے کھو رہے ہیں؟

میں مردہ نہیں ہوں ٹھکانے سے جی ہے
کہوں کیا مرے دل کو کیسی خوشی ہے

نہ روئیں ۔ نہ روئیں ۔ ابھی خشک ہونگے
جو قطرے ہیں رخسار پر آنسوؤں کے

مرا حال سنکر انہیں غم نہ ہوگا
وہ رنج و تعب اور وہ ماتم نہ ہوگا

بر آئی ہے مرنے پہ میری تمنا
وہاں پہنچا ملنے کا وعدہ جہاں تھا

خدا نے نصیبوں سے یہ دن دکھائے
ثمر خشک شاخوں میں اب جا کے آئے

یہاں تاج تاروں کا ہے میرے سر پر
کہاں جا کے چمکا ہے میرا مقدر

ٹہلتا ہوں ہر وقت خلدِ بریں میں
محبت کا معدن ہے جس سرزمیں میں

میرے چاہنے والے ہرگز نہ روئیں
غمِ ہجر میں جان اپنی نہ کھوئیں
میرے واسطے رنج اٹھانے سے حاصل
یہ رونے سے آنسو بہانے سے حاصل

وہاں میرے رہنے کی تھی کون صورت
جہاں تھی مروت ۔ محبت نہ الفت

گناہوں کا اور موت کا تھا جو مسکن
جہاں ایک صورت میں تھی دوست دشمن

جہاں ابرِ غم تھا ۔ اندھیرا بہت تھا
جہاں جان جانے کا کھٹکا بہت تھا

یہاں کی مگر زندگی زندگی ہے
سراپا مسرت مجسم خوشی ہے

یہاں ناز کرتے ہیں مجھ پر فرشتے
اٹھے ہر طرف سے ان آنکھوں کے پردے

مکاں ہے مرا جلوہ گاہِ محبت
میسر ہے ہر دم کسی کی زیارت

یہ اس مصحفِ رُخ میں لکھا ہوا ہے ”خوشی میں بقا ہے تو بعد فنا ہے“
جو پہنچا یہاں تک یہ اُس کی عنایت خوشا میری قسمت - خوشا میری قسمت

میرے چاہنے والے ہرگز نہ روئیں
غمِ ہجر میں جان اپنی نہ کھوئیں
میرے واسطے رنج اُٹھانے سے حاصل
یہ رونے سے آنسو بہانے سے حاصل

وہ ساعت بھی نزدیک آ گئی ہے کہ آنے کی جس کے مجھے بھی خوشی ہے
اُنہیں لائے گا یاں فرشتہ قضا کا کہ ہو سامنا اس جہاں میں خدا کا
لپٹ کر وہ اُس وقت مجھ سے ملینگے دُعائیں بڑی دیر تک مجھ کو دینگے
جدائی پھر اُن سے کسی دم نہ ہوگی کبھی صحبتِ عیش برہم نہ ہوگی
دیارِ جہاں کی بہت خاک اُڑائی سوا کوفت کے کچھ بھی راحت نہ پائی
ٹھہرنے کے قابل وہ بستی نہیں ہے جو سمجھو تو ہستی کی ہستی نہیں ہے
وہ مانگیں دعا حق سے معبود میرے! اب اِس دارِ فانی سے جلدی اُٹھا لے
طبیعت یہاں آکے مسرور ہوگی سیاہی شبِ غم کی کافور ہوگی

میرے چاہنے والے ہرگز نہ روئیں
غمِ ہجر میں جان اپنی نہ کھوئیں
میرے واسطے رنج اُٹھانے سے حاصل
یہ رونے سے آنسو بہانے سے حاصل

داغ

عظمتِ غالب ہے اک مدت سے پیوندِ زمیں
مہدیِ مجروح ہے شہرِ خموشاں کا مکیں

توڑ ڈالی موت نے غربت میں مینائے امیر
چشمِ محفل میں ہے اب تک کیفِ صہبائے امیر

آج لیکن ہمنوا سارا چمن ماتم میں ہے
شمعِ روشن بجھ گئی بزمِ سخن ماتم میں ہے

چل بسا داغ آہ! میت اسکی زیبِ دوش ہے
آخری شاعر جہان آباد کا خاموش ہے

اب کہاں وہ بانکپن وہ شوخیِ طرزِ بیاں
آگ تھی کافورِ پیری میں جوانی کی نہاں

تھی زبانِ داغ پر جو آرزو ہر دل میں ہے
لیلیٰ معنی وہاں بے پردہ یاں محمل میں ہے

اب صبا سے کون پوچھیگا سکوتِ گل کا راز
کون سمجھیگا چمن میں نالۂ بلبل کا راز

تھی حقیقت سے نہ غفلت فکر کی پرواز میں
آنکھ طائر کی نشیمن پر رہی پرواز میں

جوہرِ رنگیں نوائی پا چکا جس دم کمال
پھر نہ ہو سکتی تھی ممکن میر و مرزا کی مثال

کر دیا قدرت نے پیدا ایک دونوں کا نظیر
داغ یعنی وصلِ فکرِ میرزا و درد و میر

شعر کا کاشانہ لیکن آج پھر ویراں ہوا
دیدۂ خونبار پھر منت کشِ داماں ہوا

بلبلِ دہلی نے باندھا اس چمن میں آشیاں
ہم نوا ہیں سب عنادل باغِ ہستی کے جہاں

کم نہیں محشر سے کچھ ایسی صدا کی خامشی
آہ! اے دل سوز ہی تو تھی گو نکتہ آموزی نہ تھی

اور دکھلائینگے مضموں کی ہمیں باریکیاں
اپنے فکرِ نکتہ آرا کی فلک پیمائیاں

تلخیِ دوراں کے نقشے کھینچکر رلوائینگے
یا تخیل کی نئی دنیا ہمیں دکھلائینگے

اس چمن میں ہونگے پیدا بلبلِ شیراز بھی
سیکڑوں ساحر بھی ہونگے صاحبِ اعجاز بھی

اُٹھینگے آذر ہزاروں شعر کے بتخانے سے
مے پلائینگے نئے ساقی نئے پیمانے سے

لکھی جائینگی کتابِ دل کی تفسیریں بہت
ہونگی اے خوابِ جوانی تیری تعبیریں بہت

ہو بہو کھینچیگا لیکن عشق کی تصویر کون
اُٹھ گیا ناوک فگن مارے گا دل پر تیر کون

اشک کے دانے زمینِ شعر میں بوتا ہوں میں
تو بھی رو اے خاکِ دلی داغ کو روتا ہوں میں

آہ اے بیت الحرمِ مذہبِ اہلِ سخن
ہو گیا پھر آج پامالِ خزاں تیرا چمن

وہ گلِ رنگیں ترا رخصت مثالِ بو ہوا
یعنی خالی داغ سے کاشانۂ اردو ہوا

تھی نہ شاید کچھ کشش ایسی وطن کی خاک میں
وہ مہِ کامل ہوا پنہاں دکن کی خاک میں

اُٹھ گئے ساقی جو تھے میخانہ خالی رہ گیا
یادگارِ بزمِ دہلی ایک خالی رہ گیا

آرزو کو خون رلواتی ہے بیدادِ اجل
مارتا ہے تیر تاریکی میں صیادِ اجل

کھل نہیں سکتی شکایت کے لیے لیکن زباں
ہے خزاں کا رنگ بھی وجہِ قیامِ گلستاں

ایک ہی قانون عالمگیر کے ہیں سب اثر
بوئے گل کا باغ سے گلچیں کا دنیا سے سفر

بچپن کی یاد

تیرے ایاغ کا ہوں میں جرعہ خوار بچپن
باقی ہے تیری مے کا اب تک خمار بچپن

تیرے فراق میں ہوں بیچین بیقرار بچپن
کرلوں گلے لگا کر آ! تجھ کو پیار بچپن

کیوں مجھ سے روٹھ بیٹھا تیرے نثار بچپن

پھر خاک کا گھروندا آنگن میں میں بناؤں
چھوٹی سی اپنی کشتی پانی میں پھر بہا لوں

طفلی کے پیارے پیارے معصوم گیت گا لوں
پھر بانسری بجا لوں پھر جھنجھنا بجا لوں

دو دن کو اے جوانی! دے دے اُدھار بچپن

وہ عہدِ بیخودی بھی پروردگار! کیا تھا
حسرت کی جب نظر سے ہر شے کو دیکھتا تھا

نیچر کا جو نظارا تھا آرزو فزا تھا
قوسِ قزح کے پیچھے میں دن کو دوڑتا تھا

بہرِ قمر تھا شب کو میں اشکبار بچپن

تو آئے ہائے طفلی! جا کر کہاں ہے گمسن
اور میرے ساتھ کھیلیں میرے رفیق کم سن

تیرا خیال پھر بھی تسکیں فزا ہے تسکیں
گلیوں میں دوڑتا تھا کس لطف کی تھی وہ دن

گھوڑی پہ اپنے ہو کر جب میں سوار بچپن

تو نے کبھی جوانی! طفلی کے کیا کھلونے
وہ میرے ننھے ننھے تسکیں فزا کھلونے

میں جن سے کھیلتا تھا وہ دلربا کھلونے
لا دے کہیں سے مجھ کو وہ خوشنما کھلونے

اُن پیاری صورتوں کو ہوں بیقرار بچپن

پیارا تھا باپ کا میں اور ماں کا لاڈلا تھا
گھر بھر میں پھول گویا میں اک گلاب کا تھا

صورت بھی دلربا تھی چہرہ بھی خوشنما تھا
وہ ننھے ننھے تلوے۔ وہ اُبھرا اُبھرا ماتھا

بھولے نہیں وہ تیرے نقش و نگار بچپن

منت کی وہ گلے میں چھوٹی سی آہ ہیکل
کانوں میں ہلکے ہلکے وہ موتیوں کے کنڈل

وہ لمبے لمبے گیسو لٹکے ہوئے مسلسل
وہ سرخ سرخ غازہ۔ بہتا ہوا وہ کاجل

وہ ہائے تیرا جوبن۔ اور وہ سنگھار بچپن

پھولوں کا وہ مہکنا۔ کلیوں کا وہ چٹکنا
سبزہ کا وہ لہکنا۔ شاخوں کا وہ لچکنا

چڑیوں کا وہ پھدکنا۔ قمری کا وہ چہکنا
وہ رعد کا گرجنا۔ بجلی کا وہ چمکنا

وہ ٹھنڈی ٹھنڈی جھڑیاں اور وہ بہار بچپن

کیچڑ میں وہ پھسل کر گلیوں میں لوٹ جانا
اور میرے ہم سنوں کا وہ قہقہے لگانا

شانہ پکڑ کے میرا آہستہ پھر اٹھانا
لت پت وہ گھر کو آنا۔ وہ ماں کا مسکرانا

کرتہ نیا بدل کر کرتا وہ پیار بچپن

آ! عمرِ رفتہ آکر مجھ کو گلے لگا لے
آ! اے شباب! میری طفلی کی ناز اٹھا لے

عمرِ رواں نے تجھکو کس کے کیا حوالے
پایا نشاں نہ تیرا۔ او چھپ کے جانیوالے

کھویا گیا کہاں تو۔ تیرے نثار بچپن

کوئل کی آہ! کوکو وقتِ سحر وہی ہے
نالوں میں بلبلوں کے اب بھی اثر وہی ہے

تیرا بھی او پپیہے! سوزِ جگر وہی ہے
سورج وہی ہے دن کو شب کو قمر وہی ہے

تیرے مگر کہاں وہ لیل و نہار بچپن

تو نے چرا لیا ہے بچپن میرا جوانی
تیری طرف سے ظالم ہے مجھ کو بدگمانی

اک تیرے دم سے طفلی تھا لطفِ زندگانی
میں غمزدہ سناؤں غم کی کسے کہانی

تو ہی نہیں رہا جب او غمگسار بچپن

داغوں سے میں سجاتا چھوٹی سی تیری خلوت
نالوں کو ساتھ لیکر کرتا طوافِ تربت

مجھ غمزدہ کی لیکن ایسی کہاں تھی قسمت
جلتا جو میرا قابو۔ تو آہ! وقتِ رحلت

پہلو میں میں بناتا تیرا مزار بچپن

تجھ کو خبر نہیں ہے میرے غمِ نہاں کی
آ! چاشنی چکھاؤں نطقِ شکستہ تشناں کی

تکرار یہ بھی کوئی ہے نالہ و فغاں کی
بھاتی نہیں پپیہے! رٹ مجھ کو پی کہاں کی

ملیں کہہ کے روؤں "طفلی" اور تو پکار بچپن

وائے کہ دوشِ ماں کے آغوش سے جدا ہوں
سڑکوں پہ خاک اڑاتا گلیوں میں لوٹتا ہوں

طفلی کی آرزو والو تم سے بچھڑ گیا ہوں
ان پیاری لوریوں کو کب سے ترس رہا ہوں

لے لے شباب۔ دے دے پروردگار بچپن

ماں کی مامتا

(یا)

خوابِ محبّت

کل رات انتہا کا مجھے اضطراب تھا
دِل جل رہا تھا رنج سے سینہ کباب تھا

روتی تھی اپنے بچہ مرحوم کے لئے
گویا گناہ[1] کرتی تھی معصوم کے لئے

ہاری تھی مامتا سے جو گریہ کناں تھی میں
کیونکہ نہ اپنے بچے کو روتی کہ ماں تھی میں!

پالا تھا جس کو رنج مصیبت میں حیرمیں
ہیہات وا اب آئی تھی میں اسکو قبر میں

نیند آگئی ذرا جو غم و اضطراب میں
طرفہ تماشا مجھ کو نظر آیا خواب میں

تقدیر نے نوید رسائی دیا مجھے
بچوں کا ایک غول دکھائی دیا مجھے

تاروں کے ساتھ مہ نورزا بھی تھا
یعنی اُنہیں کے زُمرے میں بچہ مرا بھی تھا

سب پاک تھی خیال میں دِل میں نگاہ میں
دامن کسی کا تھا نہ ملوّث گناہ میں

کچھ فرق و امتیاز نہ تھا خوب و زشت کا
ہر ایک کے گلے میں تھا حُلہ بہشت کا

نورانی سب کے چہرے تھے کچھ بِی صفا نہ تھا
سب تھے سفید پوش کوئی دوسرا نہ تھا

آکر مرے قریب۔ رفیقوں کو چھوڑ کے
کہنے لگا وہ لال مرا ہات جوڑ کے

"نُورِ نظر کے واسطے آنکھیں نہ کھوئیے
قربان جاؤں آپ کے اماں نہ روئیے"!

---

[1] مردے کے لئے رونا عذاب ہے ۱۲۔

ہر طفلِ نونہال کا دل باغ باغ تھا
ہر ماہ وش کے ہات میں اک اک چراغ تھا

روشن تھا ہر چراغ بڑی آب و تاب سے
دل کا کنول کھلا تھا فزوں تر گلاب سے

لیکن یہ حال دیکھ کے صدمہ ہوا ہوا
یعنی مرے پسر کا دیا تھا بجھا ہوا!

اس کا چراغ گل جو نظر مجھ کو آ گیا
آنکھوں میں میری ایک اندھیرا سا چھا گیا!

پوچھا کہ اے قرارِ دل و جاں یہ کیا ہوا؟
تیرا چراغ کیوں ہے ابھی تک بجھا ہوا؟

کہنے لگا وہ، کیا کہوں اندوہ سخت ہے
یہ نورِ چشم آپ کا تاریک بخت ہے

اعمال سے مرے ہے نہ قہرِ خدا سے ہے
میرا یہ حال آپ کے گریہ بکا سے ہے!

اماں مجھے بھی تھا۔ وہی روشن دیا دیا
لیکن تمہاری آہ نے اس کو بجھا دیا!

"سینے پہ اب سے صبر کی سِل رکھ کے سوئیے
قربان جاؤں آپ کے۔ اماں نہ روئیے!"

رونے سے روحِ پاک کو میری عذاب ہے
اچھا نہیں یہ حال تمہارا خراب ہے

رونے نے آپ کے مجھے پانی بنا دیا
باران بن کے اوس نے گل کو گلا دیا!

معصوم تھا شمول نہ رکھتا تھا زشت میں
مجھ کو جگہ ملی ہے ریاضِ بہشت میں

لیکن تمہاری گود میں جو لطف تھا مجھے
زنہار وہ مزہ نہ ارم میں ملا مجھے!

دم توڑتا تھا جب میں تمہاری کنار میں
اس دم بھی تم کو دیکھ کے دل تھا قرار میں!

مجھ سے قضا نے ساتھ تمہارا چھڑا دیا
ہم جولیوں کے غول میں لا کر ملا دیا

کیا فائدہ ملال و بکا سے اٹھاؤ گی؟
مر جاؤ گی جو رو کے، تو مجھ کو نہ پاؤ گی

اک بات اور بھید کی کہتا ہوں کان میں
اماں کوئی کسی کا نہیں ہے جہان میں!

تخمِ ملال کشتِ جگر میں نہ بوئیے
قربان جاؤں آپ کے اماں نہ روئیے!

فغانِ محسن

یہ بیٹھے بٹھائے مجھے کیا ہوا — تڑپنے لگا دل اچھلنے لگا
زمیں تک میرے آنسو آنے لگے — فلک تک میرے نالے جانے لگے
جگر میں تپش لب پہ شیون ہے کیوں — مجھے آپ ہی آپ اُلجھن ہے کیوں
میری چشم تر کا یہ کیا حال ہے — کہ دامن سے تا آستیں لال ہے
مرا رنگ فق ہوتا جاتا ہے کیوں — بدن خود بخود سنسناتا ہے کیوں
سبب کیا کہ میں سر کو دُھننے لگا — ہوا کیا کہ میں تنکے چننے لگا۔
ہنسی میں میرے آنسو بہنے لگے — مجھے لوگ سودائی کہنے لگے
نیا راگ لائی میری بیکسی — چھٹا دیس جنگل کی دھن ہو گئی
میرے منہ پہ زردی سی کیوں چھا گئی — چمن میں مرے کیوں خزاں آ گئی
پسینے کبھی دیکھے نکلتے ہوئے — ہے گھبراہٹ اتنی مجھے کس لئے
کڑی اپنے ہاتھوں اُٹھاتے چلا — کھلے بند میں قید خانے چلا
خزاں آئے تو دل کو کھٹکا نہیں — بہار آنے کی مجھ کو پروا نہیں
طبیب آئیں بالیں پہ تو دم گھٹیں — میری نبض دیکھیں تو نبضیں چھٹیں
کوئی فصد لے یاں اثر تک نہ ہو — کوئی پچھنے دے یاں خبر تک نہ ہو
عجب طرح کا ہے یہ دیوانہ پن — نہ ذوقِ خموشی نہ شوقِ سخن
اگر ہے محل گفتگو کی ٹھنی — ملا نطق کو خلوتِ سکسنی
خموشی ہوئی گر بجائے سخن — ملا نالہ کو سُرمئی پیرہن
جو سوتے میں شب کو رہی بیکلی — تو خوابِ پریشاں سے نیند اُڑ گئی

جو دن کو بھی سوزِ باطن رہا / تو دن بھر مرا کیا برا دن رہا
خوش آتی نہیں اب مجھے کوئی شے / نہ دریا نہ گلشن نہ مینا نہ مے
نہیں کوئی ساماں مجھے سازوار / نہ ساقی نہ مطرب نہ فصلِ بہار
کبھی میری کیفیت ایسی نہ تھی / یہ شورش یہ سوزش یہ گرمی نہ تھی
خوشی مجھ سے ناآشنا بھی نہ تھی / کبھی مجھ کو ایسی اداسی نہ تھی
نہ ایسی کبھی بیقراری ہوئی / نہ مجھ پر غشی ایسی طاری ہوئی
نہ آنکھوں کے پردے گلابی ہوئے / نہ تار آنسوؤں کے شہابی ہوئے
تپش یہ جگر میں نہ تھی متصل / نہ ہاتھوں اچھلتا تھا واللہ دل
تڑپتا ہے یوں مرغِ بسمل کہیں / ہیں آنکھیں کہیں جان کہیں دل کہیں
گھڑی بھر میں میں ہو گیا گرد برد / ستم ہے غضب ہے کلیجے کا درد
نہ کیا کیا ہوس زندگانی میں تھی / مگر موت آئی جوانی میں تھی
کوئی دم میں دم ہی نکلتا ہے آج / کلیجہ مرا کوئی ملتا ہے آج
چلی آتی ہیں ہچکیاں دمبدم / مجھے یاد کرتے ہیں اہلِ عدم
اندھیرا مری آنکھوں میں چھا گیا / جبیں پر بھی دیکھو عرق آگیا
تڑپنے مجھے دو نہ بولو ذرا / میرے ہاتھ اور پاؤں کھولو ذرا
نہ للہ مجھ کو سنبھالے کوئی / مرے منہ میں پانی نہ ڈالے کوئی
سکر وحی یاروں کو دکھلاؤں میں / کہ بو ہو کے غنچے سے اڑ جاؤں میں
میں کس واسطے خاطر آزار ہوں / کسی کے دل و دوش کا بار ہوں
ہو آنکھوں سے آبِ رواں موجزن / اسی میں نہاؤں وہی ہو کفن
میرے فاتحہ کو نہ آئے کوئی / جنازہ نہ میرا اٹھائے کوئی
نہ قل ہو نہ پھول اور نہ میلا رہے / میرا مردہ سب سے اکیلا رہے

نہ شمعِ لحد کا بھی آنسو بہے
فقط بیکسی مجھ کو روتی رہے

خفا کر کے محسن نہ پھیریں مجھے
فرشتوں سے کہہ دو نہ گھیریں مجھے

سمجھتا نہیں ہیں حساب و کتاب
یہ رکھتا ہوں اک مختصر سا جواب

نہ میں نے کیا کچھ نہ جانا کبھی
مگر سجدۂ آستانِ نبی

خطا بخش بدلوا نگہ کبریا
حبیبِ خدا اشرفِ انبیاء

نہ اسمائے اور روزِ امید و بیم
شفیعِ مطاعِ نبیِ کریم۔

شمع و پروانہ

پروانہ تجھ کو کرتا ہے اے شمع پیار کیوں
کرتا ہے اپنی جان کو تجھ پر نثار کیوں؟

وہ بات تجھ میں کیا ہے کہ یہ بیقرار ہے؟
جاں در ہوائے لذتِ خوابِ مزار ہے؟

کیوں بے قرار کرتی ہے تیری ادا اسے؟
آدابِ عشق تو نے سکھائے ہیں کیا اسے؟

کرتا ہے یہ طواف تری جلوہ گاہ کا
پھونکا ہوا ہے کیا تری برقِ نگاہ کا؟

آزارِ موت میں اسے آرامِ جاں ہے کیا
شعلے میں تیرے زندگیِ جاوداں ہے کیا

غم خانۂ جہاں میں جو تیری ضیا نہ ہو
اس تفتہ دل کا نخلِ تمنا ہرا نہ ہو

بے اختیار سوز سے تیری بھڑک اٹھا
قسمت کا اپنی بن کے ستارا چمک اٹھا

گرنا ترے حضور میں اس کی نماز ہے
ننھے سے دل میں لذتِ سوز و گداز ہے

کچھ اس میں جوشِ عاشقِ حسنِ قدیم ہے
چھوٹا سا طور تو یہ ذرا سا کلیم ہے

تھوڑی سی روشنی پہ فدا ہو رہا ہے یہ
اک نور ہے کہ جس میں فنا ہو رہا ہے یہ

پروانہ کیا ہے؟ اک دلِ ایذا طلب ہے یہ
عینِ وصال و سوزِ جدائی غضب ہے یہ!

پروانہ اور ذوقِ تماشائے روشنی
کیڑا ذرا سا اور تمنائے روشنی

(اقبال)

غزلیات

بھلاتا لاکھ ہوں لیکن وہ اکثر یاد آتے ہیں — الٰہی ترکِ الفت پر وہ کیونکر یاد آتے ہیں

سکونِ خاطرِ ناکام کی تکلیف کیا کہیے — جنون و وحشت و فصّاد و نشتر یاد آتے ہیں

نہ چھیڑ اے ہمنشیں کیفیتِ صہبا کے افسانے — شرابِ بیخودی کے مجھ کو ساغر یاد آتے ہیں

رہا کرتے ہیں قیدِ ہوش میں اے وائے ناکامی — وہ دشتِ خود فراموشی کے چکر یاد آتے ہیں

خیالِ یار کا دل سے خفا ہونا قیامت ہے — کسی کے عشوہ ہائے ناز پرور یاد آتے ہیں

نہیں آتی تو یاد انکی مہینوں تک نہیں آتی — مگر جب یاد آتے ہیں تو اکثر یاد آتے ہیں

اسی پر ناز تھا حسرت تجھے ترکِ محبّت کا
تجھے تو اب وہ پہلے سے بھی بڑھکر یاد آتے ہیں

"حسرت موہانی"

کٹ گئی بے مدعا ساری کی ساری زندگی! — زندگی سی زندگی ہے یہ ہماری زندگی!

کیا ارادوں سے ہے حاصل؟ طاقت و فرصت کہاں؟ — ہائے کہلاتی ہے کیوں بے اختیاری زندگی!

اے سرِ شوریدہ اب تیرے وہ سودا کیا ہوئے؟ — کیا سدا سے تھی یہی غفلت شعاری زندگی؟

دردِ الفت کا نہ ہو تو زندگی کا کیا مزا؟ — آہ و زاری زندگی ہے بیقراری زندگی؟

آرزوئے زیست بھی یاں آرزوئے دید ہے — تو نہ پیارا ہو تو مجھ کو ہو نہ پیاری زندگی

اور مرجھائیگی تیری چھیڑ سے دل کی کلی — گر نہ دو بھر مجھ پہ آئے بادِ بہاری زندگی

یاں تو اے نیرنگ دونوں کے لئے ساماں نہیں
موت بھی مجھ پہ گراں ہے گر ہے بھاری زندگی

"زینب"

جسم کا ساتھ چھوٹا آپ سے باہر ہم ہیں — اب تو اپنے لئے اک غیر سے بدتر ہم ہیں

جلوۂ یار پہ ٹھہری رہیں تا دیر آنکھیں
نہ خدا ہیں نہ امام اور نہ پیمبر ہم ہیں

کان مشتاق ہیں آنکھوں کی طرح مدت سے
دید و آواز کہ اس پردہ کے اندر ہم ہیں

تھک گئے پاؤں گئی دربدری شکرِ خدا
اب یوں ہی تا بہ قیامت ترے در پر ہم ہیں

تا قیامت رہے آئینہ سلامت یارب
ہر حسیں کو ہے یہ دعویٰ کہ سکندر ہم ہیں

دشتِ امید کی جانب جو بڑھایا ہو قدم
موت کہتی ہے یہ آہستہ کہ سر پر ہم ہیں

فکر رکھتی ہے سرما کے لئے گرما میں
ایک چیونٹی سے بھی تدبیر میں کمتر ہم ہیں

عقل سے راہ جو پوچھی تو پکارا یہ جنوں
وہ تو بھٹکی ہوئی خود پھرتی ہے رہبر ہم ہیں

دل یہ کہتا ہے ہمیں دیکھ کتابوں پہ نہ جا
قدرتِ صانع مخلوق کے دفتر ہم ہیں

پھر تو ہو جائینگے بازارِ جہاں میں مہنگے
شاد ارزاں ہیں جبھی تک کہ میسر ہم ہیں

(شاد عظیم آبادی)

راحتیں طولِ مرض کی صرفِ درماں ہو گئیں
زندگی جن مشکلوں سے تھی وہ آساں ہو گئیں

صورتِ امید کی خوابِ پریشاں ہو گئیں
سامنے آنکھوں کے آئیں اور پنہاں ہو گئیں

کچھ دلوں لغظے نے جنکا خود کیا تھا التزام
اب وہ تکلیفیں سراسر جزوِ ایماں ہو گئیں

اُن سے کیا لطفِ تعلق اُن سے کیا دلبستگی
غیر کے ماتم میں جو زلفیں پریشاں ہو گئیں

عالمِ غربت میں وہ یادِ وطن کی لذتیں
رفتہ رفتہ نذرِ شوقِ خانہ ویراں ہو گئیں

بے مروت سی جو قبریں کوچہ وحشت میں تھیں
وہ بھی آخر صرفِ استحکامِ زنداں ہو گئیں

ناخنِ وحشت نے سینہ پر جو کیں گلکاریاں
فصلِ گل میں زینتِ چاکِ گریباں ہو گئیں

چند باتیں وہ جو ہم رندوں میں تھیں ضرب المثل
اب سنا مرزا کہ وردِ اہلِ عرفاں ہو گئیں

(مرزا محمد ہادی رسوا)

دیکھی جھلک جو عشق کی کل بزمِ راز میں — تصویرِ مرگ پھر گئی چشمِ مجاز میں
شعلے لگے دہن سے نکلنے نفس کے ساتھ — قلب و جگر حریف بنے سوز و ساز میں
دشتِ ہوس میں آگیا طوفانِ اشکِ شرم — برقِ فنا سے آگ لگی کِشتِ آز میں
پائے شکیب ڈگنے لگے فرطِ خوف سے — ہوش و حواس چل دیئے اس ترکتاز میں
علم و عمل کا دفترِ پارینہ لُٹ گیا — زہد و ورع لپٹ گئے سب جانماز میں
بھاگی سپاہِ عقل گئے ہاتھ پانو پھول — چوٹیں چلیں جو بیخودی و امتیاز میں
یکبار گی حجاب جو تھے دُور ہو گئے — باقی رہا نہ فرق نماز و نیاز میں
منصب ملا جو شوق کو پھر احتساب کا — بحثیں شروع ہوگئیں مے کے جواز میں
بولا کہ حکم پیرِ مُغاں جو ہو وُہ کرو — خودداریاں نہ چاہئیں اہلِ نیاز میں
مانا کہ مے حرام سہی یہ حلال ہے — پینا پڑے گا خونِ جگر بزمِ ناز میں

دربارِ عشق میں جبھی ضامن ملیگا بار
جب وسوسہ رہے نہ دلِ پاکباز میں

جب مرے ہونٹوں سے لعلِ شکریں چھوٹے ہوئے — لفظ جو دشنام کے نکلے وہ سب ٹوٹے ہوئے
بزمِ دشمن سے اب آئے ہو مزے لوٹے ہوئے؟ — ہوش میں آؤ کہیں جڑتے ہیں دِل ٹوٹے ہوئے
تم یہاں دیکھو تو آکر ہجر میں کیا حال ہے؟ — دل کے ہاتھوں آج سو سو حشر ہیں ٹوٹے ہوئے
وائے ناکامی کہ گلشن میں خزاں آنے لگی — دو ہی دن گذرے تھے ہم کو قید سے چھوٹے ہوئے
چاہنے والے تری فرقت میں جی سکتے نہیں — زندگی سے ہیں فداروں کے جی چھوٹے ہوئے
دلفریبی لالہ رویوں کی نہیں مٹتی کبھی — یہ ستمگر خاک ہو کر بھی تو گل بوٹے ہوئے
سچ یہ ہے۔ گرنا کسی کی آگ میں اچھا نہیں — دِل کو روتے ہیں جگر کے آبلے پھوٹے ہوئے
شمع کا آنسو نہیں تھمتا ہے اُنکی یاد میں — اُڑتے پھرتے ہیں جو پروانوں کے پر ٹوٹے ہوئے

اپنی سوزش کا کیا ہے شمع نے اچھا علاج — رکھ لئے ہیں دل میں پروانوں کے پر ٹوٹے ہوئے

سونگھ لے شاعر اگر ہے کچھ دماغ بوئے گل

میرے گلشن کے یہ تازے پھول ہیں ٹوٹے ہوئے

[illegible]

ظاہر کی آنکھ سے نہ تماشا کرے کوئی — ہو دیکھنا تو دیدۂ دل وا کرے کوئی

منصور کو ہوا لبِ گویا پیامِ موت — اب کیا کسی کے عشق کا دعویٰ کرے کوئی

ہو دید کا جو شوق تو آنکھوں کو بند کر — ہے دیکھنا یہی کہ نہ دیکھا کرے کوئی

میں انتہائے عشق ہوں تو انتہائے حسن — دیکھے مجھے کہ تجھ کو تماشا کرے کوئی

عذر آفرینِ جرمِ محبت ہے حسنِ دوست — محشر میں اور عذر نہ پیدا کرے کوئی

چھپتی نہیں ہے یہ نگہِ شوق ہم نشیں — پھر اور کس طرح انہیں دیکھا کرے کوئی

اڑ بیٹھے کیا سمجھ کے بھلا طور پر کلیم — طاقت ہو دید کی تو تقاضا کرے کوئی

سو سو امید بندھتی ہے اک اک نگاہ پر — مجھ کو نہ ایسے پیار سے دیکھا کرے کوئی

دیکر جھلک سی آپ تو پردے میں ہو رہے — اور کھو گئے نگاہ کو ڈھونڈا کرے کوئی

نظارہ کو یہ جنبشِ مژگاں بھی بار ہے — نرگس کی آنکھ سے تجھے دیکھا کرے کوئی

محفل ہو شغلِ مے ہو شبِ ماہتاب ہو — اور میں گروں تو مجھ کو سنبھالا کرے کوئی

بولے بھی سن کے قصۂ ہجراں تو یہ کہا — کی دل لگی تو یہ بھی گوارا کرے کوئی

کھل جائیں کیا مزے ہیں تمنائے شوق میں — دو چار دن جو میری تمنا کرے کوئی

اقبال عشق نے مرے سب بل دیئے نکال

مدت سے آرزو تھی کہ سیدھا کرے کوئی

(شیخ محمد اقبال)

روش حسن مراعات چلی جاتی ہے — ہم سے اور اُن سے وہی بات چلی جاتی ہے

کچھ رہی تھی ہوسِ مے سو تغافل سے ترے — وہ بھی اے پیرِ خرابات چلی جاتی ہے

ہم سے ظاہر میں وہ ہر چند خفا ہیں لیکن — کوششِ پرسشِ حالات چلی جاتی ہے

ان کو ہم اُن سے بگڑتے ہیں وہ شکوہ ہم سے — رسمِ پابندیِ اوقات چلی جاتی ہے

ہائے رے سادگیِ شوق کہ اب تک اُن سے — خواہشِ لطفِ ملاقات چلی جاتی ہے

اس ستمگر کو ستمگر نہیں کہتے بنتا
سعیِ تاویلِ خیالات چلی جاتی ہے

حسرت موہانی

نوید یاس دیتی ہے مجھے ہر آرزو میری — نہ کر مٹی خراب اے سعیِ ہیچ انجام تو میری

چھپے ہو لاکھ پردوں میں بھی تم تو اس سے کیا حاصل — تمہارے عشق میں رسوائیاں ہیں کو بکو میری

چھپو گے کیا مرا ذوقِ طلب بھی تم نے دیکھا ہے — ورائے لامکاں ہے انتہائے جستجو میری

یہ پیچ و تاب یہ الجھن یہ اندازِ پریشانی — کہانی تیرے گیسو کہہ رہے ہیں مو بمو میری

محبت کی قیود کو توڑا ہے سودائے محبت نے — لگی ہیں تیرے پیچھے پھر نگاہیں سو بسو میری

ترا انصاف جب مجھ کو ذرا آنکھیں دکھاتا ہے — بندھا دیتا ہے ڈھارس مژدۂ لاتقنطوا میری

طلب نے کھائی ہیں وہ ٹھوکریں راہِ تمنا میں — کہ آخر مجھ سے شرمانے لگی ہے آرزو میری

وہ گل ہوں سادگی میں میری سو رنگینیاں نکلیں — مشامِ روح کو بھاتی ہے بھینی بھینی بو میری

مرا ہر لفظ سادہ اک صدف ہے درِ معنی کا — سمجھ پیدا کرے تو کوئی سمجھے گفتگو میری

تصنع کا نہیں احسان میری قدر و قیمت پر — ملی فطرت سے مجھ کو مثلِ گوہر آبرو میری

سلاست مانعِ مشکل پسندی ہو نہیں سکتی
ادق ہے حضرتِ نیرنگ طرزِ گفتگو میری

نیرنگ

ہنس کے فرمانے لگے سن کے وہ نالے میرے — آپ کب سے ہو گئے ہیں چاہنے والے میرے

ٹوٹ جاتی ہے جو چلتے ہیں کسی کانٹے کی نوک — پھوٹ کر روتے ہیں کیا کیا پاؤں کے چھالے مرے
اُلفتِ قامت میں موزوں ہے ہر اک مصرع مرا — عشق نے سانچے میں سارے شعر ہیں ڈھالے مرے
قبر میں کوئی خبر لینے نہ آیا بعدِ مرگ — زندگی تک تو بہت تھے چاہنے والے مرے
جام بھر کر غیر کو دینا مجھے خالی گلاس — تیری بیہوشی کے صدقے جاؤں متوالے مرے

ضبطِ اُلفت کی قسم کھاتا ہوں لیکن کیا کروں
جان کھا جاتے ہیں ارشدؔ پوچھنے والے مرے

یہاں تک عشق نے دل کو نچوڑا پنجۂ غم سے — ٹپکتا ہے لہو ہر وقت اپنی چشمِ پُرنم سے
نہ کر جینا دوبھر اتنا ظلم طاقت ہی کہاں غم سے — قفس کو لے کے کیا اُڑ جائینگے بال و پر ہم سے
نہ کرنا قصد ہمدم زخمِ دل کی چارہ سازی کا — محبت میں ہماری داغ لگ جائیگا مرہم سے
سحر ہے شمع اب بُجھتی ہے تارے جھلملاتے ہیں — وہ جاتے ہیں یہاں آنسو رواں ہیں چشمِ پُرنم سے
خدا رکھے تمہاری چاند سی صورت کا کیا کہنا — بلائیں حُسن بھی لیتا ہے پیہم زلفِ پُرخم سے
نہ بہلا مجھ کو بس اے چارہ گر تو آپ ناداں ہے — جگر کا زخم بھی اچھا کہیں ہوتا ہے مرہم سے
یہ کیسی زندگی ہے روز جیتا اور مرتا ہوں — کسی کے وصل کی اُمید سے اور ہجر کے غم سے
اسے دیکھے سے اپنی سینہ چاکی یاد آتی ہے — چھپا لے اے ردائے شب گریبانِ سحر ہم سے
ہوائے گرم سے چرخ آگ برساتا ہے یہ صدمہ ہے — مری تربت کا سبزہ جب ہرا ہوتا ہے شبنم سے
شبِ مہتاب کا عالم نظر آتا ہے آنکھوں کو — لحد میں چاندنی چھٹکی ہے داغِ حسرت و غم سے
ہوئے ہو واں زینت افزائے بساطِ عیشِ دشمن وہ — گلے مل مل کے یاں روئی تمنّائیں بہم ہم سے
اگر ہے دید کا طالب نگاہِ شوق پیدا کر — نہ تو باہر ہے عالم سے نہ وہ باہر ہے عالم سے
طلب کر نعمتِ اعلیٰ کمی ہے کم پر قناعت کر — گلوں کو دیکھ پیاس اپنی بجھا لیتے ہیں شبنم سے
خدا ہی دے جزا اسکی شہیدانِ محبت کو — دلوں پر داغ کیا کیا لیگئے اس باغِ عالم سے

خدا بخشے۔ بیابانِ جنوں میں گو اکیلا تھا
بڑی رونق تھی اے سجّادؔ پھر بھی قیس کے دم سے

(سجاد عظیم آبادی)

عید اور انتظارِ یار

کہتے ہیں عید ہے آج - اپنی بھی عید ہوتی | ہم کو اگر میسّر جاناں کی دید ہوتی
قیمت ہیں دیدِ رخ کی ہم نقدِ جاں لگاتے | بازارِ ناز لگتا دل کی خرید ہوتی
کچھ اپنی بات کہتے کچھ میرا حال سنتے | ناز و نیاز کی یوں گفت و شنید ہوتی
جلوے دکھاتے جاتے وہ طرزِ دلبری کے | اور دل میں یاں ہوائے نازِ مزید ہوتی
تیغِ نظر سے دل پر وہ وار کرتے جاتے | اور لب پہ یاں صدائے ہل من مزید ہوتی
ابرو سے اُن کے غمزہ تیرِ ادا لگاتا | ہر دل قتیل ہوتا وہ جاں شہید ہوتی
کچھ حوصلہ بڑھاتا اندازِ لطفِ جاناں | کچھ دغدغہ سا ہوتا - کچھ کچھ امید ہوتی
لیکن یہاں تو حرماں ہے ثمرۂ تمنّا | کیوں قفلِ آرزو کی پیدا کلید ہوتی

آنکھیں ترس رہی ہوں جب اسکی اک جھلک کو
نیرنگِ منتظر کی کیا خاک عید ہوتی؟

(نیرنگ)

کبھی کچھ کبھی کچھ

کبھی غبارِ مرا آسماں پہ اڑتا ہے | کبھی زمیں یہ کہتی ہے مجھ کو کر سجدہ
کبھی طریقِ تعلّق سے آشنا ہوں میں | کبھی وہ رند کہ رندی بھی جسکی ہو یکتا
کبھی ہوں وہ کششِ رنگ و بو کہ ٹوٹ پڑیں | مرے کرشموں کو دیکھیں جو دیدہ بینا

جمالِ یار کبھی ہوں مزاجِ یار کبھی — دو رنگیوں میں بسر کر رہا ہوں میں تنہا
کبھی خوشی میری تصویر سے جھلکتی ہے — اُداسیوں سے کبھی رنگِ رُخ ہوا پھیکا
کبھی کمالِ ترقی اُبھارتا ہے مجھے — کبھی جمالِ تنزل کا کھنچ گیا پردا
کسی کے ہونٹ جو ہنستے ہوئے نظر آئے — تو میری آنکھ سے خوں نابہ جگر ٹپکا
کہیں جو حسرت و اندوہ کے سُنے چرچے — پکاری جوششِ ساغر بیا بنوش بیا
ستم کا لطف۔ جفا کا مزہ۔ نگہ کی خلش — جو میرے دل سے کوئی پوچھتا تو میں کہتا
ہوائیں آئیں۔ گھٹائیں اٹھیں بہت برسا — برائے نام مگر تھا بہار کا چھینٹا
ابھی تمازتِ خورشید کو ترستے تھے — ابھی اُسی نے چکا چوند سے کیا اندھا
ابھی تو خشک تھے دریا ابھی نہ اور نہ چھور — ابھی تھا پھول مرے ہاتھ میں ابھی کانٹا
ابھی کسی کی محبت میں جان دیتا تھا — ابھی کسی کا گلا کاٹنے کو تیز چھرا
ابھی میں غیر کی بربادیوں پہ ہنستا تھا — ابھی میں اپنے مٹانے پہ تُل گیا دیکھا؟
غرض عجب تلاطم ہے زندگانی میں — اِدھر اُدھر نہ بہے کیوں بہاؤ کا تنکا

ہے سچ تو یہ کہ بُری آ کے بن گئی ستشاعر
خدا ہی پار لگائے غریب کا بیڑا

کچھ ہو مگر قصور نہ ہمت میں چاہیئے — انساں کو وضع پاس مصیبت میں چاہیئے
اک داغِ مہر سینہ پہ تُربت میں چاہیئے — زیرِ کفن یہ شمع بھی ظلمت میں چاہیئے
اے دل نہ فرق معنی و صورت میں چاہیئے — مضمر صفائے آئینہ طینت میں چاہیئے
فکرِ کشود کار مصیبت میں چاہیئے — دامانِ صبر ہجر ہمت میں چاہیئے
بحجود ملال میں ہو نہ راحت میں خود نما — یہ رنگ آدمی کی طبیعت میں چاہیئے
واعظ ذا بشر کی حور سے کیا ہو گی دل لگی — تھوڑی مناسبت بھی طبیعت میں چاہیئے

ہے شرطِ عقل کوششِ کسبِ کمالِ فن
دامن پہ داغِ نقص نہ شہرت میں چاہیے

بولے وہ اپنے کُشتۂ حسرت کو دیکھ کے
یہ شکل بھی مرقعِ عبرت میں چاہیے

فرقت میں برقِ خرمنِ صبر و سکوں میں اشک
طفلی سے یوں کمال شرارت میں چاہیے

جس جا لکھی ہے عُمر وہیں کیوں نہ ہو لحد
کچھ یادگار کوچۂ اُلفت میں چاہیے

انساں رہے عروج میں بھی بنکے خاکسار
منعم یہ سُرمہ چشمِ بصیرت میں چاہیے

اشکوں سے ہر مژہ پہ صف آرا ہیں لختِ دل
ایسا امام ایسی جماعت میں چاہیے

مل جائے نانِ خشک تو نعمت سمجھ اُسے
پیوند حرص کا نہ قناعت میں چاہیے

بیمہری زمانہ سے دل سرد ہے تو ہو
افسردگی نہ آتشِ غیرت میں چاہیے

ریحانِ باغِ حکمت و تہذیب ہو سخن
کوئی ثمر تو نخلِ ریاضت میں چاہیے

گردوں نشیں ہے خاک مری بنکے گرد باد
یوں کوششِ عروجِ فلاکت میں چاہیے

دل تنگ کیوں ہیں سب مری فریاد و آہ سے
کرتا ہوں وہ جو کچھ شبِ فرقت میں چاہیے

اُس رُخ کی یاد آئینہ دارِ خیال ہے
ایسا ہی رہنا مجھے حیرت میں چاہیے

ابروئے یار کا کلمہ پڑھ رہی ہے تیغ
عادل سوالِ جرح شہادت میں چاہیے

آنکھوں میں لختِ دل ہیں زمیں پر ہے فوجِ اشک
یہ فرق بادشاہ و رعیت میں چاہیے

شیدا ازل سے شاہدِ معنی کا ہے حبیب
ایسا انیس گوشۂ عزلت میں چاہیے

نشاط و نور سے لبریز اک عالم کی جھولی ہے
گرہ چینِ جبیں کی کس بُتِ مہوش نے کھولی ہے

یہاں کہتے ہیں مرنا زندہ جاوید ہونے کو
زمانہ سے نرالی منزلِ جاناں کی بولی ہے

متاعِ صبر کا نام و نشاں باقی نہیں چھوڑا
یہ دزدیدہ نگاہوں نے گرہ دل کی ٹٹولی ہے

قیامت ہے تری کس کس ادا سے دل بچے ظالم
جو آنکھیں شوخ و پُرفن ہیں تو صورت بھولی بھولی ہے

اشارہ صاف کرتی ہے ترے سینہ کی موزونی
کہ جنبشِ حُسنِ قدرت نے اسی کانٹے میں تولی ہے

شرابِ ناب کے جلوے نگاہِ ناز پر صدقے
ابھی سوتے سے آنکھ اس فتنۂ دوراں نے کھولی ہے

گلِ نغمہ تکلّم سے ترے دامن میں بلبل کے
تبسّم نے بھری پھولوں سے فصلِ گل کی جھولی ہے

مسلّم ساتھ ہے ازبسکہ دامن اور چولی کا
کیا جب میں نے دامن چاک پھاڑی ساتھ چولی ہے

حصولِ مدّعا اب کوئی دن کی بات ہے حسرت
نگاہیں مل چکی ہیں گفتگوِ مطلب کی ہولی ہے

[illegible]

نگاہ پائی ازل سے جو نکتہ بیں میں نے
ہر ایک چیز میں دیکھا اُسے مکیں میں نے

سوالِ دید میں لذت ہے اے کلیمِ الٰہی
ہزار بار سُنی ہے وہی "نہیں" میں نے

قطعہ

سُنے کوئی مری غربت کی داستاں مجھ سے
بھلایا قصۂ پیمانِ اوّلیں میں نے

لگی نہ میری طبیعت ریاضِ جنّت میں
پیا شعور کا جب جامِ آتشیں میں نے

رہی حقیقتِ عالم کی جُستجو مجھ کو
دکھایا اوجِ خیالِ فلک نشیں میں نے

ملا مزاجِ تغیر پسند کچھ ایسا
کیا قرار نہ زیرِ فلک کہیں میں نے

نکالا کعبے سے پتھر کی مورتوں کو کبھی
کبھی بتوں کو بنایا حرم نشیں میں نے

کہا کسی نے فسانہ جو عرش و کُرسی کا
وہ سادہ لوح ہوں میں کر لیا یقیں میں نے

کبھی میں ذوقِ تکلّم میں طور پر پہنچا
چھپایا نورِ ازل زیرِ آستیں میں نے

کبھی صلیب پہ اپنوں نے مجھ کو لٹکایا
کیا فلک کو سفر چھوڑ کر زمیں میں نے

کبھی میں غارِ حرا میں چھپا رہا برسوں
دیا جہاں کو کبھی جامِ آخریں میں نے

کبھی میں قتل ہوا کربلا کے میداں میں
کہی کسی کو ستم پر بھی آفریں میں نے

سُنایا ہند میں آ کر سرودِ ربّانی
پسند کی کبھی یوناں کی سرزمیں میں نے

دیارِ ہند نے جس دم مری صدا نہ سُنی
بسایا خطّۂ جاپان و مُلکِ چیں میں نے

بنایا ذرّوں کی ترکیب سے کبھی عالم
خلافِ معنیٔ تعلیمِ اہلِ دیں میں نے

اُٹھائے تلخیٔ افکار میں مزے کیا کیا
بنا کے ایک زمانے کو نکتہ چیں میں نے

لہو سے لال کیا سینکڑوں زمینوں کو
جہاں میں چھیڑ کے پیکارِ عقل و دیں میں نے

سمجھ میں آئی حقیقت نہ جب ستاروں کی
اسی خیال میں راتیں گذار دیں میں نے

ڈرا سکیں نہ کلیسا کی مجھ کو تلواریں
سکھایا مسئلۂ گردشِ زمیں میں نے

کشش کا راز ہویدا کیا زمانے پر
لگا کے آئینۂ عقلِ دُوربیں میں نے

کیا اسیر شعاعوں کو برقِ مضطر کو
بنا دی غیرتِ جنّت یہ سرزمیں میں نے

مگر خبر نہ ملی آہ! رازِ ہستی کی
کیا خرد سے جہاں کو تہِ نگیں میں نے

ہوئی جو چشمِ مظاہر پرست وا آخر
تو پایا خانۂ دل میں اسے مکیں میں نے

عجیب طرز ہے کچھ گفتگوئے واعظ کا
خدا بچائے یہ باتیں سُنی نہ تھیں میں نے

وہ چیز نام ہے جس کا جہاں میں آزادی
سُنی ضرور ہے دیکھی کہیں نہیں میں نے

نہ توڑ میرے دلِ دردمند کو ظالم
بڑی تلاش سے پایا ہے یہ نگیں میں نے

خدا تو ملتا ہے انسان ہی نہیں ملتا
یہ چیز وہ ہے کہ دیکھی کہیں نہیں میں نے

عجیب شے ہے صنم خانۂ امیرِ اقبال
میں بُت پرست ہوں رکھ دی کہیں جبیں میں نے

(رُعناب)

اگر کے دوش پہ کیونکر نہ زلف ناز کرے
اُسی کے ہاتھ ہے وہ جس کو سرفراز کرے

بیک اشارہ نہ میں تھا نہ غیر محفل میں
اُن ابرؤوں کی خدا زندگی دراز کرے

مرے حساب سے تو عاشق نہیں حریص ہے وہ
فراق و وصل میں کچھ بھی جو امتیاز کرے

نگاہِ ناز سے مطلب مرا کچھ اور نہیں
کسی طرح سے خدا اُسکو دلنواز کرے

کچھ اور بزم میں اپنی دُعا نہیں ساقی
تری نگاہ کو اللہ پاکباز کرے

کہیں تو جام دھرا ہے کسی طرف ساغر
کدھر جھکائے سر انساں کدھر نماز کرے

بہت دنوں سے ہے خالی فقیر کا کشکول
بس اب نگاہِ کرم وہ گدا نواز کرے

شراب جام میں دی تو نے ساقیا یا زہر
کسے دماغ ہے کون اس کا امتیاز کرے

نگہ سر آنکھوں پہ ہے اس کا لیکن اے قاصد
ہم ایسے ہیں تو ہمیں کیوں امینِ راز کرے

فقط بھروسے پہ تیرے ہے زندگی اپنی
خدا حیات تری اے اجل دراز کرے

ہم اپنے آپ نہیں جب تو ہونگے غیر کی کب
زمانہ شاد ہم ایسوں سے احتراز کرے

(شاد عظیم آبادی)

نقاہت یوں سمائی رُوح بنکر جامۂ تن میں
رگِ گردن میں ہیں وہ تار جو اُلجھے تھے دامن میں

کبھی کیفیتِ دشتِ جنوں کبھی نہ گلشن میں
بجانے کن گلوں کی خاک ہے صحرا کے دامن میں

نہ رو دل کیوں غمِ بیجا علی وجہِ تکدر ہے
ہوا تخمِ امل برباد خاک اُڑتی ہے ساون میں

نظر دیوارِ قصرِ یار سے پلٹے تو کیا پلٹے
لگے ہیں پردہائے چشم دیواروں کے روزن میں

چمک تابِ مکدر میں ہے یادِ مہرِ عارض سے
ہمارا شورہ زارِ دل ہے صحرا ہیں نہ گلشن میں

بندھا رُخ کا تصور لختِ دل اشکوں کے ساتھ آئے
کُھنچے بے زحمتِ سیرِ گلستاں پھول دامن میں

ملی ہے منزلِ مقصد کسے بے رہبرِ کامل
گیا بے منتِ تارِ نظر کب رشتہ سوزن میں

ہی تکبیرِ قاتل سے حلاوت موت کی تلخی
لبِ معجز نما نے قند گھولا آبِ آہن میں

ہزاروں خارِ دشتِ اندو تلوؤں میں ٹوٹے ہیں
بنا ہے کارِ سوزن مدتوں تک جامۂ تن میں

لگائے تو نے کیوں تارِ شعاعِ مہر اے گردوں
نظر کے تار کیا کم تھے درِ جاناں کی چلمن میں

ترے قامت کو آثارِ قیامت خلق کہتی تھی
سکھا دی تھیں ادائیں شوخیوں نے ایسی بچپن میں

یقیں کیا ہو حبیبِ رند نے پیری میں توبہ کی
ہیں چھینٹے ساغروں کے اب تلک گلگوں کے دامن میں

(حبیب منوری)